ہر گھر کی زینت
ماہنامہ
دوشیزہ
کراچی
January
2016
سالگرہ نمبر
☆ نامور مصنفہ 'رفعت سراج' کا شاہکار ناول ''دامِ دل'' اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

رنگ کائنات

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com
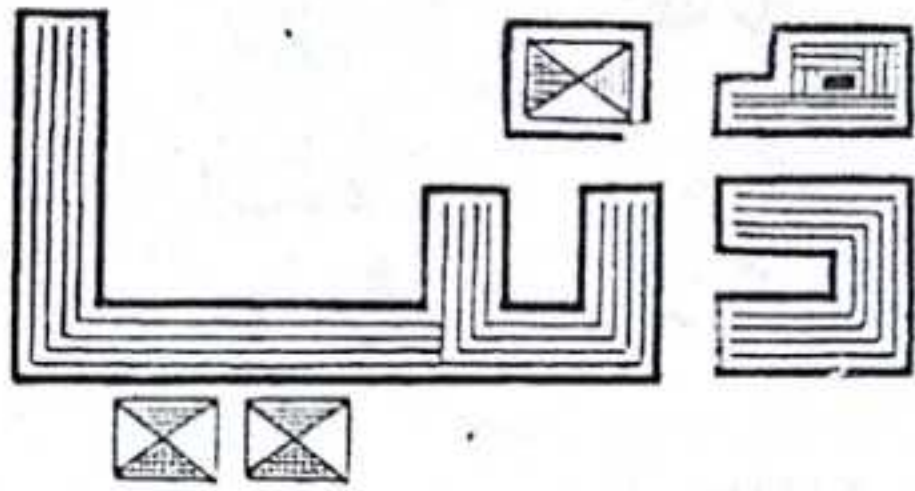
اس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرل پبلی کیشنز: 88-C II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس
ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبرز: 021-35893121-35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

پروٹوکول

یہ وہ لفظ ہے جس کے معنی جانے بغیر ہم سب اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں...... ہر بات کا الزام سیاست دانوں یا حکمرانوں کو دینا مناسب نہیں، دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ کیا ہم سب دکھاوے پر یقین نہیں رکھتے؟ ہم نہیں چاہتے کہ ہمیں برتر اور افضل سمجھا جائے۔ چاہے بات خاندانوں کی ہو، محلے پڑوس کی ہو، کام کی جگہ ہو یا دوست داری...... ہم اپنے آپ کو برتر تصور کرنا چاہتے ہیں...... پروٹوکول بھی تو ہمارے سیاستدان حفاظت سے زیادہ دکھاوے کے لیے استعمال کرتے ہیں...... کیونکہ وہ ہم میں سے ہیں، ہماری جیسی سوچ رکھتے ہیں۔ معاملہ دینی ہو یا دنیاوی، دکھاوا اب ہر عمل پر بازی لے جا چکا ہے۔ جس کے پاس جتنا ہے وہ اس سے بہت زیادہ دکھا کر خوش ہوتا ہے...... خواتین سر تو ڈھانپتی ہیں مگر دونوں کان دوپٹے سے باہر نکال کر بار بار کانوں میں پہنے جھمکے ساتھ بیٹھی خاتون کو دکھانا اولین فرض سمجھتی ہیں...... مرد حضرات میز پر بار بار موبائل فون رکھتے اور اٹھاتے ہیں تاکہ سب کی نظریں ان کے قیمتی موبائل فون پر پڑیں...... یہ وہ عام لوگ ہیں جنہیں ہم حرف عام میں پاکستانی کہتے ہیں...... پھر گاڑی کی نمائش، گھر اور قیمتی فرنیچر کا تذکرہ اور بچے اگر باہر تعلیم حاصل کر رہے ہیں تو مانو سارے شہر میں ڈھنڈورا...... جو چیز انسان کے لیے مشکل کا باعث ہے اس کو سب سے پہلے اپنے آپ سے دور کرنا چاہیے...... جس دن ہم لوگ دکھاوے کے مرض سے نجات پا گئے یقین کریں اس دن یہ سارے پروٹوکول جو انسانوں کی جان لیتے ہیں، عزتِ نفس مجروح کرتے ہیں ختم ہو جائیں گے۔

منزہ سہام
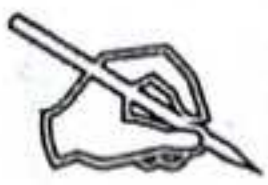
قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت
رابطوں کی دلفریب محفل

پیارے ساتھیو! دوشیزہ کی سالگرہ کی اس جھلملاتی محفل میں ہم سب کو خوش آمدید کہتے ہیں آج تو ہمارے پیارے پیارے سے مہمان خوب سج دھج کے ساتھ دوشیزہ کو وش کرنے آئے ہیں جس کے لیے ہم سب تہہ دل سے آپ لوگوں کے شکر گزار ہیں۔

آج دوشیزہ نے ماشاء اللہ سے اپنے 43 سال مکمل کر لیے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے حسن اور آب و تاب میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے اور دوستو سہام صاحب کی روشن کی ہوئی اس شمع کو منزہ سہام نے کبھی بجھنے نہیں دیا ہے اپنے والد کے انتقال کے بعد انہیں بے شمار مسائل اور کرائسس کا سامنا کرنا پڑا۔انہوں نے وہ دکھ بھی سہے جو کسی عام عورت کو ریزہ ریزہ کر سکتے ہیں لیکن منزہ نے دنیا کو بتا دیا کہ ہر عورت کمزور نہیں ہوتی پوزیٹیو سوچ کے ساتھ ہمت حوصلے اور بہادری کو اپنا ہتھیار بنا کر جینے والی منزہ یقیناً ان خواتین کے لیے ایک مثال ہیں جن کا ہتھیار صرف ان کے آنسو ہیں۔

قارئین ہمارا مقصد منزہ کی تعریف کرنا ہرگز نہیں ہے (منزہ نے منع بھی کیا ہے) بلکہ خواتین کو یہ تحریک دینا ہے کہ بہادری اور خود اعتمادی کے ساتھ جینے والوں کا دنیا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم بھی اندھیروں کی بجائے روشنی کی طرف دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔پیارے ساتھیو آج اس سالگرہ کے موقع پر منزہ کو بھی محفل میں لانا ضروری تھا سو ان سے ملاقات کے بعد اب چلتے ہیں اپنے خوبصورت مہمانوں کی جانب۔

✉ : سب کی پسندیدہ لکھاری رُخ چوہدری اس محفل میں دوشیزہ کو سالگرہ کی مبارک باد دینے آئی ہیں۔السلام وعلیکم پیاری سی دوشیزاؤں آپ سب کو دوشیزہ کی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو ویسے تو اگر کسی دوشیزہ سے پوچھا جائے کہ خیر سے کتنی ویں سالگرہ ہے، مجال ہے کہ سچا جواب مل جائے۔اور خیر سے ہم بھی ایک دوشیزہ ہی ہیں اس لیے اب ٹاپک پر زیادہ بولیں گے نہیں۔بلکہ پیاری سی دوشیزہ منزہ سہام اور ڈیئر رضوانہ پرنس کو دوشیزہ کی ساری ٹیم کو دوشیزہ کی سالگرہ مبارک ہو، جن کی دن رات محنت اور کاوش سے 'دوشیزہ' ہر قاری کا پسندیدہ ڈائجسٹ بن گیا ہے۔دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ دوشیزہ

اس طرح اپنے قارئین کا پسندیدہ ڈائجسٹ رہے۔ آمین۔
☆ بہت بہت شکریہ، اچھی رُخ اور افسانہ کب تک پہنچ رہا ہے تمہارا؟
✉: ہماری دیرینہ ساتھی رضوانہ کوثر لاہور سے بہت اداسی سے ہمیں خبر دے رہی ہیں آج میں بہت بھاری دل کے ساتھ آپ کو اطلاع کر رہی ہوں کہ میری امی کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا۔ گو کہ وہ کافی عرصے سے علیل تھیں لیکن ماں کا سایہ سر سے اٹھ جاتا ہے تو دکھ کی انتہا الفاظ میں بیان نہیں ہوتی۔ آپ کا دوشیزہ وقت پر مل گیا تھا لیکن ابھی تو اسے کھولنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔
☆ اچھی رضوانہ آپ نے سچ کہا ماں کے بچھڑ جانے کا غم سہنا کوئی آسان بات نہیں ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں قارئین سے التماس ہے کہ وہ ان کی امی کے لیے خصوصی دعا کریں۔

گری ہے سجدے میں کس کی جبیں میری خاطر
اٹھا ہے دستِ دعا کب کسی کا ماں کی طرح

✉: ہماری پیاری سی خولہ عرفان لاہور سے کچھ دیر میں پہنچی ہیں۔ السلام وعلیکم بعد از سلام و دعا احوال یہ ہیں کہ بقول ناچیز

کچھ اثرات شہر مزاج میں دَر آئے ہیں
صداتا خیر سے محفل میں تیری آئے ہیں

اس لیے معذرت خواہ ہوں کہ ہمارا شمار شاید ان عمائدین شہر میں ہوتا ہے جو بیچارے اچھا ہونے کے باوجود اچھے نہیں بن پاتے۔ وقت کی پابندی کے پر زور طریقے سے قائل ہوتے ہیں لیکن خود وقت کی پابندی نہیں کر پاتے۔ محبت تو کرتے ہیں پر اظہار محبت نہیں کر پاتے۔ خیر عزیز پرنسز اپنا قصہ پرانا ہے وہی دوشیزہ کی تاخیر سے رسائی وہی بھاگم بھاگ تبصرہ لکھنا جو آپ تک پہنچ جائے تبصرے کی طرف آتی ہوں پرنسز اب کی دفعہ ہم نے دوشیزہ کا مطالعہ الٹے انداز سے کیا یعنی کچن کارنر سے ابتدا کی۔ دوشیزہ گلستان، نئے لہجے نئی آوازیں سب سے مستفید ہوتے ہوتے ہوئے ڈاکٹر اقبال ہاشانی کے پروفیسر بریانی تک پہنچے اور اس کے اختتام تک ہنس ہنس کر مطالعہ کی گئی تمام غزلیں، نظمیں، شگوفے اور چکن کڑھائی کی ترکیب ہضم ہو گئیں بہت جاندار جملے تھے مزہ آ گیا۔ افسانہ اترن خودداری اور عزت نفس کی بھرپور عکاسی کرتا دل کو چھو گیا، عابدہ سبین کا ناولٹ محبت روٹھ جائے تو کا مطالعہ ابھی ادھورا ہے لیکن اندازہ ہو رہا ہے کہ دلچسپ ہو گا البتہ عقیلہ حق کا پگلی، ریشماں اور عورت لاجواب تھا۔ جملے تھے کہ ایٹم بم دل و دماغ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ عقیلہ حق صاحبہ واقعی ڈھونڈ کر موضوع لاتی ہیں اور حسن بیاں سے چار چاند لگا دیتی ہیں۔ ثمینہ فیاض کا شیشے کا محل بھی اچھی تحریر تھی۔ دردانہ نوشین کا افسانہ زندہ دفن کی گئی میں عورت کا جاہلانہ رسوم سے کہانی بہت عمدہ تھی۔ فرحین اظفر کا شکست زدہ بہت بہت بہت شاندار عکاسی اس ازدواجی زندگی جو ہمارے معاشرے میں پچھتر فیصد سے زیادہ خواتین گزارتی ہیں بہت خوب، صدف آصف کا غلط فہمی، شمع حفیظ کا ہتھیلی پر لکھی دعا اور جانم سمجھا کرو فوزیہ غزل کا تینوں افسانے مختلف موضوع کے ساتھ اصلاحی رنگ لیے بہت اچھے تھے لمحوں نے خطا کی تھی اختتام حسب

اور اب! ...... گُل بھی یادِ رفتگاں ہوئیں

اِنا للہ وانا الیہ راجعون

گُل کے نانا ولایت ثاقب اپنے زمانے کے مشہور شاعر اور ادیب تھے۔ اُن کے کتب خانے سے گل چینی، گُل کے لیے تخلیقی تربیت کا سبب بنی۔

کتب بینی کے شوق نے مشاہدے کی عادت ڈالی اور مشاہدے نے کہانیاں بنانے پر تیار کیا۔

تین افسانوی مجموعے 'تشنہ لبی'، 'رائیگاں مسافت'، 'مرغابیاں اور کنول'۔ دو شعری مجموعے 'موج موج بھنور' اور 'پیار کا موسم روٹھ گیا' اور ایک سفر نامۂ حجاز 'رانجھن یار طبیب سئیدا' شائع ہوئے۔ ان تمام تخلیقات نے قارئین میں بے حد پذیرائی حاصل کی۔

گُل نے اپنی ایک تحریر میں لکھا تھا۔

''اِس ملک کو مرغابیوں کی ضرورت نہیں، جو جھیل کا پانی سوکھنے سے پہلے ہی جھیلیں بدل لیتی ہیں۔ اس ملک کو تو کنول چاہئیں، جو جانتے ہیں زندگی اور موت اسی جھیل سے وابستہ ہے۔''

''گُل کا یہ کہنا بھی نہایت بامعنی اور دلچسپ تھا کہ میری کہانی وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں کہانیاں عموماً ختم کر دی جاتی ہیں۔''

اور......

حکایتِ گُل بھی اختتام کو پہنچی مگر......

اب کہانی شروع ہو چکی ہے۔ گُل کی یاد میں ان کے مداح اور قلم کار ساتھی اداس ہیں اور گُل کے اعلیٰ درجات کے لیے خدا کے حضور دعا گو ہیں۔

گُل!
الوداع...

کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

توقع ہوا۔ اسماء اعوان کا لائف بوائے آئیڈیل ملائے پڑھ کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب عاملوں کے چکر سے نکل کر عوام الناس کو لائف بوائے کے چکر میں پھنس جانا چاہیے اتنی کرامات دیکھنے میں تو عامل لوگ آگے ہوتے ہیں یا پھر...... ہاہاہا مذاق کر رہی ہوں لیکن اسما اعوان واقعی بڑی کہانی نویس ہیں ہر مہینے باقاعدگی سے ایک نیا موضوع موجود ہوتا ہے پھر شگفتہ شفیق کے آنگن میں بارات پر مبنی تصاویر بہت شاندار اور واضح تھیں آپ کی شگفتہ شفیق صاحبہ اور منزہ سہام صاحبہ کی تصاویر بہت پیاری لگیں۔ محفل میں تبصرہ نگاروں کے تبصروں سے محفوظ ہوئی لیکن ایک سوال ذہن میں اٹکا وہ گیا کہ آپ نے لکھا ہے کہ اس محفل میں جگہ ہی جگہ ہے اور ہم سوچتے ہیں کہ کیا دوشیزہ کے پرچے میں بھی مزید جگہ مل سکتی ہے؟ کہ ایک افسانے کے بعد دوسرے کے لیے نگاہیں راہ دیکھ رہی ہیں۔ منزہ سہام صاحبہ نے اپنے اداریے میں بہت خوبصورت لفظوں سے الیکٹرانک میڈیا کی بے حسی یا بے عقلی کی نشاندہی کی ہے سرورق ماڈل سمیت بہت خوبصورت لگا۔ ایک طویل ناراضگی کے بعد قلم سے دوستی کرلی اور اس کے سنگ افسانہ نگاری کی اجنبی راہوں پر چل نکلا اب کس تک ہمارا قلم انصاف کرتا ہے یا آپ کے رسالے کے معیار پر پورا اترتا ہے یہ اللہ بہتر جانتا ہے اور پھر منصب ادارت پر فائز کردہ پرنسز ہم افسانہ لکھ کر ڈاک کی نظر اور دعا اللہ کی نظر کر دیتے ہیں۔ پرنسز الفاظ و بیان کی لغزش ہوئی تو معاف کر دیجیے گا ایک نظم ارسال کر رہی ہوں پہلے بھی ارسال کی تھی مجھے بہت پسند تھی۔ عنایت فرمائیے گا۔ ہمیشہ کی طرح دوشیزہ اہلیان، دوشیزہ اور اپنی پرنسز کے لیے دعا گو۔

☆ پیاری سی خولہ! جب آپ کا پچھلے ماہ خط ملا تو محفل کلوز ہوچکی تھی لیکن خیر کوئی بات نہیں آپ کے اتنے پیارے سے خط کو ہم ہرگز اگنور نہیں کرسکتے کہ پرانا تبصرہ بھی اتنا مہکا سا جو ہے۔

✉ : ہماری پیاری سی رائیٹر فرح اسلم قریشی کراچی سے لکھتی ہیں السلام وعلیکم امید ہے بخیر ہوں گے۔ وعدے کے مطابق سروے کے لیے جوابات، ظہرانے کے بارے میں تاثرات اپنی ایک نظم اور ایک (اپنی اسٹوڈنٹ جو کہ ابھی صرف میٹرک میں ہے لیکن ادب سے گہرا شغف رکھتی ہے) کی نظم بھی بھیج رہی ہوں میری نظم چاہے دیر سے لگا دینا لیکن میری شاگرد سویرا خالد کی نظم قریبی شمارے میں ضرور لگانا تاکہ اس کی حوصلہ افزائی ہوسکے کہ اس عمر میں حوصلہ افزائی آبیاری کا کام دیتی ہے۔ اور آپ سب کی محبتوں کا شکریہ تفصیلی خط اگلے شمارے کے لیے ضرور بھیجوں گی فی الحال کے لیے اجازت۔

☆ اچھی فرح! تمہارا اپنی شاگرد کے لیے اتنا خیال کرنا اچھا لگا۔ لیکن بھئی اپنی ہم عمر رائیٹر کا بھی تو کچھ خیال کرو نہ جو اپنی تحریروں پر تمہارے تبصرے کی منتظر رہتی ہیں۔

✉ : ہماری محفل میں آج ایک اور نئی مہمان مہ وش صدیقی کمشنر ہاؤس سے تشریف لا رہی ہیں ڈیئر رضوانہ باجی میرا کچھ دنوں پہلے اتفاق سے دوشیزہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تو دل چاہا کہ میں بھی اس میں کچھ لکھوں۔ میرے پاس بہت سارے آئیڈیاز ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں نے پہلے صرف انگلش میں ہی لکھا ہے پہلی بار اردو میں لکھنے کا دل چاہ رہا ہے امید ہے اگر میں کچھ بھیجوں تو آپ میری غلطیوں کو ٹھیک کر کے میری ہیلپ کر کے میری حوصلہ افزائی کریں گی۔
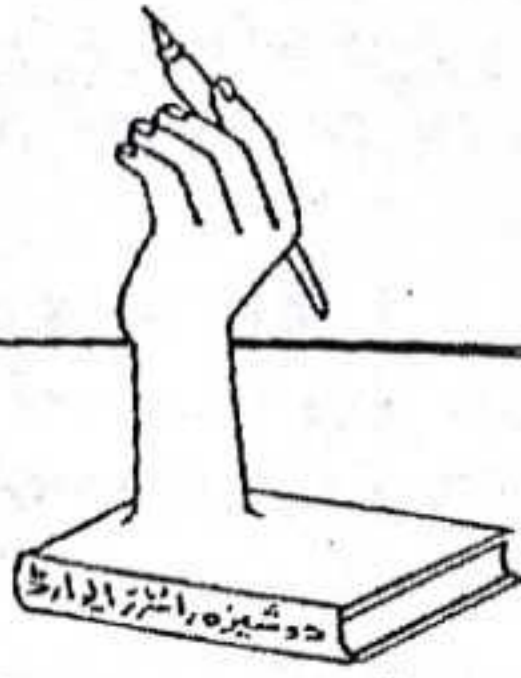
دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

دسمبر 2015 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

''عدت'' سنبل

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ

جنوری 2016

عنوان: ____________________

قلم کار: ____________________

نام: ____________________

پتا: ____________________

☆ پیاری سی مہ وش! سب سے پہلے تو اس محفل میں خوش آمدید اور ہاں بھئی تم اپنے آئیڈیاز صرف انگلش تک ہرگز محدود نہیں رکھو۔ اردو کا زیادہ حق ہے تم پر۔ اور اس سلسلے میں ہم تمہاری پوری مدد اور حوصلہ افزائی کریں گے۔

✉: اور یہ ہیں ہماری مستقل تبصرہ نگار ریحانہ مجاہد جو کراچی سے خوشی کے ساتھ ساتھ خفگی کا اظہار بھی کر رہی ہیں پیاری رضوانہ سب سے پہلے تو منزہ آپ اور دوشیزہ کے تمام اسٹاف کو دوشیزہ کی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ ماشاء اللہ سے دوشیزہ کی خوبصورتی دن بدن بڑھتی جارہی ہے بلاشبہ اس میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو کوئی قاری پڑھنا چاہے بے حد مکمل اور اپنے اندر بے شمار دل چسپیاں سمیٹے اس ڈائجسٹ نے ہمیں مکمل طور اپنے حصار میں لے لیا ہے گھر کے سب افراد اِسے بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور رضوانہ اسی وجہ سے میں سالانہ خریدار بنی تھی کہ مجھے دوشیزہ کا انتظار نہ کرنا پڑے لیکن مجھے آپ سے یہ شکایت کرنی ہے کہ میری بہن کو اسلام آباد میں دوشیزہ وقت پر مل جاتا ہے لیکن مجھے نہیں ملتا۔ شکوہ اپنوں سے ہی کیا جاتا ہے تب ہی آج آپ سے شکایت کررہی ہوں۔ اس بار بھی میری کزن، میری بہن سب کو رسالہ پہنچ گیا ماسوائے میرے۔ تب ہی تبصرہ نہیں بھیج پارہی ہوں بس دلی مبارک باد لے کر آگئی ہوں۔

☆ اچھی ریحانہ! ہمیں خود حیرانی ہورہی ہے اسلام آباد تک رسالہ وقت پر پہنچ جاتا ہے آخر تمہیں ہی کیوں لیٹ ملتا ہے ویسے ہم نے متعلقہ شعبے تک تمہاری شکایت پہنچا دی ہے انشاء اللہ وہ تمہاری شکایت دور کرنے کی پوری کوشش کریں گے لیکن ریحانہ ذرا اپنے پوسٹ مین پر بھی نظر رکھو ہماری خوبصورت دوشیزہ کا وہ بھی تو فین نہیں؟

✉: اسلام آباد سے آئی ہیں افشاں رضا السلام وعلیکم اس دفعہ کا دوشیزہ بھی ہمیشہ کی طرح بہت ہی خوبصورت تحریروں اور تبصروں کے ساتھ دل کو چھو گیا۔ سب سے پہلے دوشیزہ کی محفل میں اپنا خط شامل ہونے پر خوشی سے دل سے دوشیزہ کے لیے بہت سے دعائیں نکلیں دوشیزہ گلستان میں معصومہ رضا کے اقوال علی بہت اچھے لگے نئے لہجے نئی آوازیں میں انزا نقوی کی غزل بھی بہت اچھی تھی۔ حبیبہ عمیر کے ناولٹ ''پلکوں پر ٹھہرے خواب' کی دوسری قسط کا بے چینی سے انتظار ہے روبینہ شاہین کا افسانہ 'قصہ اس زلف کا' اچھا تھا۔ دوشیزہ جیسا ماہنامہ اپنی کامیابی سے جو مقام بنا چکا ہے اللہ اس کو قائم رکھے اچھا رضوانہ پھر ملاقات ہوگی۔

☆ پیاری افشاں تمہارا خط ملتے ہی سردی کا احساس ہوا بھئی اسلام آباد سے جو آئی ہو۔ پسندیدگی کا شکریہ جلدی جلدی دوشیزہ پڑھ کر خط لکھو گی تو محفل میں شامل ہوتی رہو گی...... لطیفہ جو بھیجا وہ اچھا نہیں لگا مزے دار سے لطیفے بھیجو ہم ضرور شائع کریں گے۔

✉: سیالکوٹ سے ماہین خاور ہماری سویٹ سی چھوٹی سی دوست لکھتی ہیں پیاری رضوانہ باجی دسمبر کا شمارہ اپنی پوری رعنائی کے ساتھ ملا آپ سوچ نہیں سکتیں کہ میں دوشیزہ کا کس شدت سے انتظار کرتی ہوں کاش کہ یہ مہینے میں دو بار آیا کرے۔ رضوانہ باجی دوشیزہ سالگرہ آپ سب لوگوں کو بہت بہت مبارک ہو میں دل سے دعا گو ہوں کہ اسے اور بھی عروج حاصل ہو اور ہاں میں نے اپنی دوست کو بالکل بھی امتحان میں نہیں ڈالا بلکہ آپ کا جواب اسے پڑھ کر سناتے ہوئے فون پر ہنس دی تو وہ بھی ہنسنے لگی

اور یوں آپ کی وجہ سے ہماری دوستی ہوگی رضوانہ باجی مجھے پچھلے کچھ دنوں سے شدید نزلہ اور بخار ہے دوشیزہ پڑھ نہیں پائی کیا اگلے ماہ دو ماہ کے تبصرے بھیج سکتی ہوں۔

☆ پیاری سی ماہین تم دونوں کی دوستی پر خوشی ہوئی دیکھا نہ ایک خوبصورت سی ہنسی کیسے سب رنجشوں کو مٹا دیتی ہے اور اچھی لڑکی اللہ کرے اب تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک ہو تبصرہ اب سالگرہ نمبر پر ہی بھیجنا۔

✉: یہ ہیں کراچی سے نزہت جبیں ضیاء ڈیئر رضوانہ پرنس السلام وعلیکم! شاد آباد اور ہنستی مسکراتی رہو آمین۔ دسمبر کا شمارہ سوسو سرورق کے ساتھ ملا۔ روایت سے جڑی جتنا گڈ بہترین اداریہ ہے بس سمجھنے والا دماغ چاہیے۔ دوشیزہ کی محفل میں آئے بہن بھائیوں سے ملاقات کر کے اچھا لگتا ہے اللہ تعالیٰ یہ محفل یونہی آباد رکھے (آمین) سیما رضا کی ہمشیرہ کے انتقال کی خبر پڑھی بہت افسوس ہوا اللہ پاک مرحومہ کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) 'احسن خان' سے ملاقات اچھی رہی میری طبیعت کافی خراب ہے۔ فلو کا زبردست اٹیک ہوا ہے اس لیے ڈائجسٹ پوری تو نہیں پڑھ پائی لیکن جتنا بھی پڑھا اچھا لگا۔ سباس گل کا مکمل ناول 'میرا افسانہ بس ایک تو' افسانوں میں 'یوں تو فسانے جا گیں' اور 'سمجھوتے' اچھے لگے۔ دیگر سلسلے بھی اچھے لگے۔ سروے بھیج رہی ہوں میری طرف سے ہماری دوشیزہ کو سالگرہ کی ڈھیروں مبارکباد۔ اللہ تعالیٰ یونہی ہمارا ساتھ برقرار رکھے اور دوشیزہ کو مزید کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار کرے (آمین)

چھوٹا سا نذرانہ

تیری سالگرہ پر تجھ کو کیا بھیجوں......

کوئی پھول، یا کارڈ کا تحفہ بھیجوں......

ہے میرے پاس بھلا کیا؟ جواب تجھے نذر کروں......

تو جو چاہے تو' دعاؤں' کا سندیسہ بھیجوں......

☆ پیاری نزہت! نظم تو بہت پیاری ہے۔ ہمیں تو ہر ماہ بس تبصرہ بھیجو۔

✉: یہ ہیں ہماری مہمان شائستہ عزیز ڈیئر منزہ و رضوانہ السلام وعلیکم بخیریت و طالب خیریت کتنے دن ہوئے تقریباً تمام دوشیزہ پڑھ ڈالا ہے تبصرہ کا وقت اب ملا ہے سرورق پسند نہیں آیا، بہت قریب سے تصویر لی گئی ہے ایسے سرورق سچی کہانیاں کے پُراسرار نمبرز پر سجتے ہیں (افوہ منزہ کے چہرے پر خفگی بھری مسکراہٹ؟؟) اداریہ ہمیشہ کی طرح پراثر ہے اگر دلوں پر اثر کر جائے تو تو؟ محفل میں ہر انگ و رنگ موجود ہے اور ہونا بھی چاہیے انٹرویو کی بابت میری طرح اور لوگ بھی کہہ رہے ہیں کہ تشنگی لیے ہوئے ہیں اسے تھوڑے اور طویل ہونے چاہیں رفعت سراج کے دام دل پر کیا تبصرہ کروں کہ ان کی تحریروں کو مجھ ناچیز کی تنقید یا تبصرہ کی حاجت نہیں، ساری اقساط جمع کر کے پڑھ کر رائے دوں گی۔ منی اسکرین کے پروگرامز پر تبصرہ کرنے میں غیر جانبداری کی ضرورت ہے اور دیگر چینلز بھی سامنے لائیں۔ اُم مریم کے ناول کے بابت میری وہی رائے ہے جو اس مرتبہ محفل میں زُمر نعیم کی ہے اس مرتبہ

خاصے کی چیز سنبل کا افسانہ عدت ہے۔ ایک بہت اہم موضوع پر جابکدستی اور مہارت سے سنبل نے قلم اٹھایا ہے اس معاملہ میں بہت سے پوشیدہ اور منفی نکات کو زیر اثر لا کر سنبل نے تحریر کا حق ادا کر دیا ہے یہ تحریر ان کے لیے صدقہ جاریہ بن جائے گی۔ تسنیم منیر علوی کی کہانی، کہانی نہیں آپ بیتی، سوانح یا روزمرہ کی داستان لگی جن میں خوبصورت شاعری کا تڑکا ہے افہام و تفہیم کے گل بوٹے اور پھندنے ٹانکے گئے ہیں ایک خوبصورت کاوش ہے رامس نے بہت دنوں بعد بہت جم کر لکھا کہانی نئی نہیں، اسلوب میں جدت اور ندرت ہے مکالموں کی کمی محسوس ہوئی، اس کے برعکس نبیلہ نازش راؤ کے 'بازار حسن' میں مکالموں کی زیادتی اور کہانی کی کمی ہے۔ ایک اور خوبصورت افسانہ الماس روحی کا سمجھوتے ہے سیل، رواں اور سبک انداز میں لکھی گئی یہ کہانی بہت سے گھروں کی کہانی ہے عورت کی قربانی اور ایثار کی یہ کڑی اور لڑی انوکھی اور پُر اثر ار ہے یہ کڑی اور لڑی پر میں فاتحہ پڑھ رہی ہوں کہ ایک نقطہ نے ہمیں محرم سے مجرم بنا دیا والی مثال صادق نہ آ جائے کہ اس مرتبہ کمپوزنگ کی بہت غلطیاں ہیں اس جانب توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ کچن کارنر کی نادیہ طارق سے بہت ادب سے یہ کہنا ہے کہ براہ کرم سیدھی سادھی گھریلو ٹائپ ترکیبیں دیا کریں یہ شلجم کا قورمہ، مولی کا حلوہ، اور ٹوئسٹ بینگن ٹائپ کی چیز ہم سے ہضم نہیں ہوتیں۔ منزہ! اس ضمن میں یہ کہنا ہے کہ قارئین سے ہر ماہ چار تراکیب لیں انہیں آزمائیں اب بات ہو جائے تقریب کی روداد کی چند نام مجھ سے سہواً ذکر کرنے سے رہ گئے تھے ان کا تذکرہ بہت ضروری ہے صبیحہ شاہ اپنے صاحبزادے کے پاس بحرین گئی ہوئی ہیں ڈاکٹر شہناز انور شفاء کو پڑھنے کو بہت دل کرتا ہے مگر وہ فون نہیں اٹھاتیں حمیرا راحت اور ڈاکٹر سمیس رخ اپنی اپنی مصروفیات اور رنگینیوں میں گم ہو کر رہ گئی ہیں دردانہ نوشین کا قلم سویا سویا سا ہے انگڑائیاں لے کر بیزار نہیں ہو رہا ہے۔ اب چند سطریں کاشی بھیا کے لیے ہیں کاشی تم نے سچی کہانیاں کی محفل کے آخر میں جو نظم لکھتی ہے وہ میلہ لوٹ لینے والی ہے بالخصوص آخری سطر دل کو چھو گئی۔ میرا قلم تمہارے جریدہ میں لکھنے کو بے چین ہے بہت سی سچی کہانیاں دل و دماغ میں جگہ بنا رہی ہیں مگر قلم ہے کہ جولانی اور توانائی کو ترسا ہوا ہے کبھی دل میں دھڑکن بنا کر گرمانے کی کوشش کرتی ہوں تو کبھی مائیکرو ویو اوون میں رکھ کر پگھلاتی ہوں دعا کرو نیا سال میرے قلم کا سال ہو۔ یہ چند سطور تمہارے اوپر قرض تھیں سو، سود سمیت اتار دی ہیں اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو سب کو سلام و دعائیں۔

☆ ڈیئر شائستہ! آپ کا تبصرہ تو دال میں دیسی گھی کے تڑکے کی مانند ہوتا ہے۔ بہت سے اہم فیصلے آپ کے تبصرے کے بعد ہی ہوتے ہیں...... سمجھ گئی ہوں گی اور ہاں آپ ان چند خوش نصیب لوگوں میں شمار ہوتی ہیں جن کی کسی بات پر بھی منزہ کو غصہ نہیں آتا تبصرہ بھرپور ہے۔ کمپوزرز کے کان کھینچنے بہت ضروری ہو گئے ہیں اس لیے کہ ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ بہرحال شائستہ اب آپ کے افسانے کا انتظار ہے۔

✉: یہ ہیں ہنستی کھلکھلاتی عقیلہ بہت اچھی سی رضوانہ پرنس...... خوش رہو...... مسکراتی رہو جھلملاتا، مسکراتا، خوبصورت آنکھوں والی دوشیزہ سے سجا رسالہ میرے ہاتھ میں ہے منزہ سہام کا اداریہ بہت خوبصورت رہا، دراصل جو لوگ ایسے ہوتے ہیں نا، تعصبی نفرت پھیلانے والے وہ یہی کرتے ہیں، یہی ان کی روایت ہے اور یہی ان کا دھرم۔ محفل خوبصورت رہی اب میں کیا کہوں، رضوانہ بہت بہت

شکریہ آپ نے مجھے اپنائیت سے خوش آمدید کہا ان تمام دوستوں کا بے حد شکریہ جن کو میرا افسانہ پسند آیا۔ کچھ تحریریں مصنف کو ذاتی طور پر پسند ہوتی ہیں ریشماں، پگلی اور عورت، میری پسندیدہ تحریر تھی، آپ نے سراہا مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ سیما رضا کی بہن کے انتقال کا سنا بہت افسوس ہوا خدا مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ فیس بک پر صبیحہ شاہ صاحبہ نے اطلاع دی کہ محترمہ گل صاحبہ خالق حقیقی سے جا ملیں، یا اللہ کیسے کیسے لوگ خاک کا پیوند ہو گئے ہیں اللہ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔ پیاری شمع آپ کی محبتوں کا بہت شکریہ خوش رہیے۔ احسن خان سے ملاقات اچھی رہی منشا پاشا سے ملاقات اچھی رہی۔ Ary کے پروگرامز پر تبصرہ اس لیے نہیں کروں گی کہ میں ٹی وی بہت کم دیکھتی ہوں، بس نیوز تک ہی ٹی وی سے رابطہ ہے فرحت صدیقی صاحبہ آپ کو بے حد مبارکباد۔ رفعت سراج کا ناول بہت ہی زبردست جا رہا ہے، پڑھ کر بہت کچھ سیکھنے کو مل رہا ہے اُم مریم بھی اچھا لکھ رہی ہیں، سباس گل کا مکمل ناول مناسب رہا، حبیبہ عمر کے ناولٹ کے اگلے حصے کا انتظار رہے گا ویلڈن حبیبہ صاحبہ سعدیہ عابد کی تحریر بہت اچھی لگی لیکن یہ کیا تقریباً ہر کہانی کے آخر میں لکھا تھا بقیہ اگلے ماہ...... تسنیم منیر صاحبہ، شاہدہ اور باقی سب نے اچھا لکھا، دراصل تفصیلی تبصرہ اس لیے نہیں کر رہی کہ بے حد بزی ہوں لیکن میں نے پڑھا سب کو ہے اور یقیناً جن کو نہ پڑھ سکی انہوں نے بھی اچھا لکھا ہوگا۔ تمام مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح اچھے رہے۔ مائی ڈیئر رضوانہ دراصل ویکیشن پر جانے کی تیاریاں ہیں گھر میں ایک ایک چیز کو تسلی سے بند کرنا، بچوں کے بیگز تیار کرنا اور پھر میرے کپڑے Oh my GOD وہ تو دنیا کا سب سے اہم مسئلہ ہوتے ہیں دوستوں کچھ ہفتوں کے لیے سفر پر جا رہی ہوں اس امید پر کہ آپ سب مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے گا...... سرکاشی چوہان میرے بھائی تم کہاں ہو تم نے دوشیزہ کو خیر باد کیا ہے یا ہم ساری بہنوں کو بھی خدا حافظ کہہ دیا۔ رضوانہ انشاء اللہ واپس آنے کے بعد ایک تفصیلی تبصرہ اور منزہ اور آپ سب سے ملنے ضرور آؤں گی کہ میرا لنچ دوشیزہ پر ادھار ہے لو بھئی جیسے ہی پتا چلا کہ عقیلہ حق نہیں ہیں آپ لوگوں نے لنچ ہی رکھ لیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے کیا! ہے نا! کوئی بات نہیں خوش رہیے مسکراتی رہیے زندگی باقی تو پھر ملیں گے۔

☆ پیاری عقیلہ! یہ کھلا تضاد نہیں کہ پڑوس میں ہو مگر پڑوسیوں کے حقوق کا ذرہ بھی خیال نہیں، اب تو آپ کے پڑوسی ہوئے ایک سال ہو گیا۔ پہلے کے لوگ اچھے تھے۔ پڑوس آباد ہوتے ہی کھانے کی ٹرے لیے چلے آتے تھے۔ مگر اب لوگ بدل گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ "تیرے وعدے پر جئے تو یہ جانا" خیر یہ تو مذاق کی بات تھی ہمیشہ کی طرح بھرپور تبصرے کے ساتھ آنے کا شکریہ۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے ہماری سنبل کی، لکھتی ہیں۔ ڈیئر رضوانہ پرنس، السلام علیکم! اللہ کا شکر و احسان ہے ہماری طرف سب خیریت ہے اور آپ سب کی خیریت اللہ تعالیٰ سے نیک مطلوب ہے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ ابھی درمیان میں خط لکھا تھا مگر نامہ برنامہ کے ساتھ پہنچا ہی نہیں۔ دل ٹوٹ گیا پھر اگلے مہینے خط لکھا ہی نہیں دکھ جو تنا تھا۔ ابھی دسمبر کا شمارہ نہیں آیا ہے۔ سوچا نومبر کے شمارے پر ہی تبصرہ کر دوں۔ منزہ کا اداریہ ہمیشہ سوچ کے در وا کر دیتا ہے۔ دوشیزہ کی محفل کا تو مزہ ہی الگ ہے۔ فوزیہ بہت شکریہ میری تحریر پسند کرنے کا۔ آپ کی تحریر لائق تحسین تھی۔ شروع سے آخر تک
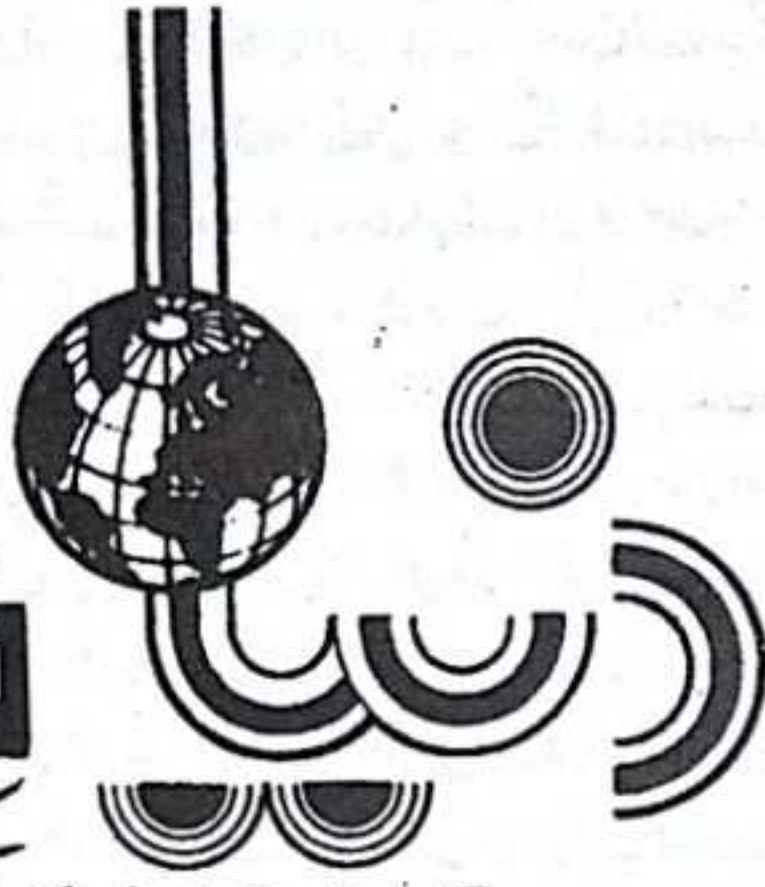
ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرسالانہ

ملک	زرسالانہ	ملک	زرسالانہ
کویت	55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز
یو اے ای	55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز
مصر	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز
یونان	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز
فرانس	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز
برطانیہ	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز
ناروے	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز
امریکہ	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز
افریقہ	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے 88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

اس نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا اور آپ نے اس کا اینڈ میں بہت زبردست کیا۔ اور ہاں ثمینہ جی آٹو ہندی کا نہیں انگلش کا لفظ ہے۔ جس کے معنی خود کار ہیں۔ پتا نہیں ہم کیوں سارے کریڈٹ ہندوؤں کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ انٹرویوز سب مختصر اور اچھے تھے۔ شگفتہ کو بیٹے کا نکاح بہت مبارک ہو۔ اور صفیہ سلطانہ کو بھی ان کے شہزادے کی شادی بہت مبارک اللہ دونوں کپلز کو زندگی کی ہر خوشی سے ہمکنار کرے (آمین) دامِ دل کی تعریف تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ رحمٰن، رحیم کا اونٹ پتا نہیں کس کروٹ بیٹھے گا۔ پہلے بریرہ، ہارون اور علیزے، عبدالہادی اور اس تھوڑے سے فرق کے ساتھ کچھ ویسے ہی حالات قدر، عبدالعلیٰ اور عبداللہ اور اتباع بہرحال دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ نسرین جی الوینہ، اور آشی کو جدا کیوں کیا۔ میں تو ویسے بھی ان لوگوں میں سے ہوں جو کہتے ہیں تمہی کو ہم نے چاہا تمہی ملتے تو اچھا تھا۔ فوزیہ غزل کا فارمولا افسانہ ٹھیک تھا۔ شمع حفیظ آپ تو ڈائیلاگز کی بادشاہ تھیں آپ کا انداز اتنا بیانیہ کیوں ہوگیا ہے۔ یار اپنے پرانے انداز میں واپس آئیں۔ مجھے نہیں اچھا لگتا یہ انداز۔ ہمارے میڈیا کے کارناموں پر صدف آصف کی تحریر اچھی لگی۔ فرحین اظفر کی تحریر مجھے بہت پسند آئی مرد ہمیشہ یہ سمجھتا ہے کہ میری تسخیر شدہ عورت کہیں جا ہی نہیں سکتی۔ لیکن وہ کبھی نہیں جان سکتا ساتھ رہنے اور ساتھ ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ دردانہ عام سی بات کو اتنے خاص انداز میں کہتی ہیں کہ دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ ثمینہ فیاض کا افسانہ ٹھیک ہی تھا۔ ہائے عقیلہ کتنا پیارا افسانہ لکھا، رلا دیا۔ عورت کو شاید ہی کسی نے اتنا اچھا پورٹرے کیا ہو، ویلڈن ویری گڈ۔ عابدہ سبین کے ناولٹ پر مکمل ہونے پر بتاؤں گی۔ سعدیہ کا اترن غضب کا افسانہ تھا بہت زبردست۔ ہاشانی صاحب ایک زمانے بعد آئے اور ہمراہ سوئٹ ڈِس پروفیسر بریانی لائے بہت زبردست ہاشانی صاحب دیر آمد درست آمد۔ نئے لہجے میں نئے شعراء بہت کمال لکھ رہے ہیں انشاء اللہ یہ سب بہت آگے جائیں گے۔ دوشیزہ گلستان میں تمام فن پارے بہت اچھے تھے۔ خصوصاً حمد، چٹ پٹی خبریں، واقعی چٹ پٹی تھیں یار کچن کارنر میں چائنیز زنگر، پزا اور کیکس کی تراکیب بھی دیں یہ تو ہوا تبصرہ۔ پرچہ بہت خوب تھا آپ کی محنت نظر آرہی ہے۔ اب آپ سنائیں آپ کیسی ہیں؟ بقول رفعت سراج ہز ہائی نیس، موسم بدل رہا ہے کراچی والے قناعت پسند اسی موسم کو انجوائے کرنے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ لحاف، کمفرٹر اور مکمل سویٹرز، جیکٹس اور اسٹولز سب نکل آئے ہیں سو پیپی ونٹر سیزن اب اجازت دیں۔ اپنا خیال رکھیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ پیاری سنبل! آپ بھی اپنا بہت خیال رکھیے گا اور ہاں اگلے ماہ آپ کا تبصرہ سب سے پہلے ہم تک پہنچنا چاہیے۔

✉: کراچی سے رقم طراز ہیں ہم سب کی شگفتہ شفیق پیاری سی رضوانہ جی! السلام علیکم! بھئی ہم ہمیشہ دوشیزہ کی تعریفیں لکھتے ہیں لیکن آج تو ہمارا دل اپنی مہربان پری منزہ اور اُن کی معاون رضوانہ کی تعریفیں کرنے پر اُکسا رہا ہے کہ جیسے ہی ہم نے اپنی فیس بک کھولی ہے بارلی کیوٹو نایٹ کا ظہرانہ اور سب رائیٹرز کی خوش گپیاں،، قہقہے،، جملے بازیاں نظروں کے سامنے پھرنے لگی ہیں منزہ سہام نے جب لنچ کی دعوت دی تو ہم نے یہ سوچا کہ ہم دوشیزہ کے آفس پہنچ جاتے ہیں وہاں سے جانے میں سہولت رہے گی لیکن چونکہ اُسی دن سیمارضا نے ہم کو ایف ایم ۹۳ پر مدعو کرلیا تو پھر ہم نے اپنا ارادہ بدل لیا اور بہت دنوں کے بعد تنہا گاڑی لے کر چلے اور اس تھرل کا مزہ ہی اور ہے گاڑی ڈرائیو کرنا ہم کو بے حد مرغوب ہے لیکن یہ واحد پابندی ہے جو ڈاکٹر نے ہم پر لگائی ہے پر وہ شگفتہ ہی کیا جو باز آجائے تو ہم سب سے پہلے با

بی کیوٹو نایٹ پہنچ گئے اور پارکنگ میں بیٹھ کر خوب انتظار کیا کچھ دیر کے بعد سنبل اور فرح اسلم قریشی دور سے جاتی ہوئی نظر آ ئیں پھر کاشی اور زبیر صاحب آئے اور جب میز بان صاحبان تشریف لے آئیں تو ہم بھی خراماں خراماں اندر چلے آئے پھر تو جو محفل پر رنگ چڑھتا گیا کمال ہے، رائیٹرز کی کہکشاں سی اُتر آئی تھی جس میں رفعت سراج سیمار ضا شائستہ عزیز رضوانہ پرنس نزہت جبیں ضیا' سنبل الماس روحی منزہ کے دو چاند ماریا فرح اسلم قریشی اور بہت سے اور لوگ جن کے نام بھول گئے ہیں زبردست ڈس کشن میں مزے دار کھانے سے انصاف کیا گیا ہر چیز لاجواب تھی چاہے وہ پرونس مصالحہ ہو یا چکن بریانی ہم کو تو بجی بے حد پسند آئی وایٹ چکن کڑھائی کی تعریف نہ کرنا سخت بُری بات ہوگی اور چکن بوٹی اُس سے بھی زیادہ لزیذ ثابت ہوئی کولڈڈرنک گرین ٹی اور آئیسکریم کا تڑکہ الگ الغرض کہ ایک انتہائی خوبصورت پیارا یادگار دن حاصل زندگی ٹھہرا جس کے لئے ہم دوشیزہ کے ممنون ہیں اور خلوص دل سے کہتے ہیں جنگل میں منگل تیرے ہی دم سے سب نے یہ شور مچایا ہے سالگرہ کا دن آیا ہے سو سالگرہ مبارک دسمبر کا دوشیزہ بے حد پسند آیا احسن خان ہمارا بھی پسندیدہ ہیرو ہے منزہ کا کاٹ دار ادار یہ بہت اچھا لگا پیارے ساتھیوں کی آنگن میں بارات کی مبارک باد کا بہت شکریہ افسانے ایک سے بڑھ کر ایک رہے محبت ہم نے بھی تھی آئینہ دکھاتی ہوئی تحریر تھی،، اللہ دوشیزہ کو اور عروج سے نوازے آمین آخر میں ایک چھوٹی سی نظم

خواہش

بند ہیں لب دل محوِ دُعا ہے
تیری محبت کی خوشبو سے جاناں
میکتا رہے یونہی میرا آنگن
جب بھی سالگرہ ہو میری
پہنائے سدا مجھ کو پھولوں کے کنگن
قائم رہے پیار بھرا یہ بندھن
بن کے رہے تو میرا ساجن

☆ شگفتہ جی! آپ کی محبتوں کے ہم کیا سارا زمانہ ہی اسیر ہے اب اس کے بعد اور کیا لکھیں لیکن بھئی ڈاکٹر کی بات کبھی کبھی مان لینی چاہیے امید کرتے ہیں کہ جلد افسانہ کے ساتھ آئیں گی۔

ساتھیو! اب اس محفل کو سمیٹتے ہوئے ہمیں آپ سے اجازت لینی ہوگی۔ اگلا شمارہ انشاء اللہ سالگرہ نمبر 2 ہوگا۔ ان دعاؤں کے ساتھ اپنی میزبان کو اجازت دیجیے۔

تم آرزو کے دیے جلا کر، خدا سے اچھی امید رکھنا
وہ تیرا رب ہے وہ تیرا اپنا، اسی کو اپنا حبیب رکھنا
غموں کو دل میں کبھی نہ رکھنا، اسی کو اپنے قریب رکھنا
رحیم ہے وہ کریم ہے اسی کو اپنے قریب رکھنا
اللہ آپ سب کو ہمیشہ خوش اور اپنی امان میں رکھے۔

دعاؤں کی طالب
رضوانہ پرنس

ہم اور ہمارے مہمان

ہمارے لکھاری ہمیشہ ہمارے دل کے بہت قریب رہتے ہیں۔ دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب قلم برادری کی کہکشاں ثابت ہوتی ہے۔ بھلا کون ہے جو پرل پبلی کیشنز کی قلم دوستی کا معترف نہیں۔ اپنے لکھاریوں کو مان دینا ہماری روایت رہی ہے۔ منزہ سہام اس روایت کی پاسداری بحسن وخوبی نبھا رہی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ان کے صاحبزادے دانیال شمسی اور زین شمسی بھی ہم قدم ہیں۔ پچھلے دنوں اپنے کچھ نئے اور پرانے لکھاریوں کے لیے ایک ظہرانہ دیا گیا' جس کے کچھ یادگار پل بصورت تصاویر قارئین کی نذر......!

منزہ سہام، سنبل، شگفتہ شفیق، فرح اسلم قریشی، رضوانہ پرنس، علی زبیر ظہرانے سے پہلے

سنبل کے شوہر نامدار واجد نور خان، علی زبیر، فرح اسلم قریشی کی صاحبزادی خضراء، نئی لکھاری ساتھی ماریہ یاسر، کاشی چوہان اور نزہت جبیں ضیاء ظہرانے سے پہلے دیگر ساتھیوں کا انتظار کرتے ہوئے

دورانِ ظہرانہ لکھاری ساتھی خوشگوار موڈ میں......اپنی مدد آپ کرتے ہوئے

دورانِ ظہرانہ منزہ سہام، ماریہ یاسر، رضوانہ پرنس، فرح اسلم قریشی اور شگفتہ شفیق

ظہرانے کے بعد......شائستہ عزیز، منزہ سہام، سنبل، ڈاکٹر الماس روحی، سیمار ضا ردا خوش گوار موڈ میں

رفعت سراج، رضوانہ پرنس، شگفتہ شفیق، منزہ سہام، سیمار ضارداا ور شائستہ عزیز

دانیال شمسی، شگفتہ شفیق، منزہ سہام اور زین شمسی ظہرانے کے بعد

سنبل، فرح اسلم قریشی، نزہت جبیں ضیاء، شگفتہ شفیق، سیمار ضاردا، رضوانہ پرنس، دانیال شمسی
رفعت سراج، منزہ سہام اور زین شمسی ظہرانے کے بعد

ہم اور ہمارے مہمان

ظہرانے کے یادگار لمحات کو ہماری لکھاری بہنوں نے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اُن لمحات کی روداد قارئین کے روبرو۔ 'ہم اور ہمارے مہمان' پڑھیے اور بتایئے کہ اُس دن کا احوال آپ کو کیسا لگا۔

تاثراتِ تقریب

(شائستہ عزیز)

یہ ماہ نومبر کی خنکی بھری ایک صبح کا ذکر ہے۔ جب پرل پبلی کیشنز کی روح رواں منزہ سہام کا فون میرے پاس آیا وہ مجھ سے ناولٹ کا تقاضہ کر رہی تھیں۔ میں نے بھی وعدہ کرلیا میں نے منزہ سے کہا کہ وہ رائٹرز کے مل بیٹھنے کا کوئی سامان کریں۔ بڑے دن ہوئے کوئی ایسی تقریب نہیں ہوئی میری اس بات نے گویا اُن کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اسی ماہ دوبارہ اُن کا فون آیا کہ چوبیس نومبر کو ہماری طرف سے چیدہ چیدہ لکھاریوں کے لیے ظہرانے کا انتظام ہے۔

پہلے سمندر کے کنارے آباد ہوٹل کا انتخاب کیا گیا پھر نامعلوم وجوہات کی بنا پر سمندر کے قریب ہی شہر کے ایک معروف ریسٹورنٹ کے نام قرعہ فال نکلا۔ اُس دن سورج کی تپش کے ساتھ ساتھ فضا میں سمندر کی مخصوص ہوا اور مہک رچی بسی تھی۔ بیس بائیس برسوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی ادبی تقریب میں سیما مناف کے بغیر جا رہی تھی۔ وہ مجھے بہت شدت کے ساتھ یاد آرہی تھی۔ سیما کی امریکہ سے واپسی چار دسمبر کو متوقع ہے۔ میرے شوہر میرے ہمراہی تھے۔

ریسٹورنٹ میں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ میں سب سے آخر میں پہنچی ہوں مگر میرے بھی بعد لکھاری نزہت جبیں ضیاء آئیں۔ ہال کا ماحول خاصا خوشگوار تھا۔

دبی دبی سرگوشیوں کے بجائے خواتین لکھاری خاصی تیز آوازوں اور دبنگ قہقہوں کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ سب میں نمایاں آواز رفعت سراج کی تھی۔

مجھے سب سے آخر میں جگہ ملی جس پر منزہ کو خاصی تشویش تھی۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں کھانا کھا کر وہاں آتی ہوں۔ صد افسوس کہ اس دوران میں ان لوگوں کی گفتگو کا حصہ نہیں رہی۔ میری تمام تر توجہ کھانے پر مرکوز تھی۔ جو خاصا لذیذ تھا۔ جھینگا کڑاہی' چکن کڑاہی' افغانی پلاؤ' چکن تکہ تمام تر لوازمات کے ساتھ کولڈ ڈرنکس' قلفی' آئسکریم اور آخر میں سبز قہوہ' سب کھانے سے بھرپور انصاف کر رہے تھے۔

کھانے کے دوران میں نے ایک طائرانہ سی نظر ہال پر ڈالی جہاں دیواروں پر معروف شخصیات کے بلیک اینڈ وائٹ پورٹریٹس آویزاں تھا۔ جو کبھی نہ کبھی کسی حوالے سے اس ریسٹورنٹ میں آتے رہے ہیں جن میں قابل ذکر نام ملکۂ ترنم

نور جہاں کا تھا۔
کھانے کے بعد منزہ نے مجھے اپنے قریب سب رائٹرز کے درمیان بلالیا۔ میرے ساتھ 'انٹرنیٹ کی شہزادی' شگفتہ شفیق براجمان تھیں۔ ساتھ ہی الماس روحی لیکچرار دوست اور کولیگ کے ہمراہ' برابر میں رفعت سراج' فرح اسلم قریشی' علی زبیر (جن کی سماعتوں کا آج امتحان تھا) تھے۔ منزہ کے پہلو میں سنبل (نزاکت اور نسوانیت کا پیکر) اُن کے برابر ہنر مند سیما رضا ردا' ہمیشہ کی طرح جدید تراش خراش کے لباس میں ملبوس تھیں مگر خاصی چپ چپ اور افسردہ۔ بعد میں عقدہ کھلا کہ اُن کی ہمشیرہ کا ایک ہفتہ قبل انتقال ہوا ہے۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی استدعا ہے۔
کاشی چوہان' اپنی استاد رفعت سراج کی موجودگی میں مارے رعب ادب کے دہرے ہوئے جارہے تھے۔ وہ نزہت جبیں کے برابر میں بیٹھے اُن سے مصروف گفتگو تھے۔ دونوں کے درمیان گفتگو جاری تھی۔ نزہت مجھے مخاطب کر کے کہہ رہی تھیں بہو آگئی ہے ناں تو ذمہ داریاں کم ہوگئی ہیں اس لیے لکھنا زیادہ ہوگیا ہے۔' پوری تقریب کے دوران انہوں نے کئی بار یہ بات دہرائی تو میں نے دل میں دعا کہ کاش ہر لکھاری کو ایسا بیٹا بہو عطا ہو۔ آمین۔
رفعت سراج اپنے مخصوص جولانی انداز میں 'جانِ محفل' بنی ہوئی تھیں۔ رفعت جادوگر مصنفہ ہونے کے ساتھ ساتھ لفظوں کی ملکہ بھی ہیں۔ بات سے بات نکالنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ اُن کی موجودگی میں شاید ہی کوئی دوسرا بول سکتا ہے۔ میں یک ٹک انہیں بدلتا دیکھ کر سوچ رہی تھی بقول شاعر۔

میں تیرے سنگ کیسے چلوں سجناں
تُو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

قریب کی میز پر بیٹھا مولویوں کا جتھا رفعت کے بلند قہقہوں پر بار بار مڑ کر اِدھر دیکھتا تو مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں کوئی فتویٰ نہ صادر ہوجائے۔ میری طرح رفعت نے بھی سرخ رنگ زیب تن کررکھا تھا۔ حسبِ گمان منزہ اور رفعت نے گلے میں موتیوں کی مالا پہن رکھی تھیں۔ دو چیزیں تو طے ہیں کہ کبھی بوڑھی نہیں ہوں گی ایک رفعت کا قلم دوسرے اُن کے خوبصورت بال' جنہیں شگفتہ بڑی حسرت سے بار بار چھوکر دیکھ رہی تھیں۔
بیوٹی ود برین فرح اسلم قریشی ہمیشہ کی طرح پُر بہار' مسکراتی ہوئی۔ ساتھ میں چھوٹی سی بیٹی خضرا' سمیرہ سے سب کی تصویریں اُتارنے میں شاداں وفرحاں۔ علم ہوا کہ فرح' شہر کے مستند تعلیمی ادارہ سے بطور معلمہ وابستہ ہیں۔ الماس روحی بھی کالج میں لیکچرار ہیں۔ آج ایک نئی ساتھی مہمان بھی تھیں۔ جو ٹکر ٹکر سب کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر تھوڑی حیران تھیں۔ یہ تھیں ماریہ یاسر'ان کا نام جان کر مجھے روحی یاسر یاد آگئیں پھر تو یادوں کی پٹاری کھل گئی۔ نگہت اعظمی' نسیم آمنہ شاہ' غزالہ رشید' فریدہ مسرور' سکینہ فرخ' ناہید عزمی' رُخ چوہدری' ناہید چوہدری' ایڈیسن سب یاد آنے لگے۔ ایڈیسن کے نہ آنے پر منزہ سخت خفا تھیں۔ وہ وعدہ کر کے نہیں آئے۔ کچھ اور لکھاری بھی حسبِ وعدہ نہ آسکے۔ جن کا منزہ کو بہت افسوس تھا۔
ایڈیسن کے لیے تو میں یہ کہوں گی کہ 'کا ہے کو بیاہی بدیس وے لکھیا بابل موہے۔' شگفتہ شفیق نے اپنے موبائل میں ایک جہان سمویا ہوا

ہے۔ وہ مجھے تصویریں دکھا رہی تھیں۔ ابھی حال ہی میں لندن میں مشاعرہ لُٹ کے آئی ہیں۔ انہوں نے تصویر دکھائی، یہ دیکھو میرے ساتھ امجد اسلام امجد، وصی شاہ اور دیگر بیٹھے ہیں۔ کنزل اور بیٹے کی شادی کی تصاویر، کینیڈا کی طوفانی برف باری میں اتاری گئی شگفتہ کی تصاویر، ایک طرح سے وہ دوشیزہ کے قلم قبیلے کی 'ابنِ بطوطہ' ٹھہریں۔ میں نے اُن سے تازہ اشعار سنانے کو کہا۔ آپ سب کی بھی تفریحِ طبع کی نذر ہیں۔

جینے کے میسر مجھے سامان بہت ہیں
مجھ پر تو میرے محبوب کے احسان بہت ہیں
غارت ہوا جاتا ہے سکون چین سب ہی کچھ
دل کو بھی لگانے میں تو نقصان بہت ہیں
بہبودی کے بھی تو کچھ کام کر کے دکھائیں
اونچے تو میرے ملک کے ایوان بہت ہیں

اس تقریب کی خاص بات رضوانہ پرنس کا بار بار چونک کر کہنا۔ 'اللہ ہم نے نہیں سُنا پھر سے کہیے گا' تھی کئی مرتبہ رفعت کی باتوں میں یہ مرحلہ آیا تو رفعت دو مرتبہ شگفتہ کو سنایا جانے والا قصہ تیسری مرتبہ رضوانہ کو سنانے لگتیں۔

رفعت کہہ رہی تھیں 'میرے ایک افسانہ آدھے لوگ پر دوشیزہ میں چار سال سنسر لگا رہا۔ اس پر رضوانہ رگِ مدیرانہ پھڑکی۔ 'اللہ ہمیں دے دیجیے ناں۔' رفعت نے شانِ بے نیازی سے کہا۔ 'وہ تو کب کا چھپ چکا' رفعت نے باتوں باتوں میں کہا کہ وہ سابق صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کی بہت معتقد ہیں جس پر منزہ بہت خوش ہوئیں۔ 'You Make May Day' اس میں میرے نام کا بھی اضافہ کرلیں۔ میں نے مسکرا کر کہا تو منزہ کی خوشی اور حیرت دیدنی تھی۔

درمیان میں واحد 'انار' علی زبیر کو بھی دعوت سخن دی گئی مگر انہوں نے موبائل کان سے لگائے بس مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''مومی گڑیا' سنبل جو بولتی کم اور مسکراتی زیادہ ہیں سب کی باتیں دلجمعی سے سُن رہی تھیں۔ رفعت سراج نے اس وقت کھل کر سیما رضا کی کمپیئرنگ کی تعریف کی۔

''سیما تمہارا تو جواب نہیں ہے۔ میں تو مر کر بھی دوبارہ پیدا ہو جاؤں تو ایسی کمپیئرنگ نہیں کر سکتی۔' سیما نے اپنے مخصوص عاجزانہ دلکش انداز میں شکریہ کہا۔

میں نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ ہر تقریب میں سیما کا لباس سب سے منفرد اور جدید انداز کا ہوتا ہے۔ بالوں کی تراش خراش اور گفتگو کا انداز انہیں سب میں نمایاں کرتا ہے۔ اب کاشی سب میں رسائل تقسیم کر رہے تھے جو الماس روحی لے کر آئی تھیں۔

رفعت کے سامنے پہنچ کر بہت جھک کر انہوں نے رسالہ دیا۔ بعد میں کاشی نے بتایا کہ اُن کے زمانہ طالب علمی میں اسکول کی سب سے شرارتی کلاس رفعت سراج کو دی گئی تھی۔ اُن کے پاس موٹا لمبا ڈنڈا ہوا کرتا تھا۔ وہ اسکول میں سخت گیر استاد کے طور پر مشہور تھیں۔ تھوڑے دنوں میں وہ کلاس تیر کی طرح سیدھی ہوگئی۔

اُن کی قابلیت اور مار کا نتیجہ ہے کہ آج اُن کے شاگرد اعلیٰ عہدوں اور جگہوں پر فائز ہیں جس کا سارا کریڈٹ رفعت سراج کو جاتا ہے۔

وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ ہال کا ماحول پرفسوں تھا۔ اب تصاویر اترنے کی باری

آئی تو سب کے موبائلز اور کمرے میں متحرک ہوگئے۔ ڈھیروں تصاویر اتاری گئیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایک بڑا گروپ بنا کر سب کھڑے ہوگئے اور سامنے کوئی تصویر بنانے والا نہ تھا۔ ہمیں تو صرف ویٹرز کی دبی دبی معنی مسکراہٹیں' تصاویر بنوانے کا یہ سلسلہ نیچے اُتر کر بھی جاری رہا اور وہی خواتین کی پرانی عادت جاتے جاتے بھی باتیں کرتے جانا، کسی کا دل جانے کو نہیں کر رہا تھا مگر جانا تو تھا۔ ایک ایک کر کے سب رخصت ہونے لگے اب میں منزہ اور رضوانہ کی ہمسفر تھی۔ منزہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے گھر ڈراپ کروادیں گی گاڑی میں۔ میں اِن دونوں کے درمیان تھی۔ رضوانہ' سویرا فلک کے خط کا جواب لکھ رہی تھیں۔ رضوانہ دوشیزہ میں سروے اور رائٹرز کے انٹرویوز کا بھی سلسلہ ہونا چاہیے۔ میں نے تجویز دی جس پر انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

منزہ نے بھی اتفاق کیا۔ رضوانہ کو اُن کی رہائش گاہ پر چھوڑ کر اب ہم دونوں عازمِ سفر تھے اور منزل دوشیزہ کا آفس تھی۔

'شائستہ بس ضروری کام نمٹانے ہیں۔ آپ کو اچھی سی چائے پلائیں گے پھر چلیں گے۔'' منزہ اب سکون سے تھیں، سب کام اُن کی مرضی کے مطابق ہوگئے تھے۔

راستہ میں ہم نے ڈھیروں باتیں کیں، بامعنی بھی اور بے معنی بھی۔ دکھ سکھ شیئر کیے میں نے اپنی بیماریوں کا بتایا تو منزہ نے کہا کہ وہ میرے لیے بہت اچھی ہربل میڈیسن منگوا کر دیں گی۔ مجھے بہت اچھا لگا کہ ادارہ دوشیزہ اپنے لکھاریوں کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے۔ ایک خاص اپنایت اور اُنسیت محسوس ہوتی ہے۔

آفس پہنچ کر منزہ نے ضروری کام نمٹائے۔ اچھی سی چائے پلائی اس ڈانٹ کے ساتھ کہ مجھے میٹھے سے پرہیز کرنا چاہیے ایسے کیسے کام چلے گا۔ واپسی پر منزہ نے مجھے سہام صاحب کا اسکیچ دکھایا جو آفس کی مرکزی دیوار پر آویزاں ہے۔

''یہ بالکل میرے بیٹے دانیال کی جوانی کی تصویر ہے' میں نے بھی شدومد سے اتفاق کیا نیچے سیڑھیاں اُترتے ہوئے فلورز پر دو تین کم سن بچے ملے جنہوں نے جھاڑو ہاتھ میں اٹھائی ہوئی تھی۔ انہوں نے زوروشور سے منزہ کو سلام کیا۔ منزہ نے پوچھا۔

''بھائی نے پیسے دے دیے؟'' ''جی باجی!'' جواب ملا۔ میں حیران تھی۔

''یہ کیا ماجرا ہے؟'' گاڑی میں بیٹھ کر میں نے منزہ سے دریافت کیا کہ یہ بچے کون ہیں اور کون سے پیسوں کی بات ہورہی تھی۔ منزہ کے چہرہ پر ہچکچاہٹ تھی تردد تھا۔

وہ شاید بتانا نہیں چاہ رہی تھیں۔ قدرے تامل کے بعد جواب ملا۔

''شائستہ یہ بچے باہر بھیک مانگتے تھے میں نے اِن سے کہا کہ تم لوگ اوپر سے نیچے ساری سیڑھیوں کی صبح وشام صفائی کیا کرو۔ میں تمہیں پیسے دوں گی۔ اب روزانہ میں ان بچوں کو جو بن پڑتا ہے دیتی ہوں۔ اس طرح سے یہ بھیک مانگنے سے بچ گئے ہیں۔' یہ منزہ کا آج نیا چہرہ میرے سامنے تھا۔ آپ نے بھی دیکھ لیا ہوگا۔

ایسی ہوتی ہیں بڑے باپ کی بڑی بیٹیاں۔

یہی وجہ ہے کہ منزہ کے اداریے اثر انگیز ہوتے ہیں کہ الفاظ اِدھر اُدھر سے مستعار نہیں لیے گئے ہوتے، اُن میں منزہ کا اپنا دل اور

ذات دھڑکتی ہے۔

ہم اس وقت ایک دوسرے کا آئینہ بنے ہوئے تھے۔ پرانے رائٹرز کا ذکر چل نکلا تو ایک ایک کر کے کئی نام میں نے گنوا دیے۔ جویریہ ارشد خان، نسرین قریشی، شعیب علی رحمانی، عرفان راؤ، ثمینہ افتخار اعوان اور کئی دوسرے جو نجانے کہاں ہیں۔ موجودہ رائٹرز میں فرزانہ آغا کی استقامت اور دلشاد نسیم کی آنکھوں اور بالوں کی چمک کا بھی ذکر آیا۔ منزہ اپنے بچپن کی یادوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ شائستہ 'بچپن میں، میں خاصی کم شکل ہوا کرتی تھی۔ میری ناک چپٹی اور دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے بڑے علاج کے بعد ٹھیک ہوئے۔''

میں نے غور سے منزہ کا چہرہ دیکھا' اللہ اکبر! اس چہرے میں بھی کوئی کمی ہو سکتی ہے؟''

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

منزہ آج کے کھانے اور انتظامات کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ سب بہت اچھا رہا، یہ میری رائے تھی۔

جیسا کھانا سیما مناف نے میری جج کی دعوت کے موقع پر کھلایا تھا۔ ویسا لذیذ کھانا میں نے اج تک نہیں کھایا۔ منزہ اعتراف کر رہی تھیں۔ میں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی واقعی سیما دنیا کا ہر کام کر سکتی ہے۔ سوائے اپنے اشک پونچھنے کے۔''

سفر لمبا ہو گیا تھا۔ ہماری باتیں ختم ہی نہیں ہونے میں آتی تھیں۔

میں نے آج ایک بھرپور دن گزارا تھا۔ لمحے میری گرفت میں تھے۔ منزل قریب آ گئی تھی۔ میں نے آج کئی چہرے اصل چہروں کے ساتھ دیکھے تھے۔ میں مسرور و شاداں تھی۔ منزہ کے چہرے پر بھی اطمینان کی پرچھائیاں تھیں۔ وہی سکون جو بیٹی کو بیاہ دینے کے بعد کسی ماں کے چہرہ پر ہوتا ہے۔ وہ ماں ہی تو ہیں۔ ماں کے سینے میں ہی تو حساس گداز دل دھڑکتا ہے۔

آج کا سفر تمام ہونے کو ہے۔ ایک نیا سفر شروع ہونے کو ہے۔

نئی منزلوں نئی جہتوں کا سفر
سراغ اور اسرار کی دنیا کا سفر
جس کے ہم سب باسی ہیں
دوشیزہ کے باسی سچی کہانیاں کے باسی

سب اپنی اپنی دنیاؤں میں محو سفر ہیں۔ وقت کی لگامیں تھامے آگے سے آگے بڑھنے کی چاہ میں ہر مجبوری ہر معذوری کو شکست دیتے ہوئے۔

خدا کرے کہ ایسے سفر ہر روز ہوا کریں تا کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھتے رہیں چاہتے رہیں۔ فی امان اللہ۔

خوبصورت تقریب کا آنکھوں دیکھا حال

(فرح اسلم قریشی)

منزہ سہام نے دوشیزہ کی سابقہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پُر تکلف ظہرانے کے بہانے گلفشن میں واقع 'باربی کیو ٹو نائٹ' میں کراچی میں مقیم لکھاریوں کے ساتھ ملاقات کا اہتمام کیا۔

جہاں منزہ سہام حسبِ معمول جانِ محفل تھیں۔ وہیں رضوانہ پرنس اپنی شوخی طبع سے محفل کو دو آتشہ بنا رہی تھیں۔ اور ہر دلعزیز شگفتہ شفیق اپنی تمام تر شگفتگی کے ساتھ محفل کی رونق میں اضافہ کر رہی تھیں۔ سچ پوچھا جائے تو اس محفل میں رسمی تصنع کا شائبہ تک نہ تھا۔ سنبل اور شائستہ عزیز کی کم گوئی کو منزہ کے برجستہ چٹکلے

پورا کر رہے تھے۔ (یہ الگ بات ہے کہ میں پورا وقت اسی کوشش میں لگی رہی کہ منزہ کے ماہتاب چہرے کو بھول کر اُن کی باتوں پر توجہ دوں)

رفعت سراج کے عالمانہ و ناقدانہ تجزیوں کے ساتھ اُن کا گھریلو خاتون والا روپ بھی ایک حسین امتزاج تھا جس نے سب ہی کو بہت محظوظ کیا۔ معصوم اور سہمی سہمی سی ماریہ یاسر نے اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں میں شوق سمیٹے سب کو ہنستا بولتا دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ الماس روحی جو غالباً سیدھی کالج سے آ رہی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود ملاقات کے اس موقع کو ضائع نہیں کیا وہ سب کے لیے ایک معلوماتی تحفہ بھی لائی تھیں۔ نزہت جبیں جو تمام وقت زبان سے زیادہ اپنی نرم سی مسکراہٹ سے کام لیتی رہیں۔ علی زبیر اور کاشی چوہان شاید پورا وقت اسی موقع کے منتظر رہے کہ خواتین کی باتوں میں وقفہ آئے تو......

قدرے شوخ، حاضر جواب، پُر اعتماد اور دلکش لحن رکھنے والی سیمارضا ردا آنکھوں میں بھی سخن طرازی لیے موجود تھیں غرض دو گھنٹوں کی اس نشست نے ایسا جادو کیا کہ اب تک اس کا خمار چھایا ہوا ہے۔

جیو منزہ خوش رہو اور ہمیشہ اسی طرح محفلیں سجاتی رہو۔ دانیال اور زین العابدین کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کہ انہوں نے بھی بھرپور طریقے سے حق میزبانی ادا کیا۔ کاشی چوہان مجھ سے سر پر ہاتھ رکھواتے رہے۔ گھر آ کر سوچا۔ لو جی ینگ نظر آنے کی تمام تر کوششیں بیکار گئیں۔ خیر یہ تو مذاق کی بات تھی کاشی کا بڑا پن ہے جو یقیناً اُسے بلندی تک پہنچائے گا (انشا اللہ) رفعت کی ایک بات ذہن سے چپک گئی کہ مصنف کی اصل بات بین السطور ہوتی ہے۔

اُس پر شعر یاد آ گیا۔

بات بین السطور ہوتی ہے
شعر میں حاشیے نہیں ہوتے

وہ محبتوں سے سجا دن

(سنبل)

وہ 13 تاریخ جمعے کا دن تھا۔ دوشیزہ آفس سے فون آیا کہ ابھی میڈم آپ سے بات کریں گی۔ اور میں سراپا انتظار بن گئی۔ مگر یہ انتظار انتظار ہی رہا اگلے تین دن تک۔ پیر والے دن 16 تاریخ کو ہماری دوشیزہ پرنسز منزہ کا فون آیا کہ وہ لنچ ارینج کر رہی ہیں دن اور جگہ ڈیسائڈ کر کے وہ دوبارہ فون کریں گی۔ اس کے بعد 20 نومبر کو منزہ نے 24 نومبر منگل والے دن 'بار بی کیو ٹو نائٹ' بوٹ بیسن پر لنچ کی دعوت دی اور محبت بھرے مان سے آنے پر اصرار بھی کیا۔

اس دن میں بڑی خوش تھی۔ صاحب کو بتایا تو چھیڑنے لگے۔ ''اتنا خوش تو تم رشتے داروں سے بھی ملنے پر نہیں ہوتیں۔'' میرا جواب تیار تھا۔ ان سے مل کر کون خوش ہو۔ فضول کے گوسپ' برائیاں اور غیبتیں' دنیا بھی خراب اور عاقبت بھی۔ اور یہ سچ ہے مجھے منزہ اور دیگر رائٹرز سے ملنے کی خوشی ہر خوشی پر بھاری ہوتی ہے۔

بہرحال جمعے سے منگل تک انتظار کافی لمبا تھا۔ مگر بہرحال کٹ ہی گیا اس دن میں بہت ایکسائیٹڈ تھی۔ اتنی ایکسائیٹڈ کہ میزبانوں سے بھی پہلے پہنچ گئی۔ مگر وہاں جا کر پتا چلا کہ کوئی مجھ سے بھی زیادہ ایکسائیٹڈ تھا اور وہ تھیں فرح اسلم اپنی معصوم سی بیٹی کے ہمراہ موجود تھیں۔ ہم دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ دس پندرہ منٹ ہی گزرتے تھے۔ منزہ 'مشیرِ خاص رضوانہ

پرنس کے ساتھ آئیں ساتھ ہی کاشی' دانیال اور زین بھی تھے منزہ ہمیشہ کی طرح بہت محبت سے ملیں اور رضوانہ کا تو اپنا کھلنڈرا سا انداز ہے۔ ان کے اندر ایک بچہ رہتا ہے۔ جو خود بھی خوش رہتا ہے اور آس پاس کے لوگوں کو بھی رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد مہمانوں نے آنا شروع کیا۔ شگفتہ شفیق آئیں تو پتا چلا کہ وہ کافی دیر سے نیچے منزہ کا ویٹ کر رہی تھیں اور سب سے پہلے وہی آئی تھیں سو ایکسائٹمنٹ کا ایوارڈ اُن کا ہوا منزہ' رضوانہ نوٹ کر لیں۔

لنچ پر منزہ نے ایک نئی رائٹر کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ اتنی نئی کہ ابھی ان کی کوئی تحریر بھی نہیں آئی ہے محترمہ کا نام ماریہ یاسر ہے اور محترمہ صرف چار سال سے ہی کراچی میں ہیں مگر ابھی تک کراچی کا کوئی رنگ بھی محترمہ پر نہیں چڑھا ہے۔ رائٹرز کے کھٹے میٹھے سوالات کے جوابات انتہائی معصومانہ تھے میں نے کہا واقعی ابھی نئی ہے۔ اس کے بعد رائٹرز آنے لگے۔ علی زبیر' رفعت سراج' الماس روحی' سیما رضا' شائستہ عزیز' نزہت جبیں وغیرہ۔

ماشاء اللہ سے رفعت جتنا اچھا لکھتی ہیں۔ ویسے ہی اچھا بولتی بھی ہیں۔ رضوانہ سالگرہ سروے کا پوچھ رہی تھیں مجھ سے اور فرح سے پوچھا۔ مگر ہمیں نہیں ملا تھا میں نے کہا۔ 'سارے اچھے اچھے اور پیارے پیارے رائٹرز کو بھول گئیں۔' وہ ہنسنے لگیں نہیں ابھی پرسوں ہی تو ڈیسائڈ کیا ہے۔ (لو جی تین دن کم ہوتے ہیں)

رائٹرز تھوڑے لیٹ تھے۔ مگر لنچ کا ایک وقت ہوتا ہے۔ سو منزہ نے کھانا آرڈر کر دیا۔

مجھے منزہ کی برابر والی ہی سیٹ ملی تھی۔ اب دل تھام کر مینیو سنیں۔ مٹن روسٹڈ لیگ' پراؤن مصالحہ' وائٹ چکن کڑھائی' افغانی پلاؤ' چکن تکہ' رائتہ' مزے مزے کی چٹنیاں' سلاد اور مزیدار دھنیے اور تل والے نان اور کولڈ ڈرنکس (سب کی اپنی اپنی پسند کی جن میں انار جوس' اناناس جوس' اور لیمن لائم بھی شامل تھے) کھانے کے بعد قلفی اور آئسکریم اور آخر میں گرین ٹی۔ آ گیا ناں منہ میں پانی۔ سو آپ پانی کا منہ میں مزہ لیں ہم نے کھانے کا مزہ لیا۔ میں کھانا کھانے میں مگن تھی دو بار رضوانہ نے غالباً پکارا چکن کڑھائی کے لیے۔ میں بڑے انہماک سے کھانے میں مصروف تھی وہ کہنے لگیں۔ ''اس کا انہماک دیکھ سن ہی نہیں رہی' اور مجھے ہنسی آ گئی۔ کیونکہ میں اکثر اپنی بیٹی سے بھی یہی کہتی ہوں کہ اتنا مگن ہو کر کھاتی ہے کہ اردگرد کا ہوش ہی نہیں رہتا۔

مگر اچھا کھانا ہو اچھی جگہ پر ہو اور اچھے لوگوں کے ساتھ ہو تو مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ رفعت سراج آئیں تو منزہ سے کہنے لگیں۔ '' منزہ مجھے ایک چیز بڑی اچھی لگتی ہے۔' ہم سب ہمہ تن گوش ہو گئے کہ اب اگلا جملہ ہوگا کہ 'تم ہم سب رائٹرز کا بڑا خیال رکھتی ہو' مگر ناں جی جملہ بالکل ہی مختلف تھا کہ 'تم نے اپنا بڑا اچھا خیال رکھا ہے' اور منزہ کے ساتھ ہم سب کے چہرے پر بڑے مزے کے ایکسپریشن آئے تھے۔ رائٹرز اور عام جملے قطعی نہیں۔

شگفتہ شفیق کہنے لگیں کہ آج تو سب پریاں لگ رہی ہیں۔ دوشیزہ میں ایک پری تو ہے ہی' اس پر منزہ جو کہ خوش قسمتی سے میری برابر والی چیئر پر براجمان تھیں بولیں۔ سنبل تم نے شگفتہ کو

پیسے کھلائے ہیں' میں نے کہا۔' شگفتہ آپ کو کہہ رہی ہیں۔' تو بڑے سکون واطمینان سے جواب آیا۔' میں نے تو کھلائے ہیں۔'

ماشاء اللہ منزہ واقعی پری لگتی ہیں۔ کشمیریوں' پٹھانوں کی طرح سرخ وسپید رنگت' شہد رنگ آنکھیں' دلکش نقوش اور گولڈ براؤن بال اینڈ بلیوی مجھے منزہ نے قطعی پیسے نہیں کھلائے ہیں منزہ ساری کو جگائیں۔

ہماری ایک پیاری سی رائٹر نے منزہ کے یہ بتانے پر کہ دوشیزہ کا اجراء 1973ء میں ہوا تھا توانہوں نے کہا کہ وہ بھی 73 کی پیدائش ہیں۔' اس پر منزہ نے کہا۔ واقعی رائٹرز بڑے معصوم ہوتے ہیں۔' اس پر انہوں نے کہا۔ میں نے تو اس لیے بتایا تھا کہ سب کہیں آپ تو لگتی نہیں ہیں۔' اس پر بڑا فرمائشی قہقہہ پڑا۔ پھر منزہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

'' یہاں کوئی بھی 80ء سے پہلے کا نہیں ہے۔'' اس پر رفعت سراج نے کہا۔'' اور میں تو 90ء کے آس پاس کی ہوں۔'' اس پر بھی زبردست قہقہہ پڑا۔

حضرات کی طرف اتنی خاموشی تھی لگتا تھا کلاس میں مس نے سزا دے کر بٹھایا ہوا ہے۔ اِدھر خواتین کی طرف بھی دو گروپ بن گئے تھے۔ ماریہ یاسر' نزہت جبیں' سیما رضا' الماس روحی اور رضوانہ پرنس کوئی سنجیدہ ڈسکشن کرنے لگے اور دوسرا گروپ ہمارا ساری شوخ، چنچل، چلبلی اور نٹ کھٹ حسینائیں ہمارے گروپ میں تھیں۔ جنہوں نے ضیاء الحق سے لے کر بلاول (آخر بلاول چورنگی پر بیٹھے تھے) تک اور رعنا فاروقی سے لے کر رضوانہ پرنس تک سب ڈسکس کیے۔

اور درمیان میں رائٹرز والے شوخ و چلبلے جملے اور چھت پھاڑ قہقہے اور ہر قہقہے پر رضوانہ اپنے سنجیدہ گروپ سے ہماری طرف مڑتیں۔ ہمیں بھی بتاؤ کیا ہوا' اور پورا واقعہ دوبارہ دہرایا جاتا۔ ماریہ یاسر نے یہ کہہ کر آپ تو شادی شدہ ہی نہیں لگتیں میری عمر مزید کم کردی۔ ماریہ خوش وآباد رہیں اپنے خرچے پر۔ آخر میں حسبِ معمول اور درمیان میں بھی فوٹو سیشن ہوتا رہا۔ منزہ کھانے سے زیادہ اس بارے میں فکر مند رہیں کہ سب کو ہر چیز دستیاب ہے یا نہیں۔ اور بالآخر جدائی کا لمحہ آ ہی گیا میں نے لگے ہاتھوں منزہ سے کہا۔''

منزہ بہت مزہ آیا دوبارہ کب بلا رہی ہو۔''

منزہ نے کہا۔ بہت جلد مگر اب ہائی ٹی پر۔''

منزہ یونہی خوش رہواور رکھو۔

الماس روحی منزہ کے لیے غالباً کیک یا مٹھائی لائی تھیں۔ شگفتہ پھول لائی تھیں الماس ہمارے لیے میگزینز لائی تھیں الماس بہت زبردست میگزینز تھے۔

سوری منزہ اور رضوانہ میں بہت زیادہ ایکسپریسو نہیں ہوں۔ اپنے جذبات اور احساسات کا جتنا اچھا اظہار اپنی تحریروں میں کرسکتی ہوں سامنے نہیں۔ سب کو سن کر مجھے لگتا ہے مجھے بھی یہی کہنا چاہیے مگر نہیں ہوتا یار۔

بہرحال دوشیزہ کی دوشیزہ کا شکریہ۔ (تمہیں جب دانیال نے امی کہا تو میرا دل چاہا کہوں آپی کہا کرو امی نہیں لگتیں تمہاری) وہ ہمیں مان و محبت دیتی ہیں۔ اللہ نے مجھے کوئی اور کامیابی بھی عطا کی۔ (سمجھا کرو) تب بھی دوشیزہ میری پہلی ہی ترجیح رہے گا۔ (آمین)

☆☆......☆☆

دپیکا پڈوکون

BEAUTY WITH THE BRAINS

مونی خان

دپیکا پڈوکون 5 جنوری 1986 کو کوپن ہیگن میں پیدا ہوئیں والد مشہور بیڈمنٹن پلیئر پرکاش پاڈو کون ہیں۔ دپیکا نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بیڈمنٹن کھیلنا شروع کیا اور بہت محنت کی......

بیڈمنٹن سے قبل وہ بیس بال کی بہت اچھی کھلاڑی تھیں۔ 10th کلاس کے امتحانوں سے فارغ ہوتے ہی DP کو فیشن انڈسٹری میں جانے کا خیال آیا یہ الگ بات ہے کہ اس فیلڈ میں آنے کے لیے

DP کے دوستوں کا اصرار تھا ظاہر ہے کہ وجہ اس کا خوب لمبا قد بنی۔ فیشن انڈسٹری میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے بعد Dp نے 2006 میں بالی وڈ میں قدم رکھا۔ پہلی فلم ایشوریا تھی جو کوئی کمال نہ دکھا سکی پھر 2007 میں شاہ رُخ نے اپنی فلم اوم شانتی اوم میں کاسٹ کیا جو میگا ہٹ ثابت ہوئی۔ DP نے فلم فیئر ایوارڈ بھی جیتا۔ اس خوبرو دوشیزہ نے جس فیلڈ میں قدم رکھا وہاں کامیابی کے جھنڈے گاڑھے چاہے اشتہارات ہوں، فیشن شوز، اسٹیج شوز یا فلمیں اس کا نام کامیابی کی ضمانت جانا جاتا ہے حال ہی میں ریلیز

> اس خوبرو دوشیزہ نے جس فیلڈ میں قدم رکھا
> وہاں کامیابی کے جھنڈے گاڑھے چاہے
> اشتہارات ہوں، فیشن شوز، اسٹیج شوز یا فلمیں
> اس کا نام کامیابی کی ضمانت جانا جاتا ہے

ہونے والی فلم باجی راؤ مستانی نے بھی بے حساب کامیاب حاصل کی۔ DP کے بارے میں دو باتیں جو بہت کم لوگ جانتے ہیں ایک یہ کہ وہ بے انتہا مذہبی ہے اور پابندی سے مندر جاتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ وہ بے انتہاء زبردست کالم نویس ہے اس کے کالمز مختلف اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں بچنا اے حسینوں کی شوٹنگ کے دوران DP کا افیئر رنبیر کپور سے شروع ہوا اور رنبیر کی محبت میں Dp نے اپنی گردن پر RK کا ٹیٹو بھی بنوایا بہرحال اب یہ کہانی ختم ہو چکی ہے اور آج کل DP کا شدید افیئر انڈین کرکٹ ٹیم کے مینیجر سدھارتھ مالایا کے ساتھ چل رہا ہے، دیکھیں عشق کی یہ کہانی کب اختتام پذیر ہوتی ہے Dp اس وقت انڈیا میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی ہیروئن ہے 5Ft 8inch لمبی یہ ہیروئن انڈیا کی خوبصورت ترین خواتین میں شمار ہوتی ہے وہ مختلف کمپنیز کی Brand Ambassador ہے، جن میں Tissot ، Nescafe، Sony Shot جیسے بڑے برانڈ شامل ہیں۔

☆☆......☆☆

لائف بوائے... محبت کا راز بتائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

ناجیہ کتنی ہی دیر سے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ کھلی کھلی رنگت اور بڑی بڑی کٹورا آنکھوں میں اُسے مستقبل کا کوئی عکس تیرتا نظر نہ آ رہا تھا۔ مفلسی سب سے بڑا امتحان ہے۔ حسن کو کھا جاتا ہے۔ اپنے لانبے سیاہ بالوں کو ہاتھ میں لیے وہ کتنی ہی دیر سے کھڑی تھی۔

''خیر تو ہے؟'' راجیہ نے اُسے اِس حالت میں دیکھ کر ہلایا۔

''آں...... ہاں سب، OK ہے۔''

''تو پھر یہ اتنی دیر سے آئینے کے روبرو کس کے دیدار ہو رہے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''سوری میں تو بھول ہی گئی تھی۔ میرے جاسوس مجھ پر اتنی گہری نظر رکھتے ہیں۔'' جواباً اُس نے بھی راجیہ کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اُف! جاسوس! کیا بات ہے آپ کی آپی۔''

''تم کیوں اتنی دیر سے مجھے گھور رہی تھیں۔'' ناجیہ نے کنگھا اُٹھا کر چوٹی کھولتے ہوئے کہا تو اُس کی ناگن زلفیں اُس کی پشت کو ڈھانپ گئیں۔

''مابدولت آپ کے دربار میں یہ لائف بوائے شیمپو کا حقیر نذرانہ لے کر پیش ہوئی تھی۔ وہی لائف بوائے شیمپو حضور! جو کہ ہمارے حسین بالوں کی چمک بڑھائے، دو مونہے بالوں سے نجات دلائے اور بالوں میں مضبوطی لائے اور......''

''اور کاش ایسا ہو جائے کہ اِس میں سے سونے کے سکے بھی نکلنے لگ جائیں۔ میں تو کب سے ایسی اسکیم کا انتظار کر رہی ہوں۔ تم کیا بھول گئی تھیں۔''

''ہاں یاد آ گیا، تم تو ہو ہی ناشکری لڑکی! جو تھوڑے پیسوں میں لائف بوائے بالوں کے لیے کرتا ہے۔ وہ سونے کے سکوں سے بڑھ کر قیمتی ہے لڑکی!''

☆......☆......☆

''ناجیہ! ارے او ناجیہ بیٹا' کہاں ہو تم؟ ذرا بڑے کمرے میں جا کر بیڈ کی چادر تو بدل دینا وہ جو میں کچھ روز پہلے نئی لائی تھی' شاید وہ میں نے بکس میں رکھ دی ہے' نکال کر بچھا دو۔'' فریدہ بیگم نے ناجیہ کو ہدایات دیتے ہوئے کہا تھا۔

''جی اچھا امی جان! ارے' آپ کہیں جا رہی ہیں؟'' اس نے انہیں برقع اوڑھتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

''ہاں' میں ذرا پچھلی گلی میں حاجرہ کے گھر تک جا رہی ہوں۔ اس سے شام کے لیے کچھ برتن وغیرہ لے آؤں' اس کے پاس بڑا خوب صورت ڈنر سیٹ ہے۔''

''رہنے دیں امی! ہمارے گھر میں برتن موجود ہیں' کیا ضرورت ہے پھر کسی سے لینے کی؟''

''ارے بیٹا! وہ برتن تمہارے پھوپھی اور پھوپھا کے معیار کے مطابق نہیں۔ تمہیں تو پتا ہی ہے اپنی پھوپھو جان کا مزاج' کیسے ہر چیز میں نقص نکالتی ہیں اور ہر بات پر اعتراض کرنا تو ان کی فطرت میں شامل ہے۔ جب پچھلی دفعہ آئی تھیں تو کیسے باتوں باتوں میں جتا گئی تھیں ہماری حیثیت۔''

''امی! ان کی تو عادت ہے ہر چیز میں مین میخ نکالنے کی' وہ ہمارے معیارِ زندگی سے واقف ہیں۔ انہیں تو خود ہی خیال کرنا چاہیے۔ آپ کو حاجرہ آنٹی سے برتن لانے کی کوئی ضرورت نہیں' دوسروں سے مانگنا اور اپنی خودداری کھونا اچھا نہیں ہوتا۔''

''لیکن بیٹا! تم سمجھ نہیں رہیں' زمانے میں رہنے کے لیے زمانے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔''

ناجیہ کو اگرچہ اپنی ماں کی بات سے اتفاق نہیں تھا مگر احتراماً خاموش رہی تھی۔ وہ ان کے جانے کے بعد بیڈ شیٹ تبدیل کرنے لگی۔ امی نے نہ جانے کیوں نئی بیڈ شیٹ بچھانے کو کہا تھا حالانکہ پھوپھو کے بچے انتہائی بدتمیز قسم کے تھے۔ پچھلی بار کی چادر پر گرائی چائے کے نشانات جا بجا ابھی تک قائم تھے۔ وہ لوگ جب بھی آتے ہیں' گھر کی حالت ابتر ہو جاتی مگر امی جان ان کی ہر بار کی آمد پر خوش ہوتی ہیں حالانکہ پھوپھو جان کو کون سا ہم لوگوں سے ملنا ہوتا ہے۔ وہ تو ان کے سسرالی اس شہر میں ہیں' اُدھر آنا ہوتا ہے تو اِدھر بھی آ جاتی ہیں ورنہ تو پھوپھو کو کبھی ہمارا خیال بھی نہ آئے۔ ناجیہ نے دکھ سے سوچا تھا۔

''کوئی ایک سوٹ بھی تو اچھا نہیں ہے۔ اب کل کیا پہنوں؟'' راجیہ الماری سے تمام جوڑے نکال کر بیڈ پر ڈھیر کرنے کے بعد بڑبڑاتے ہوئے سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

ناجیہ چائے لے کر آئی تو اسے سر پکڑے دیکھ کر فکرمندی سے استفسار کرنے لگی۔

''اب کیا ہوا؟''

''وہی پرانا مسئلہ' کل کالج میں اتنا بڑا فنکشن ہے اور میرے پاس ایک بھی ڈھنگ کا جوڑا نہیں ہے جو میں پہن کر فنکشن میں جا سکوں۔ سوچ رہی ہوں' اپنی دوست غزالہ سے اس کا شاکنگ پنک کلر والا سوٹ مانگ لوں۔ بہت ہی خوب صورت سوٹ ہے۔ میں زیبِ تن کروں گی تو کالج کی لڑکیاں دیکھتی کی دیکھتی رہ جائیں گی۔''

''یہ مانگنے وانگنے کا خیال دل سے نکال دو۔ جھوٹی شان و شوکت انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔'' ناجیہ کا انداز ناصحانہ تھا۔

''اچھا بابا' خدا کے واسطے' لیکچر مت دو' چائے کا کپ دو' پہلے ہی سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' راجیہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

''راجیہ! تم میرا پرپل والا نیٹ کا سوٹ پہن لو۔'' ناجیہ نے اسے راہ دکھائی تھی۔

''نہیں بھئی' مجھے وہ سوٹ نہیں پہننا۔'' راجیہ نے چڑ کر کہا تھا۔

''کیوں؟ اس سوٹ میں آخر ایسی کیا برائی ہے؟''

''برائی تو کوئی نہیں ہے مگر پرپل کلر تم جیسے گورے حسین لوگوں پر ہی بجتا ہے' میری سانولی رنگت پر کیا خاک اچھا لگے گا؟''

''تم تو پاگل ہو' پہن کے تو دیکھو' تم پر بھی پرپل کلر بہت اچھا لگے گا۔ اور ہاں! یہ اسٹیٹس کا کمپلیکس تمہیں کیوں ہو گیا بھئی۔ تمہارے اِن لائف بوائے شیمپو سے لہراتے سیاہ بالوں کے آگے بھلا کسی اور جادو کی کیا ضرورت ہے؟'' ناجیہ نے سمجھایا تو راجیہ نیم رضامند ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

بوا اصغری شٹل کاک برقع سر پر رکھتے ہوئے چلی گئیں تو فریدہ بیگم آنگن سے کمرے میں آ گئیں جہاں ان کے شوہرِ نامدار عظیم صاحب بے چینی سے ان ہی کے منتظر تھے۔

''کیا ہوا؟ کیا جواب دیا ان لوگوں نے؟'' انہوں نے سوالیہ انداز میں فریدہ بیگم سے پوچھا تھا۔

پچھلے دنوں بوا کے ساتھ کچھ خواتین ناجیہ کو دیکھنے آئی تھیں اور انہوں نے اسی کے متعلق جاننا چاہا تھا۔

''وہی جواب ملا جو اس سے پہلے لوگ دیتے آئے ہیں۔'' فریدہ بیگم اداس سی سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''ارے' کچھ بتاؤ تو سہی......'' عظیم صاحب نے اصرار کیا تھا۔

''انہیں بھی ہماری غربت اور حیثیت پر اعتراض ہے۔ بوا بتا رہی تھیں کہ وہ لوگ اچھی فیملی میں رشتہ کرنے کا کہہ رہے ہیں۔''

''اچھی فیملی سے ان کا کیا مطلب؟'' انہوں نے ناگواری سے پوچھا تھا۔ ''بس یہاں تو ہر شخص دولت کی ہوس میں اندھا ہو رہا ہے۔ شرافت اور سچائی کی تو کوئی قدر ہی نہیں

رہی۔'' ان کا لہجہ بہت زیادہ تلخ ہوگیا تھا۔ اسی وقت ناجیہ، راجیہ اور انس بھی کمرے میں داخل ہوئے تھے اور ماں باپ کو بتایا تھا کہ رمضان کا چاند نظر آ گیا ہے۔

''عظیم صاحب' آپ بھی تو سچ کی تفسیر بن جاتے ہیں' نہ صرف اپنی انکم بتادی بلکہ صاف لفظوں میں یہ بھی بتادیا کہ ہماری کوئی زمین' جائداد وغیرہ نہیں حالانکہ لوگ ان معاملات میں جھوٹ سے کام لیتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر اپنی بڑائی پیش کرتے ہیں' کرائے کے مکان کو اپنا ذاتی مکان بتاتے ہیں۔''

''ابو! ویسے امی کچھ غلط نہیں کہہ رہی ہیں۔ آپ نے تو تایا ابو کا بھی ذکر نہیں کیا کہ میرا بھائی امریکا میں مقیم ہے۔ لوگ تو یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا فلاں رشتے دار باہر ہے' ہم لڑکے کو باہر بھجوادیں گے وغیرہ وغیرہ۔'' انس بھی ماں کا ہم نوا بنا ہوا تھا۔

''ارے بیٹا! جب ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں تو میں کیسے اتنا بڑا جھوٹ بول دوں؟ پھر تمہارے تایا ابو نے کب ہم سے کوئی تعلق رکھا ہے؟'' وہ دکھ بھرے لہجے میں بولے تھے۔

''مگر ابو......!''

''ابو نے بالکل ٹھیک کیا انس! رشتے وہی مضبوط و پائیدار ہوتے ہیں جن کی بنیاد خلوص اور سچائی پر رکھی جاتی ہے۔'' ناجیہ نے بھائی کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور کچھ بولتا' دروازے پر بیل ہوئی تھی۔

''میں دیکھتا ہوں جا کر۔'' انس نے اٹھنا چاہا تھا۔

''نہیں بیٹا! بیٹھو! مجھ سے ملنے کسی کو آنا تھا۔'' عظیم صاحب اٹھ کر باہر کی طرف چل دیے۔

''دیکھنے میں کیسے معصوم اور شریف لوگ لگتے تھے' مجھے امید نہ تھی کہ وہ ایسا جواب دیں گے۔'' فریدہ بیگم ابھی تک ناجیہ کے رشتے کو لے کر افسردہ تھیں۔

''ہاں امی! معصوم تو وہ بہت تھے' پہلے تو نہایت خاموشی سے چائے پانی' دیگر لوازمات کو ٹھونسا پھر کھانے کا کہا گیا تو بھی انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر لڑکی پسند نہیں تھی تو خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے' اتنی خاطریں کروانے کی کیا ضرورت تھی؟ خدا ایسے معصوموں اور شریف لوگوں سے بچائے۔'' راجیہ نے استہزائیہ انداز میں کہا تھا۔

''ناجیہ.....! اب تم بھی کان کھول کر سن لو' اب سچائی اور خلوص کا طلب گار کوئی نہیں رہا' سب دولت اور امارت کے متلاشی ہیں لہٰذا تم بھی خوابوں کی دنیا میں رہنے کی بجائے دنیا کے چلن کو سمجھو۔ سچائی خلوص کا پرچار کرنے کی بجائے بناوٹ و جھوٹ کو اپناؤ کہ یہی دنیا کا دستور ہے۔'' راجیہ خاصی تلخ ہو رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ ناجیہ کوئی جواب دیتی' عظیم صاحب پریشان سے چلے آئے تھے۔

''فریدہ بیگم' تمہاری بڑی بہن مجیدہ آپا کا ڈرائیور ہم دونوں کو لینے آیا ہے۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے' ہاسپٹل میں ہیں وہ۔ ہمیں جلدی چلنا چاہیے۔ ویسے بھی اس شہر میں ان کا ہمارے علاوہ ہے بھی کون؟ بیٹے تو دونوں باہر سیٹل ہو چکے ہیں۔''

''ایسے موقعوں پر صرف غریب رشتے دار ہی یاد آتے ہیں۔'' انس نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ زمانے کے چلن اور رشتے داروں کے غلط رویوں نے انہیں ہر ایک سے بدظن کر دیا تھا۔

''نہ بیٹا! ایسا نہ کہو وہ تمہاری خالہ ہیں جنہوں نے ہمیشہ ہر اچھے برے وقت میں تعلق رکھا' کبھی اپنی دولت وحیثیت پر غرور نہیں کیا' بس ان کے لیے دُعا کرو۔'' عظیم صاحب نے نرمی سے سمجھایا تھا۔

''سوری ابو!'' انس نے فوراً معذرت کرلی تھی۔

''اچھا' اب ہم چلتے ہیں' تم لوگ پریشان نہ ہونا' جانے وہاں کتنی دیر ہوجائے' فریدہ! آؤ' تم پریشان مت ہو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔''

ان کے جانے کے بعد ناجیہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ کل پہلا روزہ تھا اور سحری کی تیاری بھی کرنا تھی مگر اس وقت اس کی طبیعت پر بہت اداسی سی طاری تھی۔

''مجھے کیا ہوا ہے' میں اتنی اداس کیوں ہوں؟ پہلی مرتبہ تو ایسا نہیں ہوا' لوگ تو ہمیشہ مجھ سے نہیں' میری حیثیت سے ہی تعلق جوڑتے آئے ہیں۔ گاڑی' بنگلہ' بینک بیلنس' یہ سب چیزیں بے جان ہو کر بھی کتنی اہم اور معتبر ہیں سب کے لیے' وقت کس ڈگر پہ گامزن ہے' کیا کم حیثیت ہونا جرم ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا تھا پھر اس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں صاف کیں۔ ایسا تو کئی مرتبہ ہو چکا تھا۔ لوگ اس کی معصوم صورت' اعلیٰ اخلاق سے متاثر ہو کر اس کے

طلب گار بن کر آتے لیکن یہ جان کر کہ تنگ و تاریک گلی میں واقع دو کمروں کے چھوٹے سے مکان میں رہنے والی ناجیہ پوسٹ آفس میں ملازم معمولی سے شخص کی بیٹی ہے' ان کی پسندیدگی' ناپسندیدگی میں ڈھل جاتی۔ لوگ اسے ریجیکٹ کر کے چلے جاتے' تب حساس' خوددار ناجیہ اپنی اس بے توقیری پر بہت دنوں اداس و نڈھال رہتی۔

☆......☆......☆

امی ابو کی رات ہاسپٹل میں گزری تھی۔ ان کی آمد صبح سحری سے تھوڑی دیر قبل ہی ہوئی تھی۔

''ناجیہ' تم سحری کرلو اور جلدی سے اپنے جانے کی تیاری کرو۔'' فریدہ بیگم نے اس سے کہا۔

''کہاں جانے کی؟'' سحری کے لیے پراٹھے بناتے ہوئے ناجیہ نے بڑی حیرانی سے پوچھا تھا۔

''مجیدہ خالہ کے ہاں جانے کی۔ ان کی طبیعت سنبھل گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے انہیں گھر بھیج دیا ہے لیکن گھر میں کوئی نہیں ہے جو ان کی دیکھ بھال کر سکے۔ ملازموں پر تو انہیں چھوڑا نہیں جا سکتا۔ ان کا بیٹا آنے کا پروگرام بنا تو رہا ہے مگر شاید ابھی کنفرم نہیں ہے۔ بیٹے انہیں اپنے پاس بلا رہے ہیں مگر وہ باہر جانا نہیں چاہتیں اور نہ ہی مستقل ان کے پاس رہنا چاہتی ہیں کیونکہ ان کا دل وہاں نہیں لگتا۔ اب یہاں تنہا ہیں۔ تمہارے ابو نے تو ان سے کہہ بھی دیا کہ ناجیہ کو بھیج دوں گا۔ بیٹا' تم اپنی خالہ جانی کا بہت خیال رکھنا۔ اب جلدی سے تیاری کرلو' تمہارے ابو آفس جانے سے پہلے تمہیں وہاں چھوڑ دیں گے۔'' فریدہ بیگم نے تفصیل سے ہر بات بتائی تھی۔

''مگر امی! اب تو رمضان بھی شروع ہو چکے ہیں اور سحری و افطار میں کتنا کام ہوتا ہے' آپ اکیلی یہ سب کیسے کریں گی؟'' ناجیہ نے ماں کا خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے بیٹا' شادی کے بعد جب تم نہیں ہوگی' تب بھی مجھے ہی سب کچھ کرنا ہوگا' تم میری فکر مت کرو۔ راجیہ ہے میرے پاس' ہم دونوں مل کر کرلیں گے اور تم کون سا مہینے بھر کے لیے جا رہی ہو۔ جیسے ہی ان کی طبیعت میں بہتری نظر آئے گی' میں تمہیں بلوا لوں گی۔'' فریدہ بیگم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ''جاؤ اب جلدی سے جا کر تیاری کرلو۔''

''امی جان! آپ کیوں گھبرا رہی ہیں؟ تیاری میں کون سا وقت لگے گا؟ ناجیہ کے پاس کون سے ڈھیروں جوڑے ہیں جو اسے سلیکٹ کرنے میں دیر لگے گی۔'' راجیہ نے ان کی بات سن کر ہنستے ہوئے ٹکڑا لگایا تھا۔ جواباً ناجیہ اسے ناراضگی سے گھور کر رہ گئی تھی۔ ناجیہ لائف بوائے شیمپو اٹھا کر بال دھونے چل دی تھی۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ خود کو ادھورا محسوس کرتی تھی۔

☆......☆......☆

''خالہ جانی! یہ دودھ پی لیں۔'' ناجیہ نے بہت محبت سے دودھ کا گلاس آگے بڑھایا تھا۔

''جیتی رہو بیٹی! تم میرا کس قدر خیال رکھتی ہو' اللہ تمہیں خوش رکھے۔ عظیم بھائی نے میری تنہائی کا احساس کیا اور تمہیں میرے پاس چھوڑ دیا۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ دیکھو بیٹا! اسے اپنا ہی گھر سمجھنا اور کوئی تکلف نہ کرنا' افطار اور سحری میں جو تمہارا دل چاہے' بنوا لینا۔ اب میں تو تمہارا ساتھ دے نہیں سکتی۔''

''نہیں خالہ جانی! تکلیف کیسی' مجھے تو آپ کے ساتھ رہنا' آپ کا خیال رکھنا بہت اچھا لگ رہا ہے کیوں کہ ہمارے اکثر رشتے دار تو ویسے ہی ہمارے ہاں بہت کم آتے ہیں اور ہمیں بھی اپنے ہاں بلانے یا اپنی خوشیوں میں شامل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ خالہ' میں اکثر سوچتی ہوں' یہ دولت بھی کیسی شے ہے' اس کا نشہ انسانی رگوں میں شامل ہو کر خون کے رشتے تک بھلا دیتا ہے۔''

''ہاں بیٹا! یہ تو لوگوں کی اپنی سوچ ہے۔ بے جان چیزیں راحت ضرور دیتی ہیں مگر آسودگی اور محبت نہیں۔ اصل خوشی تو اکٹھے مل بیٹھنے اور آپس میں دکھ سکھ بانٹنے میں ہے۔'' مجیدہ خالہ نے ناجیہ کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

''بیگم صاحبہ! عفت صاحبہ کا ڈرائیور یہ کچھ کپڑے لایا ہے۔'' ملازم کرموشاپر اٹھائے چلا آیا تھا۔

''ہاں' میں نے ہی منگوائے ہیں۔'' کرمو شاپرز ان کے پاس رکھ کر چلا گیا۔

''ناجیہ! ان شاپرز میں موجود تمام سوٹ تمہارے ہیں۔''

''مگر خالہ جانی! مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے میرے پاس کپڑے موجود ہیں۔'' ناجیہ نے انکار کرنا چاہا تھا۔

''بیٹا! میں نے بڑی محبت و شوق سے تمہارے لیے یہ کپڑے اپنی دوست عفت سے منگوائے ہیں۔ اس کی اپنی

بوتیک ہے، تم انہیں پہنو گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔'' خالہ نے نہایت محبت سے اصرار کیا تو ناجیہ ان کا دل نہ توڑ سکی تھی۔

☆......☆......☆

ناجیہ کی مسلسل دیکھ بھال نے خالہ کو بڑی جلدی صحت یابی کی طرف گامزن کر دیا تھا۔ وہ دراصل تنہائی کی مریضہ تھیں۔ خالی گھر انہیں کاٹنے کو دوڑتا تھا مگر جب سے ناجیہ آئی تھی، ان کی تنہائی ختم ہوگئی تھی۔ آج ان کے بیٹے کا ایک دوست ڈاکٹر فائنل چیک اپ کے لیے آیا ہوا تھا۔

''ارے واہ بھئی آنٹی! آپ تو بالکل ٹھیک ہیں لہٰذا یہ بیڈ چھوڑیں، گھومیں پھریں اور خوش رہیں۔'' ڈاکٹر عاصم نے انہیں چیک کرنے کے بعد بڑی بشاشت سے کہا تھا۔ ''ویسے آنٹی! ماشاء اللہ آپ نے بہت جلدی امپروو کرلیا؟''

''بس بیٹا! اس میں خدا کا فضل اور میری بچی ناجیہ کی کوشش شامل ہے، جس نے دن رات ایک کر کے میری خدمت کی۔'' خالہ نے چائے لاتی ناجیہ کو پیار سے دیکھ کر کہا تھا۔

''آنٹی! بائی داوے، آپ کو یہ اتنی پکی پلائی خدمت گزار بیٹی اچانک کہاں سے مل گئی؟ آپ کے تو صرف دو ہی بیٹے ہیں، وہ بھی نافرمان و ناخلف۔'' قریب ہی بیٹھے شرجیل نے ہنس کر لقمہ دیا تھا۔

''خبردار، جو میرے بیٹوں کو کچھ کہا۔ نعمان، عفان کا فون آیا تو بتا دوں گی کہ تمہارے دوست تمہیں کن خطابوں سے نواز رہے ہیں۔'' خالہ نے انہیں ڈرایا تھا۔

''آؤ ناجیہ بیٹی! ڈاکٹر عاصم سے تو تم واقف ہو، ان کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ ساتھ میں یہ شوخ و شرارتی سا شرجیل ہے۔ یہ نعمان، عفان کا بہت اچھا دوست ہے۔ یہ بھی مجھے اپنے بچوں کی طرح ہی عزیز ہے۔''

ناجیہ، عاصم سے متعارف تھی لیکن شرجیل سے آج اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے خوش خلقی سے اسے سلام کیا تھا۔

''ناجیہ صاحبہ! ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں کہ آپ نے اپنی خدمت گزاری سے ہماری آنٹی کو جلد صحت یاب کر دیا۔ اب انہیں اس کمرے سے نکالیں، کھلی فضا میں گھمائیں بلکہ شام میں روز سیر پر لے جایا کریں۔''

''عاصم بیٹے! کس سے کہہ رہے ہو، یہ تو خود گھومنے پھرنے کے معاملے میں مجھ پر گئی ہے، بہت کم باہر نکلتی ہے۔'' خالہ نے کہا تھا۔

''اچھا، پھر تو کچھ سوچنا پڑے گا۔''

''ڈونٹ وری، یہ ڈیوٹی میں سنبھال لیتا ہوں۔ کیوں آنٹی؟'' شرجیل نے اپنی خدمات پیش کر کے تائید چاہی تھی۔

''تمہیں مشکل تو نہیں ہوگی؟''

''ارے نہیں، مجھے حقیقتاً خوشی ہوگی بلکہ مجھے تو اب یہاں سے جانا مشکل لگ رہا ہے۔'' شرجیل نے سامنے بیٹھی ناجیہ کو دیکھ کر ذومعنی لہجے میں کہا تھا۔ اور اب وہ کمرے سے جاتی ناجیہ کے گھنے سیاہ بالوں میں خود کو کھوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن ٹھیک شام پانچ بجے شرجیل وہاں موجود تھا۔

''شرجیل بیٹے! تم تو وعدے اور وقت کے بہت پابند نکلے ورنہ میرا تو خیال تھا کہ تم بھول جاؤ گے۔'' خالہ نے حیرت واستعجاب سے کہا تھا۔

''آنٹی! یہ کوئی بھولنے والی بات ہے؟ آپ کو پتہ ہے کہ یہاں آنا میرے لیے کس قدر خوشی کا باعث ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ پچھلے دنوں آپ بیمار رہیں اور میں شہر سے باہر رہا۔ وہ تو عاصم نے مجھے کال کر کے بتایا تو میں بھاگا چلا آیا۔''

''جیتے رہو بیٹا!'' خالہ اس کی محبت پر مسکرا دیں۔ ناجیہ کو اس کی نظریں ڈسٹرب کر رہی تھیں لہٰذا اس نے وہاں سے اٹھنے کا بہانہ ڈھونڈا مگر شرجیل سے پیچھا چھڑانا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کا اندازہ اسے چند دن میں ہی ہوگیا تھا۔ وہ نہ صرف روزانہ باقاعدگی سے آتا بلکہ ہر پروگرام، ہر بات میں بہانے بہانے سے ناجیہ کو ضرور شامل کرتا۔ اس کے معنی خیز جملے، شریر نگاہیں اسے پریشان کر دیتیں۔ آج تو اس نے فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ چاہے جو بھی ہو، وہ شرجیل کے سامنے ہرگز نہیں جائے گی۔ وہ اس کی آمد کا سن کر باہر لان میں چلی آئی تھی مگر کچھ ہی دیر بعد وہ اسے ڈھونڈتا ہوا وہیں چلا آیا تھا۔

''مان لیں کہ آپ بہت ظالم ہیں۔'' اس نے خفگی سے کہا تھا۔

''کیوں، میں نے کیا کیا ہے؟'' ناجیہ نے تجاہل برتا تھا۔

''یہ بھی مجھے بتانا پڑے گا، ہر روز شام ہونے کا انتظار کرتا ہوں تاکہ محترمہ کا دیدار نصیب ہو اور آپ کو میری کچھ پرواہ ہی نہیں ہے۔'' شرجیل نے جیسے گلہ کیا تھا۔

''کیوں کرتے ہیں ایسا، مت کیجیے۔'' ناجیہ نے

آہستگی سے کہا تھا۔
''ناجیہ! کیا آپ واقعی میرے احساسات و جذبات سے بے خبر ہیں؟ یہ سچ ہے کہ میں نے ابھی تک اپنے جذبات کو لفظوں کا پیراہن نہیں دیا مگر کیا میری نگاہیں آپ کو کچھ نہیں سمجھا سکیں اگر آپ میری زبان سے ہی سننا چاہتی ہیں تو یوں ہی سہی، مجھے آپ پہلی نظر میں ہی بے حد اچھی لگیں۔'' شرجیل نے قریب آکر سرگوشی کی تھی تو ناجیہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کی خاموشی گواہ تھی کہ صرف شرجیل ہی اسیر محبت نہیں ہے، وہ بھی گھائل ہے۔ زیست میں محبت کے رنگ جھلملائے تو ناجیہ کے لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے تھے۔

☆......☆......☆

شرجیل! آپ نے یہ کیا کہہ دیا کہ دن میرے انتظار میں بے چینی سے گزرتا ہے تو رات کو میری یاد سونے نہیں دیتی۔ ناجیہ نے اپنے خوب صورت لمبے سیاہ بالوں میں برش کرتے ہوئے مسکرا کر سوچا تھا پھر چوڑی باکس میں سے اپنے سوٹ کے ساتھ میچ کرتی بلیو کلر کی چوڑیاں نکال کر پہننے لگی تھی۔
''بی بی جی! آج افطار میں کیا بناؤں؟'' ملازمہ اختری نے پوچھا تھا۔
''تم اس کی فکر نہ کرو، میں نے رول بنا کر فریج میں رکھ دیے ہیں۔ کباب بھی پڑے ہیں وہ فرائی کر لیتی ہوں۔ تم فروٹ چاٹ اور تھوڑے سے پکوڑے بنالو۔'' ناجیہ دراز بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور اختری کے ساتھ کچن میں چلی آئی۔
''یہاں کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' ناجیہ اختری اور کرمو باتیں کرتے ہوئے افطار کا اہتمام کر رہے تھے کہ شرجیل بھی وہیں آ گیا تھا۔
''صاحب جی، آپ کی بڑی عمر ہے۔ ابھی آپ کا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ اختری کہہ رہی تھی کہ آپ کی گارمنٹس فیکٹری ہے اس لیے آپ روز نیا سوٹ پہنتے ہیں۔ اب آپ ہی بتا دیں کہ آپ کیا کرتے ہیں؟'' کرمو نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔
''ارے یار! ایسی راز کی باتیں سر محفل نہیں پوچھتے، تم بتاؤ کیا بنا رہے ہو بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے اسی لیے ادھر ہی چلا آیا۔'' شرجیل نے ایک دم بات کا رخ بدل دیا تھا۔
''ناجیہ بی بی بڑے مزیدار رول اور کباب بنا رہی ہیں۔''
''یہ تو ہم چیک کر کے ہی بتا سکیں گے کہ کتنے مزیدار ہوں گے۔'' وہ اس کے قریب چلا آیا تھا۔
''اچھی لگ رہی ہو۔'' اس نے آہستگی سے ناجیہ سے کہا تھا اور جلدی سے کچن سے باہر نکل کر آنٹی مجیدہ کے پاس چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

''عظیم بھائی! ناجیہ اب میری بیٹی ہے، آپ کو اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''
''وہ تو ٹھیک ہے آپا! مگر لڑکے والے میری جان پہچان کے ہیں۔ حیثیت بھی ہمارے جیسی ہے۔ وہ ناجیہ کو صرف ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اصل میں عید کے فوراً بعد وہ رسم بھی کرنا چاہتے ہیں اسی لیے میں ناجیہ کو لینے آیا ہوں، ایک دو روز میں پھر چھوڑ جاؤں گا۔ میرے خیال میں تو انکار مناسب نہیں، لڑکا کسی پرائیویٹ فرم میں ملازم ہے۔'' عظیم صاحب نے انہیں سمجھانا چاہا تھا۔
''عظیم بھائی! میں آپ کو کسی ایسے ویسے سے اپنی بچی کی شادی نہیں کرنے دوں گی۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں، میں اس کا بیاہ خود دیکھ بھال کر اچھی جگہ کروں گی۔''
''اچھا آپا! جیسی آپ کی مرضی، اب مجھے اجازت دیں۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ جاتے ہوئے ناجیہ انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔
''اچھا بیٹا! اپنا خیال رکھنا۔'' عظیم صاحب اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے تھے۔ ناجیہ اندر جانے کی بجائے وہیں لان میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔
''اتنی بے چینی بھی اچھی نہیں۔ ذرا سا لیٹ کیا ہوئے محترمہ انتظار میں گیٹ کے سامنے ہی دھرنا دے کر بیٹھ گئیں۔'' شرجیل کی آواز پر اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دی تھیں اور بے ساختہ مسکرا دی تھی۔
''آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں آپ ہی کا انتظار کر رہی ہوں؟'' ناجیہ نے بشاش لہجے میں کہا تھا۔
''ارے، ہمیں بتانے کی ضرورت ہی نہیں، ویسے یہ بندہ خاصا عقل مند ہے اس لیے سب کچھ جان جاتا ہے، ویسے آج مجھے آنے میں دیر آپ ہی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ سارے جہاں کی دکانیں چھان ماریں مگر افسوس کہ ایسا

خوب صورت تحفہ نہ مل سکا جو آپ کی شان کے مطابق ہو۔''
وہ اس کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔
''یہ آپ کن فضولیات میں پڑ گئے ہیں؟'' ناجیہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ حالانکہ آج اُس کا پورا پروگرام تھا کہ وہ شرجیل کو اُس کے ہر بار کیے گئے سوال کہ آپ کے لمبے، حسین بالوں کا راز کیا ہے؟ کا جواب ضرور دے گی اور اُسے بتا دے گی کہ اُس کے حسین، سیاہ، چمکدار، مضبوط بالوں کا راز کوئی اور نہیں بلکہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا ''لائف بوائے شیمپو'' ہے۔ مگر شرجیل تو کچھ اور ہی سوچ کر آیا تھا۔ سو وہ اپنا یہ راز بتاتے بتاتے رہ گئی۔
''آنٹی بتا رہی تھیں کہ تمہاری برتھ ڈے آنے والی ہے' سو ایک امیر کبیر خاتون مجیدہ شاہ کی بھانجی جو یقیناً کسی لکھ پتی باپ کی بیٹی ہے' کے مزاج اور پسند کے مطابق تحفہ خریدنا کوئی آسان کام تو نہیں تھا۔''
''کیا مطلب؟'' ناجیہ نے چونک کر شرجیل کی طرف دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے جواب دیتا' اس کا موبائل بج اٹھا تھا۔ شاید کوئی ایمرجنسی کال تھی۔ وہ عجلت میں چلا گیا تھا اور ناجیہ حیران و پریشان تھی۔
''یہ کیا ہو گیا؟ اس کا مطلب کہ محترم شرجیل احمد میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں چونکہ آنٹی مجیدہ کی بھانجی ہوں' لہٰذا میں بھی کسی امیر کبیر فیملی سے تعلق رکھتی ہوں مگر میں تو...... میں انہیں اپنی اصلیت بتا دوں گی...... اور اگر انہوں نے بھی میری اصلیت جان کر باقی لوگوں کی طرح بی ہیو کیا' مجھے ریجیکٹ کر دیا یا مجھے چھوڑ دیا تو؟ پھر کیا ہوگا؟ جن راہوں پر میں قدم رکھ چکی ہوں' وہاں سے پلٹنا میرے لیے مشکل ہی نہیں' ناممکن ہوگا۔'' شرجیل کے جانے کے بعد ناجیہ ان ہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔
''لیکن میں اتنا کیوں پریشان ہو رہی ہوں؟ خالہ جانی کہہ تو رہی تھیں کہ میں اب ان کی ذمے داری ہوں۔ جب سب کچھ انہیں ہی کرنا ہے تو شرجیل کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ نہیں...... نہیں' میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گی کیوں کہ میں انہیں کھونا نہیں چاہتی۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' اپنے کمرے میں آ کر وہ فیصلہ کر کے بیڈ پر دراز ہو گئی اور آنکھیں موند لیں مگر آج تو نیند بھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے عجیب سی بے چینی' بے سکونی نے آ گھیرا تھا۔

''سچائی کے اصولوں پر چلنے والی اور خلوص کا پرچار کرنے والی ناجیہ کیا اپنی زندگی کے اس اہم ترین خوب صورت رشتے کی بنیاد جھوٹ و فریب پر رکھ کر خوشی سے جی پائے گی؟'' دل نے جیسے صدا دی تھی۔
''تم نے تو زندگی بھر کبھی کسی سے مانگے کا سوٹ تک پہننا گوارا نہیں کیا' اب کیا اپنی خوشیاں غیروں کے نام و رتبے سے خریدو گی؟ کہاں گئے تمہارے وہ سارے اصول' تمہاری سچائی اور خودداری' کیا وہ تمام باتیں اور دعوے ایسے ہی تھے؟'' اس کا ضمیر بار بار اسے ملامت کر رہا تھا۔
پوری رات ناجیہ نے ایک عجیب سی کشمکش میں گزاری تھی اور پھر آخر کار اس کے دل نے ایک فیصلہ کر ہی لیا تھا۔
سحری کے بعد فجر کی نماز پڑھی' اپنی خوشیوں بھری راہ گزر کے لیے دعا مانگ کر اس نے مجیدہ خالہ کے دیے ہوئے تمام ڈریسز واپس الماری میں رکھ دیے اور اپنا ایک سادہ سا سوٹ نکال کر پہن لیا تھا۔ شام کو جب شرجیل آیا تو وہ ان ہی کپڑوں میں ملبوس تھی۔
''یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔ کچھ پریشان لگ رہی ہو؟''
''میں آج آپ کو اپنے متعلق سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہتی ہوں اور اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتی ہوں جو آپ کو میرے بارے میں ہو گئی ہے۔ میرے والد ایک پوسٹ آفس میں ملازم ہیں۔ میرا دو کمروں کا چھوٹا سا گھر ایک تنگ و تاریک گلی میں واقع ہے جہاں سے آپ کی بڑی بڑی گاڑیاں نہیں گزر سکتیں۔ مجھے پتا ہے کہ میری اصلیت جاننے کے بعد آپ جیسا دولت مند' امیر شخص مجھ سے کوئی تعلق یا رشتہ جوڑنا اپنی توہین خیال کرے گا' میرا یہ سچ آپ کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور کر دے گا مگر میں اپنے زندگی کے کسی بھی معاملے یا رشتہ کی بنیاد جھوٹ و فریب پر نہیں رکھ سکتی۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔ باقی فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔'' ناجیہ نے تمام باتیں بڑی آہستگی سے کہیں اور شرجیل کا جواب سنے بغیر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ کیونکہ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنی محبت کی توہین برداشت کر سکتی۔
شرجیل چند لمحے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر وہ بھی باہر نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

عید سے تین چار روز پہلے ناجیہ اپنے گھر واپس لوٹ

آئی تھی۔

''کیا بات ہے ناجیہ! جب سے تم مجیدہ خالہ کے گھر سے آئی ہو' بہت چپ چپ ہو؟'' راجیہ نے پوچھا تھا۔

''نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' ناجیہ جیسے خود سے بھی کچھ چھپا رہی تھی۔ حقیقت میں اسے اس بات کا بہت دکھ تھا کہ شرجیل احمد بھی ایک عام انسان ثابت ہوئے۔ انہیں بھی محبت کی بجائے دولت اور شان عزیز تھی' تبھی تو وہ لوٹ کر نہیں آئے' مجھ جیسی غریب لڑکی سے شادی کر کے انہیں بھلا کیا مل جاتا۔ اس دنیا میں سچائی اور خلوص کی کوئی قیمت نہیں مگر میرے خدا! تو نے میرے دل میں شرجیل احمد کی محبت کی جو شمع روشن کر دی ہے' اس کا کیا ہوگا۔ سوچتے سوچتے اسے نیند نے آگھیرا تھا۔

مجیدہ خالہ کے دونوں بیٹے' ماں کے پاس عید گزارنے آ گئے تھے۔ رمضان کا آخری روزہ انہوں نے اپنے گھر افطار کروانے کا اہتمام کیا تھا۔ انہوں نے تمام لوگوں کو آنے کی تاکید کے ساتھ خاص طور پر ناجیہ کو مخاطب کیا تھا۔

''ناجیہ بیٹا! تم ضرور آنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔'' وہ چاہنے کے باوجود بھی انکار نہ کر سکی تھی۔ اسے مجبوراً جانا ہی پڑا تھا۔ روزہ افطار کر کے' نماز وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ناجیہ باہر لان کے ایک خاموش گوشے میں آ بیٹھی تھی۔

''کاش میں یہاں نہ آئی ہوتی تو یہ دکھ میرا مقدر نہ بنتا۔'' ناجیہ نے دکھے دل سے سوچا تھا' گئے دنوں کا ایک ایک لمحہ کرب ناک یاد بن کر اس کی آنکھوں کو نم کر رہا تھا۔

''ناجیہ! آپ یہاں چھپی بیٹھی ہیں اور میں کب سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔''

مانوس سی آواز پر ناجیہ نے چونک کر پیچھے مڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ شرجیل احمد گرے کلر کے سادہ سے کرتا شلوار میں ملبوس اس کے روبرو تھے۔

''شرجیل! آپ......؟'' ناجیہ حیران ہوئی تھی۔

''ہاں میں' اور میں آنٹی کا پیغام ملنے پر یہاں صرف اس لیے آیا ہوں کہ شاید اسی بہانے آپ سے ملاقات ہو جائے۔''

''کیوں؟ پھر کوئی نیا زخم دینا چاہتے ہیں؟'' وہ تلخی سے بولی تھی۔

''ناجیہ! مجھے پتا ہے کہ آپ مجھ سے بے حد خفا ہیں مگر پلیز' ایک مرتبہ میری بات سن لیجیے پھر جو دل چاہے' سلوک کیجیے گا۔ اس دن آپ نے تو اپنی حقیقت مجھ پر آشکار کر دی اور میرا جواب سنے بغیر میرے بارے میں رائے بھی قائم کر لی۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے آپ کی اصلیت جان کر شاک سا لگا تھا مگر بخدا' یقین کیجیے کہ میں نے آپ کی امیری یا غریبی سے محبت نہیں کی بلکہ سچے دل سے آپ کو چاہا ہے۔ ہاں' آپ کی بات سو فیصد ٹھیک تھی کہ محبت کرنے والوں کے درمیان امیر اور غریب کا فرق ہمیشہ سے رہا ہے اور یہ دنیا دو محبت کرنے والوں کو دولت کے ترازو میں تولتی ہے۔ میں اس عرصے میں آپ سے صرف اس لیے نہیں مل سکا کہ مجھے اپنے گھر والوں کو اس رشتے کے لیے منانا تھا کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی شادی ایک غریب گھرانے کی لڑکی سے نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن میری خوشی کے آگے انہوں نے ہار مان لی ہے۔ میں نے آپ سے محبت کی تھی کوئی سودے بازی نہیں اور آپ کے خیالات سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ سچائی اور خلوص کے اصولوں پر اپنے رشتے کی بنیاد رکھنا چاہتی ہیں۔ آپ کی سوچوں اور خیالات نے میرے دل میں آپ کا مقام اور بلند کر دیا۔ آپ نے نہایت جرأت سے سچ کہہ دیا۔ اب تو آپ نے مجھے معاف کر دیا ہوگا یہ سب سن کر اور ہاں' کیا آپ مجھے ہم سفری کا شرف بخشیں گی؟ میرے گھر والے آج ہی اور ابھی آپ کے والدین سے ہمارے رشتے کی بات کریں گے اور عید کے فوراً بعد منگنی کی رسم ادا کی جائے گی۔ کہیے آپ کو میرا ساتھ زندگی بھر کے لیے منظور ہے؟''

ناجیہ بس خاموش شرجیل احمد کو دیکھے جا رہی تھی۔

''دیکھیے پلیز' آپ انکار کر کے میری عید خراب نہ کر دیجیے گا؟'' شرجیل احمد نے اپنے ہاتھ جوڑ کے ملتجی لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اور پھر اچانک سے ایک ساشے اُس کے جڑے ہاتھوں سے نیچے گرا تھا۔ ناجیہ نے ساشے اٹھایا تھا۔ لائف بوائے شیمپو کے ساشے دیکھ کر اُس کی ہنسی نکل گئی۔

''جو محبت کرتے ہیں وہ محبت کرنے والوں کے ہر راز سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ آپ کے حسین بالوں کا راز' آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔''

جواباً ناجیہ دھیمے سے مسکرا دی تھی اور شرجیل کو اقرار کے تمام رنگ مل گئے تھے۔

☆☆......☆☆
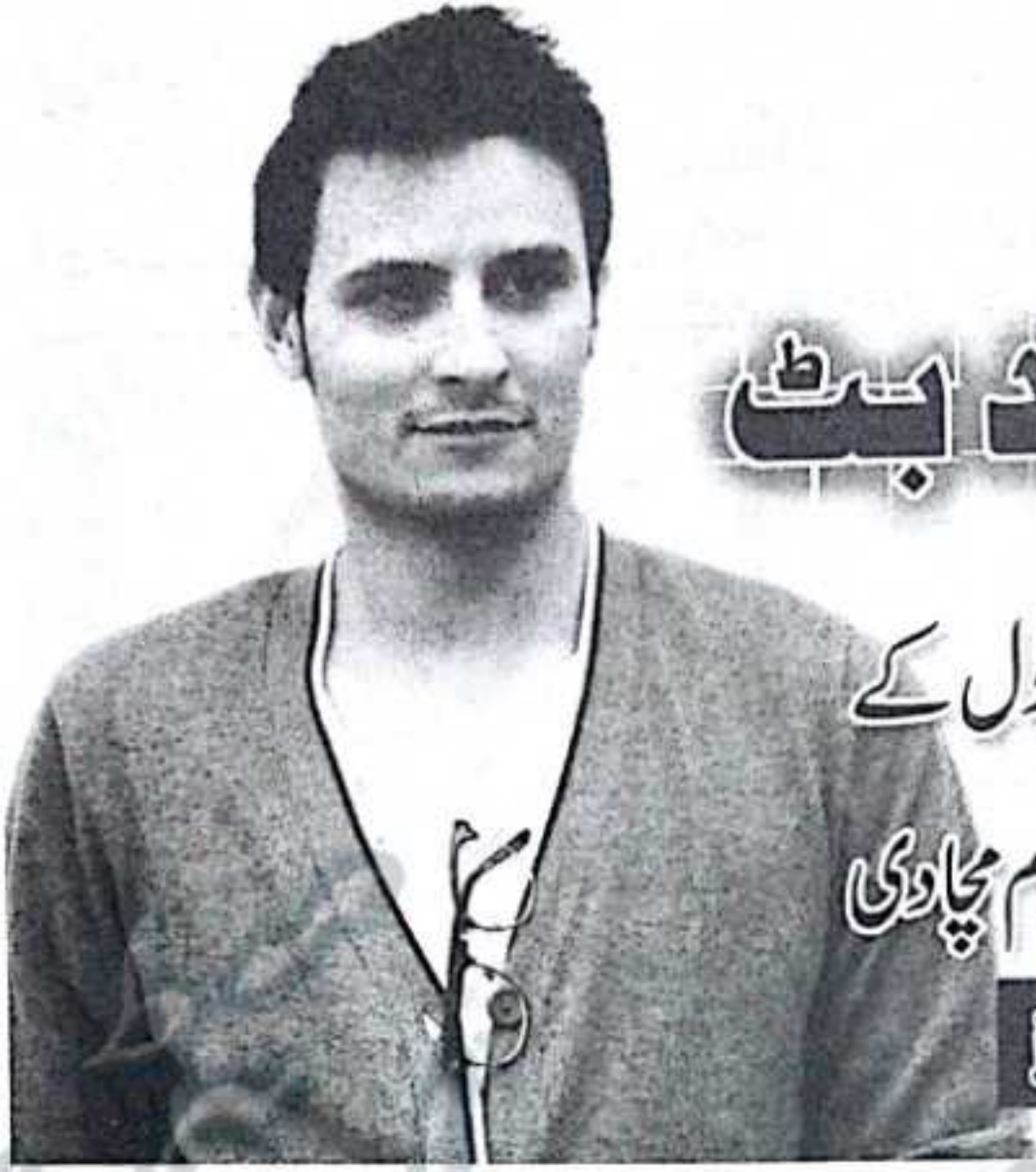
عثمان خالد بٹ

اداکار، صحافی اور ڈائریکٹر دیارِ دل کے "ولی" نے سلور اسکرین پر دھوم مچا دی

ذیشان فراز

ہم: عثمان یہ بتائیں آپ کی والدہ فرنچ ہیں اور والد کشمیری پھر اردو زبان پر اتنا عبور کیسے؟

عثمان: (ہنستے ہوئے) یہ ٹھیک کہا آپ نے مگر مجھے کیونکہ شوق ہے تھیٹر اور ڈرامے کرنے کا تو اس کے لیے اردو پر محنت کی۔

ہم: آپ نے شیکسپیئر کے ڈراموں پر بھی کام کیا کیسا لگا؟

عثمان: جی میں نے لندن میں تھیٹر پلے کیے اُن کا اپنا مزہ ہے لوگ مختلف ہوتے ہیں، انداز مختلف ہوتا ہے۔

ہم: عثمان کچھ اپنے بارے میں بتایئے؟

عثمان: او کے ابھی ایسا کچھ خاص تو نہیں کیا کہ بتاؤں مگر اپنے پوچھا ہے تو میں نے شوبزنس میں انٹری دی جیو کی سیریل اک نئی سنڈریلا اس ڈرامے سے مجھے حقیقی شہرت ملی اور لوگ جاننے لگے پھر 2013ء میں عون زارا کیا میں خوش قسمت ہوں کہ دونوں ڈراموں نے ریٹنگ کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔

ہم: دیارِ دل جو ہم سے آن ایئر گیا اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟

عثمان: جی اس ڈرامے کو بھی بہت پسند کیا گیا۔

ہم: اب کا فلموں میں جانے کا ارادہ ہے؟ بولی وڈ سے آفر آئی تو؟

عثمان: جی بالکل کیوں نہیں ویسے میں نے دو فلموں میں کام کیا ہے مگر انہیں سنسر بورڈ نے پاکستان میں ریلیز ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ذبح خانہ اور سلیکستان دونوں ڈبوں میں بند ہیں۔ فی الحال ریحام خان کی فلم 'جانان' میں مصروف ہوں۔

ہم: آپ نے ہمسفر کی پیروڈی بنائی تھی کیسے خیال آیا؟

عثمان: (کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے) بس بچپنا سمجھیں وہ اک بہترین ڈرامہ تھا مگر اُس کی پیروڈی نے سوشل میڈیا پر تہلکا مچا دیا تھا۔

ہم: عثمان یہ بتائیں آپ کتنے بہن بھائی

ہیں؟

عثمان: میرا بڑا بھائی اور بڑی بہن ہے گھر میں سب سے چھوٹا اور بہت لاڈلا ہوں خاص طور
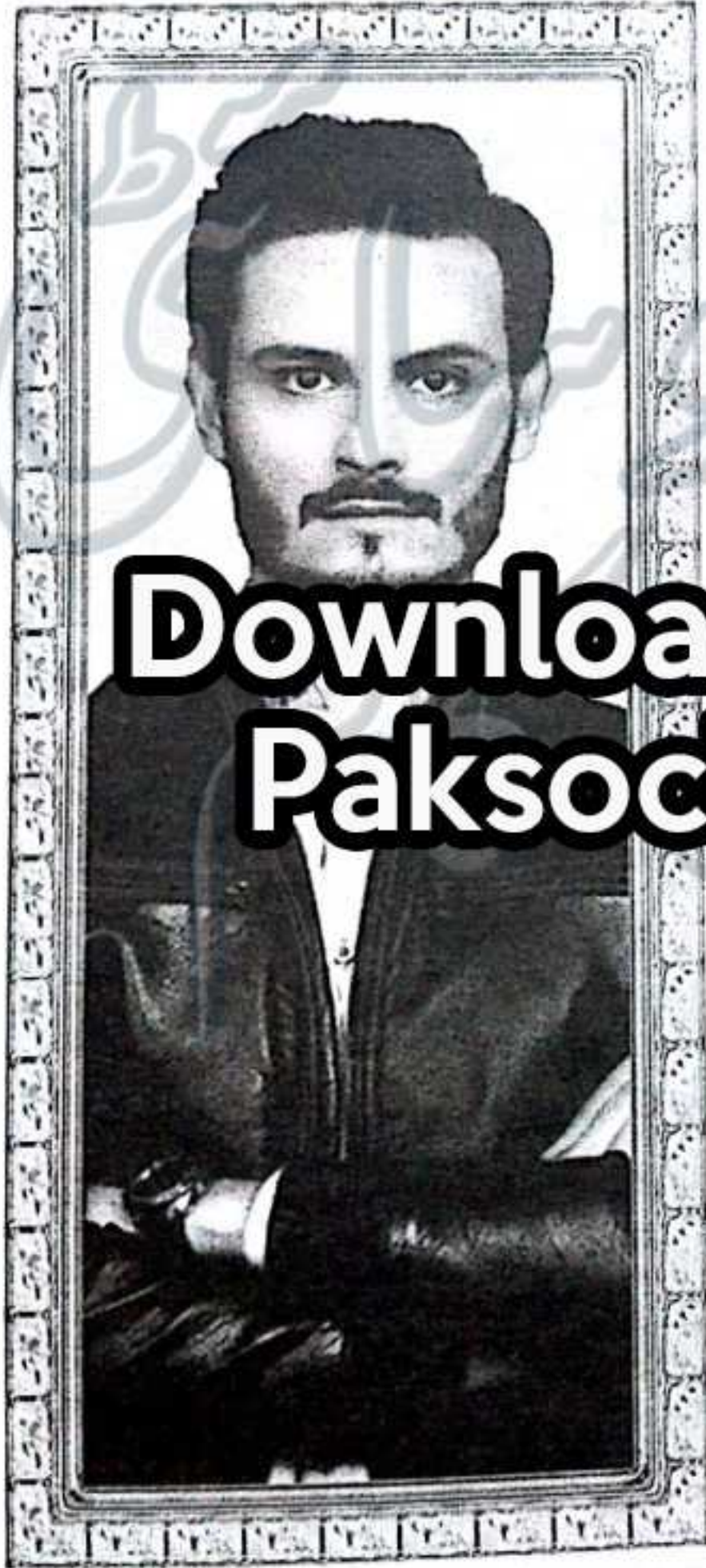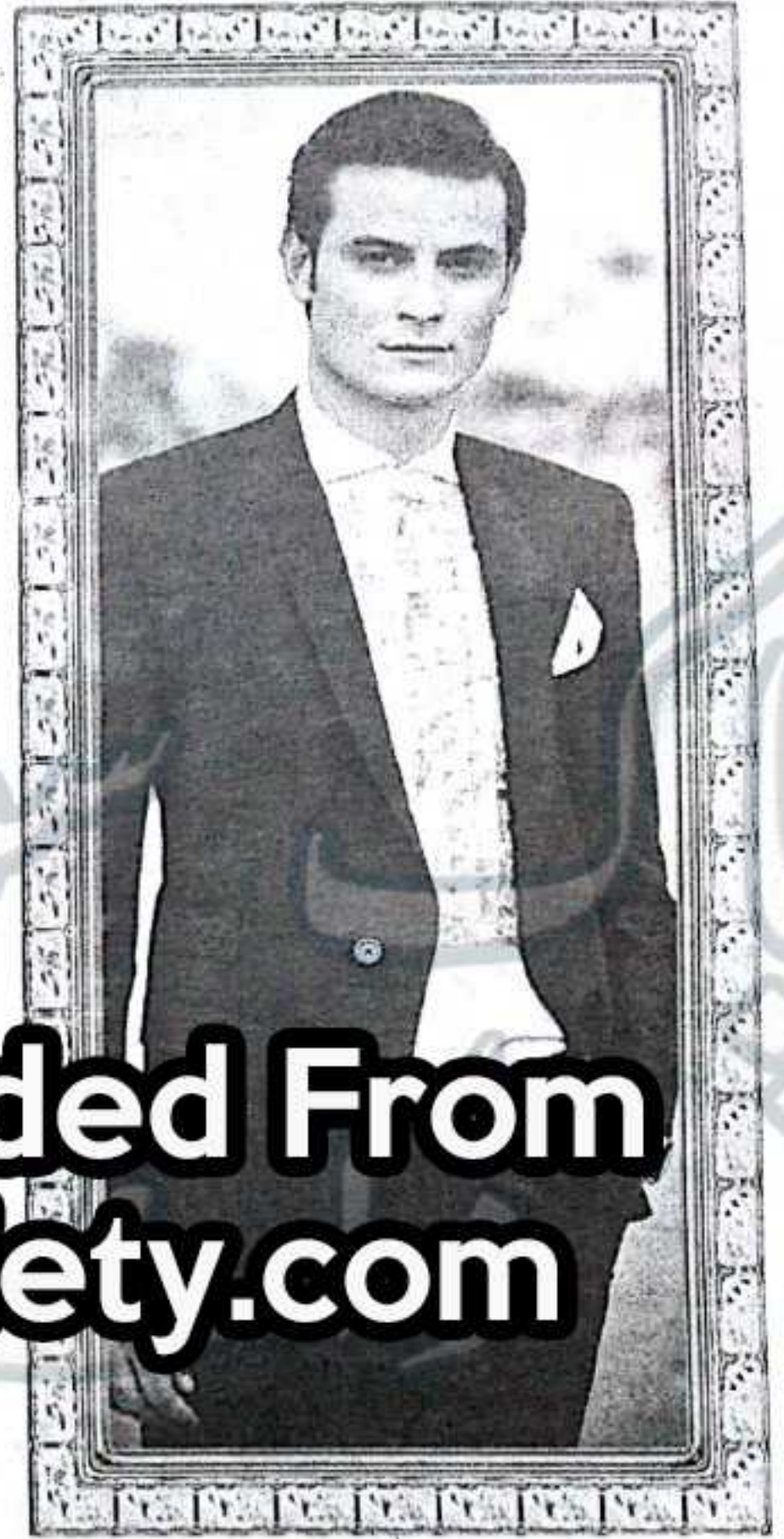
سے بہن ہیشال نے ہمیشہ بہت سپورٹ کیا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں اُس کی وجہ سے ہوں۔

ہم: اچھا یہ بتائیں کہ فارغ وقت میں کیا کرتے ہیں اور تعلیم کتنی حاصل کی؟

عثمان: میں نے جرنلزم میں بیچلرز کیا ہے اور اگر اداکار نہ ہوتا تو ٹیچر، رائٹر یا رپورٹر ہوتا فارغ وقت تو ویسے نہیں ملتا کیونکہ میں نے 'دیسی رائٹرز لاؤنج بنایا ہے جو دراصل آن لائن رائٹرز کی کمیونٹی ہے پھر اپنا پروڈکشن ہاؤس ''The Living Picture'' بھی ہے۔ ویسے مجھے کتابیں پڑھنا، لمبی لمبی واک کرنا بہت پسند ہے۔

ہم: اگر یہ کہا جائے کہ عثمان کریزی ہے تو وہ کیا چیز ہے؟

عثمان: میں چائے اور کراس ورڈ گیمز کے پیچھے کریزی ہوں۔

ہم: کوئی خوف جو بہت تنگ کرتا ہے؟

عثمان: جی مجھے اپنے والدین کو کھونے کا بہت خوف ہے میں سوچتا ہوں اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔

ہم: اچھا چلیں یہ تو بہت سیریس باتیں ہوگئیں۔ اب ہلکی پھلکی بات چیت کرتے ہی، کبھی محبت ہوئی؟

عثمان: (مسکراتے ہوئے) سچ بتاؤں ایک بار سچی محبت ہوئی تھی اور وہ اب بھی دل میں بستی

عثمان: اوہ کم آن زندگی بہت آسان ہے میں روز جیتا ہوں۔ خوش رہنا چاہتا ہوں میری والدہ ہمیشہ کہتی ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انسان امیر ہو یا غریب اہم یہ ہے کہ وہ جب سوئے تب اس کے چہرے پر اطمینان ہو لہٰذا میں خوش رہتا ہوں۔

ہم: ہالی وڈ اور بالی وڈ میں کون سے اداکار پسند ہیں؟

ہے۔ لیکن اپنی شادی شدہ زندگی میں وہ بہت خوش ہے اور یہ دیکھ کر میں بھی مطمئن ہو جاتا ہوں۔

ہم: گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟

عثمان: مجھے OBI پکارتے ہیں اور یہ نام کیسے پڑا میں نہیں جانتا۔

ہم: ایسا کونسا رول ہے جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟

عثمان: میں ہارر رول کرنا چاہتا ہوں۔ I Wish کہ کبھی موقع ملے۔

ہم: زندگی کے بارے میں فلسفہ ہے؟

عثمان: مجھے جونی ڈیپ Jack Hicholson اور انتھونی ہاپکن بہت پسند ہیں۔ سری دیوی پسندیدہ ترین انڈین ایکٹرس ہیں۔ مغل اعظم اور دل والے دلہنیا لے جائیں گے بہت اچھی لگتی ہیں۔

ہم: مارننگ شوز کے بارے میں کیا رائے ہے؟

عثمان: میں مارننگ شوز کے بارے میں کوئی رائے نہیں دوں گا۔ سوائے اس کے کہ یہ Improve ہو سکتے ہیں ہمیں سوشل ایشوز کو ضرور

ڈسکس کرنا چاہیے۔ مزاح کے ساتھ تعلیم بھی ضروری ہے۔
ہم: عثمان آپ نے ریمپ پر بھی واک کی، کیسا تجربہ ہے؟
عثمان: میں نے فیشن پاکستان ویک پر وردا سلیم کے OutFits پہنے اچھا تجربہ ہے۔ مزہ آتا ہے فوراً ہی پتا چل جاتا ہے کہ آپ کیسے لگ رہے ہیں۔
ہم: آپ نے بہت کم وقت میں شوبزنس میں بہت اچھا مقام بنالیا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟
عثمان: جی یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے عزت دی اور دو چار لوگ مجھے پہچاننے لگے مگر اب جانتے ہیں کہ انسان زندگی کی آخری سانس تک سیکھتا ہے اور میں بھی اس بات پر بہت یقین رکھتا ہوں۔ ہمیشہ کوشش رہتی ہے کہ اپنی Acting Skills کو امپروو کروں۔
ہم: اپنے چاہنے والوں کے لیے کیا پیغام دیں گے؟
عثمان: میں اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور آپ کے پرچے کے ذریعے ریکویسٹ کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے مثبت تنقید سے محروم نہ رکھیے گا کیونکہ اس سے ہی ایک ایکٹر اپنی خامیاں دور کرسکتا ہے۔
ہم: عثمان آپ کا شکریہ آپ نے مجھے وقت دیا اور آپ کے انٹرویو کا جو رسپانس آئے گا اس سے آپ کو ضرور آگاہ کروں گا۔
عثمان: آپ کا بھی شکریہ اور میں شدت سے رسپانس کا انتظار کروں گا۔
یوں یہ ملاقات تمام ہوئی۔ عثمان نہایت باصلاحیت اور تعلیم یافتہ انسان ہیں ایسے لوگوں سے ملنا ہمیشہ بہت مثبت تاثر چھوڑتا ہے۔ ہمیں اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بیش بہا صلاحیتوں سے نوازہ ہے اور حسن کی دولت سے بھی مالا مال کیا ہے۔ آئندہ ماہ آپ کی کسی اور پسندیدہ شخصیت سے ملاقات ہوگی۔ اگر آپ اپنے پسندیدہ اداکار یا اداکارہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو مجھے دوشیزہ کے پتے پر خط لکھ کر آگاہ کریں میں آپ کے لیے ان انٹرویوز کا اہتمام کروں گا۔

☆☆......☆☆

سروے

دوشیزہ کی سال گرہ

کاشی چوہان

دوشیزہ نے اپنی سال گرہ کے موقع پر ایک سروے کا اہتمام کیا ہے۔ ہم نے اپنے لکھنے والوں سے نہایت دلچسپ سوالات کیے، جن کا انہوں نے بھرپور جواب دے کر اس سروے کو گل و گلزار بنا دیا ہے۔

سوال کچھ اس طرح تھے۔

1) آپ کی پہلی تحریر کب چھپی اور کیسا رسپانس ملا؟
2) زندگی کی کوئی ایسی سال گرہ جو آپ کے لیے یادگار بن گئی ہو خوشی یا غم کے حوالے سے؟
3) آپ کا پسندیدہ گانا کون سا ہے اور کیوں؟
4) سال گرہ کے حوالے سے کوئی بہت خوبصورت بات یا شعر جو دل کو چھو جائے؟

(رفعت سراج)

1) پہلی تحریر نولکھا ہار، شمارہ جولائی 1983ء۔
بہت اچھا رسپانس ملا ایوارڈ ملا۔ اس کے ساتھ ہی مسلسل ایوارڈ کی ہیٹ ٹرک بھی کی۔ کیش انعام بھی Win کیا...... الحمداللہ۔
2) خالہ کے ہاں گئی ہوئی تھی چھٹیوں میں سب کزنز وہاں جمع ہوئی تھیں اتفاق سے ان دنوں خالہ کے پاس میں اکیلی تھی خیال آیا وہ کل تو چھ ستمبر ہے میری سالگرہ کا دن......
یوں جوش و ولولہ اٹھا کہ چھٹیاں تو ہیں زبردست طریقے سے مناتے ہیں خالہ زاد بھائی کو لے کر ہیپڑ دیڑ دوسری خالہ کے گھر پہنچی۔ ماشاء اللہ ان کی چھ صاحبزادیاں ہیں اس وقت کسی بھی شادی والی عمر نہیں تھی سب کو شور مچا کر گھیر گھار کر اپنی خالہ (مرحومہ) کے گھر لائی کہ کل میری سالگرہ ہے رات سے تیاری کریں گے خوب انجوائے کریں گے خالہ بھی ہماری دوست ہی تھیں ہر طرح کا تعاون کر رہی تھیں۔
شام کو سالگرہ کا کیک کٹنا تھا دوپہر کو والد محترم لینے آ گئے ان کا اتنا رعب تھا کہ دم سادھ کر چل پڑے۔ امی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لیے وہ اچانک لینے آ گئے۔
میزبان روتی صورت جا رہے تھے مہمان ہونقوں کی طرح دیکھ رہے تھے۔

3) 1) میرا ایمان محبت ہے (فلم ناگ منی)
2) جان جاں تو جو کہے (فلم آنسو)
3) اس دنیا کے غم (نصرت فتح علی)
4) کچھ دل نے کہا (لتا جی)

4) الفاظ سے زیادہ لہجے سنبھالیں...... قربت و جدائی کا کھیل اسی اساس پر کھیلا جاتا ہے۔
وہ اس کمال سے کھیلا تھا عشق کی بازی

میں اپنی فتح سمجھتا تھا مات ہونے تک

(رخ چوہدری)

1) پہلی تحریر کب چھپی اُس کا ریکارڈ دوشیزہ لائبریری میں ہوگا۔ بھلکڑ رائٹر کو کچھ یاد نہیں یاد ہے تو اتنا کہ اللہ رب العزت کی مہربانی سے دوشیزہ میں چھپنے والا افسانہ بہت پسند کیا گیا۔ ہر چند کہ دوشیزہ کے سنجیدہ مزاج کے برعکس تحریر تھی وہ افسانہ مجھے اس لیے بھی پسند آیا کہ اس کو منزہ فریدہ مسرور اور غزالہ رشید نے خوب سراہا تھا۔

2) سالگرہ تو بچپن کی حسین یادیں ہیں۔ بچپن کی تو کوئی یادگار سالگرہ یاد نہیں البتہ چار سال قبل ریحانہ کی شادی تھی شادی تو 21 دسمبر کو ہوئی۔ پنجاب سے سب رشتے دار آئے ہوئے تھے۔ خوب رونق تھی شادی کے سارے ایونٹ گزر چکے تھے اور بوریت چل رہی تھی کہ اب کیا کریں۔ میں ہمیشہ کی طرح اپنی برتھ ڈے بھولی تھی اور چونکہ ریحانہ نے رخصت ہوکر امریکہ جانا تھا۔ میں بہت اُداس تھی۔ 25 دسمبر کو فلو کی وجہ سے لیٹ گئی اور سوگئی مگر میری چھوٹی بھابی رابعہ ذیشان نے آکر کہا۔ آپ سے ضروری بات کرنی ہے آئیں۔ میں گھبرا گئی کہ اللہ خیر کرے۔ طاس کے ساتھ گرتی پڑتی لاؤنج میں آئی تو جتنے بھی مہمان تھے جن میں بزرگ تھے سب جمع تھے سب نے وش کیا ڈھیروں دعائیں اور تحائف دیے اور خوب شور ہنگامہ کیا۔ رابعہ ذیشان کے ذہن کی ڈائری میں سب کی ڈیٹ آف برتھ ہوتی ہے جس کی ہوتی ہے اسے یاد رہے نہ رہے مگر اُس کو یاد رہتی اور سب کو سرپرائز کردیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے خوش رکھے آمین۔ اس 25 کو میں اب کی یادگار برتھ ڈے کہتی ہوں جس میں خاندان کے لوگ بھی شریک تھے۔

3) میوزک سے گانوں سے کوئی لگاؤ...... نہیں البتہ اچھی شاعری اچھے شعر اچھے لگتے ہیں۔

4) بات تو ایسی ہی ہونی چاہیے جو دل کو چھو جائے۔ اور اتفاق سے مجھے ایسی بات کرنی نہیں آتی۔ لیکن دوشیزہ ڈائجسٹ کی سالگرہ پر یہ ہی کہوں گی۔ دوشیزہ ڈائجسٹ ہم رائٹرز کی تحریر کے ماتھے کا وہ جھومر جو کم از کم میری عام تحریر کو خاص بنا دیتا ہے۔ تحریر خوبصورت بن جاتی ہے۔ دوشیزہ کی ساری ٹیم کو ایک بار پھر دوشیزہ سالگرہ مبارک ہو۔ ڈیئر رضوانہ کے آنے سے کچھ تبدیلی محسوس ہورہی ہے۔ ایک اچھا ایڈیٹر کسی بھی پرچے میں ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کرتا ہے۔ منزہ کی زیر نگرانی انشاء اللہ مزید ترقی اور شہرت حاصل کرے گا۔

(اقبال ہاشمانی)

1) میری پہلی تحریر 'جھیل والی لڑکی' 1992ء میں دوشیزہ میں شائع ہوئی تھی۔ جسے خاطر خواہ پذیرائی ملی تھی۔

2) آج سے کچھ عرصہ قبل جب عین سالگرہ والے دن مجھے پتا چلا کہ آج ہی کے دن ہمارے سابق صدر جناب آصف علی زرداری کی بھی سالگرہ ہے تو عجیب گومگو کی کیفیت طاری ہوگئی کہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس خبر پر خوش ہونا چاہیے یا افسوس کرنا چاہیے۔

3) ویسے تو کئی گانے پسند ہیں۔ ان میں سے ایک فلم آن کا گانا آج مورے من میں سکھی بانسری بجائے کوئی ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ شادی اور موسیقی کے لحاظ سے اس گانے میں زندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ دوسرے یہ کہ جس اداکارہ پر یہ گانا فلمایا گیا تھا وہ فلم کی ہیروئن سے بدرجہا بہتر تھی۔

4) یہ دنیا کی واحد دوشیزہ ہے جو عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ مزید حسین اور جوان ہوتی جارہی ہے۔ دعا ہے اُس کا حسن قائم و دائم رہے۔

(فرح اسلم قریشی)

1) پہلی تحریر 2003ء میں شائع ہوئی۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ شادی کے چھ سال بعد یعنی 2002ء سے شروع ہو چکا تھا۔ تاہم دوشیزاؤں کی فہرست میں شامل ہونے کی جتنی خوشی اس وقت محسوس ہوئی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ 'بے یقنی کا سفر' کے نام سے تحریر کردہ اس کہانی پر بہت اچھا ریسپانس ملا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے یہ شکایت ہو چلی تھی کہ اتنی زبردست پذیرائی کے بعد بھی ایوارڈ کے لیے نامزد نہ ہونا حیران کن بات ہے۔

2) نکاح چونکہ رخصتی سے تین سال پہلے ہو چکا تھا۔ میاں جی نے نکاح کے بعد آنے والی ہماری پہلی سالگرہ پر فون کر کے پوچھا۔

''کیا گفٹ لوگی؟''

انہیں تو ہم نے کوئی جواب نہ دیا کہ بھلا گفٹ بھی کوئی پوچھ کر دیے جاتے ہیں۔ تاہم شدت کے ساتھ منتظر رہے کہ دیکھیں کیا تحفہ ملتا ہے؟ پھر یوں ہوا کہ سالگرہ والے دن میاں جی ہمارے گھر پہنچ گئے۔ گھر والوں کے ساتھ کمرے میں بیٹھے تھے اور اندر سے مسلسل قہقہوں کی آواز باہر آرہی تھی۔ کئی بار جی میں آیا بے دھڑک اندر جا کر دیکھ لوں کہ آخر ہو کیا رہا ہے مگر حجاب مانع تھا۔ کچھ دیر بعد بڑی بہن صاحبہ اندر سے باہر تشریف لائیں اور جو کچھ فرمایا اُس کا لب لباب یہ تھا کہ

گفٹ تمہارا دبئی میں ہی بھول کر وہ آئے ہیں

اسی لیے سر اپنا بالوں سے آزاد کرا کے آئے ہیں۔

جی ہاں...... موصوف اُس دن نا صرف خالی ہاتھ بلکہ خالی 'ٹنڈ' (گنجے ہو کر) ہمارے گھر پہنچ گئے تھے۔ اور گنجے ہونے کی وجہ یہ بتائی کہ بال بہت گر رہے تھے' یہ الگ بات ہے کہ سب مجھے چھیڑتے رہے کہ اِس سے پہلے کہ تم اُسے گنجا کرتیں وہ خود ہو کے آ گیا۔

3) وقت کے ساتھ گانوں کا انتخاب بدلتا رہا۔ ایک وقت تھا جب لبوں پر ہمیشہ زبانِ زدِ عام قسم کے گانے رہا کرتے تھے۔ جس میں 'کبوتر جا جا جا' بھی شامل ہے۔ پھر شادی کے بعد شبنم مجید کا 'دل چیز ہے کیا جاناں' اور آج کل 'تیری آنکھوں کے دریا کا اترنا بھی ضروری تھا' (راحت فتح) رہا سوال کہ کیوں پسند ہے؟ تو حالات' مزاج اور عمر کی تبدیلی کا پسند ناپسند پر اثر انداز ہونا فطری عمل ہے اس لیے۔

4) دوشیزہ سے میرا تعلق تیرہ سال پرانا ہے۔ اور اہلیانِ دوشیزہ کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے مصنفین سے اپنا تعلق محض اُن کی تحریروں تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اُن کے دکھ، سکھ، علالت و کامیابی غرض ہر مرحلے پر اپنے تعلق کو رابطوں کے ذریعے مضبوط بنایا ہے۔ یعنی ہمیں کبھی نہیں بھلایا اس لیے دوشیزہ کے لیے تانیثی اضافے کے ساتھ یہ شعر لکھنا چاہوں گی

تعلق کے نئے انداز سے خاکے بناتی ہے
کوئی دیوار چنتا ہے وہ دروازے بناتی ہے

(سنبل)

1) دوشیزہ میرے لیے پہلی محبت کی طرح ہے۔ میں نے اپنی پہلی تحریر دوشیزہ میں اپریل 2002ء میں بھیجی تھی اگلے ہی مہینے فریدہ مسرور کا فون آیا تھا اور جون 2002ء میں میرا پہلا افسانہ 'کانچ کی گڑیا' چھپا تھا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جنہیں دوسروں کی ہنڈیا میں چمچ چلانے کی عادت ہوتی ہے ناں! میں نے افسانہ لکھا تو اپنی

دوست کو بتایا تو ان کے شوہر نے کہا کہ میں افسانہ چھپوانے کے سلسلے میں کچھ مدد کروں میں نے جواب دیا۔ ''خدا نے مجھے اپاہج نہیں بنایا تھا مجھے بیساکھیوں کی عادت نہیں ہے۔ سو میں نے بغیر کسی مدد و سفارش کے افسانہ بھیجا اور دوشیزہ کے وعدے کے مطابق چھپا بھی کہ اچھی تحریروں کے لیے ہمارے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

اور رسپانس بڑا زبردست ملا تھا۔ خاندان والوں کی طرف سے بھی اور رائٹرز کی طرف سے بھی۔ اس وقت وہ رائٹرز بھی باقاعدگی سے محفل میں آتے تھے جنہیں اس سے پہلے میں صرف پڑھا کرتی تھی۔

میری پہلی تحریر پر حارث بن عزیز' شہباز' احمد عثمانی' صبیحہ شاہ' ہوا خامان (مرحوم) زمر نعیم' شائستہ عزیز' حمیرا راحت' ایاز انصاری' کرن اختر' شمع حفیظ' نیر شفقت' شگفتہ شفیق' طاہر جولانی' عباس' راشد ترین نے کمنٹس دیے بقول صبیحہ شاہ آثار بتاتے ہیں کہ دوشیزہ کو ایک اور خوبصورت فنکار ملنے والا ہے بقول حمیرا راحت اللہ کرے یہ نیا اضافہ مزید خوشگوار ثابت ہو۔

بقول حارث ''سنبل نے انتہائی دیسی موضوع اٹھایا اور حسنِ اتفاق یہی بات اُن کے طرزِ تحریر کی سرخروئی کی ضامن ہوئی۔

بقول شائستہ 'رائٹر اگر شدت پسندی کے وائرس اور جذباتیت کو کم رکھیں تو خاص کامیاب ہوں گی۔

بقول ہوا خامان' اپنے انداز کی روانی کی بناء پر بے حد پسند آیا طرزِ تحریر بے اختیاری و بے ساختگی لیے ہوئے تھا اس افسانے نے آپ بیتی کا سا لطف دیا۔

یہ سب اور آج تک جو کمنٹس ملتے ہیں وہ بھی میری ڈائری میں تحریر ہوتے ہیں خواہ تعریف ہو یا تنقید۔ یہ میرا فیول ہیں باقی کمنٹس بھی بڑے اچھے تھے مگر پھر میرے علاوہ کوئی چھپ نہیں سکے گا۔

2) میری تو نہیں میرے بھائی کی سالگرہ تھی وہ۔ ابو کے ایک دوست تھے جنہوں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ ان دونوں کی فیملیز ان سے نہیں ملتی تھیں۔ وہ دونوں ابو اور امی کو اپنا بڑا مانتے تھے اور ہر مسئلے کو لے کر ہمارے گھر آتے تھے۔ ان کے دو چھوٹے چھوٹے بیٹے تھے۔ وہ ہمارے گھر کے افراد کی طرح تھے چاروں، بھائی کی سالگرہ 28 فروری کو ہوتی ہے۔ اس دن بھائی کی سالگرہ تھی ابو کیک لائے تو ساتھ یہ روح فرسا خبر لائے کہ ناصر انکل اپنی بائیک ٹھیک کروا رہے تھے کہ ایک بے قابو بس نے انہیں ہٹ کیا وہ اچھل کر بیچ سڑک پر گرے اور پھر انہیں لے کر چلتی ہوئی چلی گئی۔ بس نے فٹ پاتھ پر چڑھ کر انہیں ہٹ کیا تھا وہ موقع پر ہی اس فانی دنیا سے چلے گئے۔ اس دن کیک رکھا وہ گیا اور پھر بھائی نے کبھی سالگرہ نہیں منائی۔ حمیرا آنٹی اور انکل میں اس قدر محبت تھی کہ آنٹی کو انکل کو دکھایا نہیں گیا تھا کیونکہ وہ مکمل کچل چکے تھے۔ مگر انہوں نے خواب میں آ کر انہیں اپنی ہر چوٹ اور ہر ٹوٹی ہوئی ہڈی دکھائی۔ کیونکہ حمیرا آنٹی بغیر دیکھے بھی ہر چوٹ کا نشان اور ہر ٹوٹی ہوئی ہڈی کی تفصیل بالکل درست بتاتی تھیں۔ وہ محبت سوچوں تو مجھے آج بھی بے کل کر دیتی ہے۔

حالانکہ اس وقت میں خود 12' 13 سال کی تھی۔

3) صرف ایک ایک لمبی فہرست ہے۔ پسندیدہ گانوں کی اور وجہ مجھے ہمیشہ سے دھیمے اور پرانے گانے پسند ہیں۔ بچوں سے اکثر کہتی ہوں تمہارے گانوں کی لائف نہیں ہے۔ یہ دو دن

کانوں کو بھلے لگتے ہیں اور بالآخر اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ بہرحال فلم وارث، دل ہے کہ مانتا نہیں، قیامت سے قیامت تک، رام تیری گنگا میلی اور انداز اپنا اپنا کے تمام گانے' نصرت فتح کے اکثر گانے عابدہ پروین کا خصوصاً 'یار ڑکو ہم نے جا بجا دیکھا' اور 'لے تو آئے ہو ہمیں سپنوں کے گاؤں میں' پربت کے پیچھے چمے دا گاؤں' گوری تیرا گاؤں بڑا پیارا' وعدہ کر لے ساجنا' دو لفظوں کی ہے دل کی کہانی' اکھیوں کے جھروکوں سے، تو تو ہے وہی دل نے جسے اپنا کہا' فلک تک چل ساتھ میرے' دل کیا کرے جب کسی کو کسی سے' بھول گیا سب کچھ یاد نہیں اب کچھ اور بہت سے صفحے کے صفحے کالے ہو جائیں گے۔ مگر میری پسند ختم نہیں ہوگی اور ہاں جگجیت چترا کی غزلیں شیلو مسعود کی غزلیں اور ہاں 'اجنبی شہر کے اجنبی راستے' بھی تو 'ہمیں تم سے پیار کتنا' کتنا پیار تمہیں کرتے ہیں' اے پیار تیری پہلی نظر کو سلام'

4) شعر تو یہی ہے کہ

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

دوشیزہ میرے لیے پہلی محبت کی طرح ہے جیسے کچی عمر کی پہلی محبت وہ چاہے ہمیں بے وقوفی لگے مگر ہمیں ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ مگر دوشیزہ سے میری محبت میرے شعور کی عمر کی محبت ہے۔ دوشیزہ نے ہمیشہ مجھے مان اور محبت دی یہی وجہ ہے کہ میں کبھی کسی اور طرف نہ جا سکی۔ لکھنے کی صلاحیت شروع سے تھی مگر اس کو تحریک اپنی خالہ کے گھر میں دوشیزہ ایوارڈ نمبر کو دیکھ کر ملی۔ میرا بھی دل چاہا کہ وہ خوبصورت قلم پکڑے کتاب پر رکھا ہوا گولڈ ہاتھ میرا ہو اور ایسا ہوا بھی بغیر کسی سفارش کے دوشیزہ نے مجھے گلے لگایا۔ اور آج تک لگایا ہوا ہے اللہ دوشیزہ کو کامیابی کا آسمان عطا کرے (آمین)۔

(عقیلہ حق)

1) دوشیزہ میں میری پہلی تحریر نومبر 2009ء میں چھپی، الحمدللہ مجھے اپنی پہلی ہی تحریر پر ایوارڈ ملا۔ اور میرے افسانے عدت کو بہت اچھا رسپانس ملا۔ ہم ٹی وی پر اُس کی ڈرامہ چلا اور عدت میری پہچان بن گیا۔

2) زندگی میں کتنی سالگرائیں آئیں اور گزر گئیں۔ بنیادی طور پر میں ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر خوش ہونے والی عورت ہوں، مجھے اچھا لگتا ہے جب کوئی میری سالگرہ پر مجھے وش کرتا ہے۔ کوئی مجھے پھول بھیجتا ہے۔ جب ماں باپ کے گھر میں تھی، تو چاہتی تھی، سب کو یاد رہے، میری سالگرہ 25 جون کو ہوتی ہے۔ ہمیشہ میں اپنی سالگرہ والے دن ایک خوبصورت سیا سوٹ ضرور سلواتی ہوں تو جناب، میری سالگرہ تھی اور میں صبح سے اچھا سا تیار ہو کر گھر میں ٹہل رہی تھی لیکن کسی کو یاد ہی نہیں رہا اور جب شام ڈھل گئی تو میری ہمت بھی جواب دے گئی۔ پھر میں بہت روئی کہ کسی کو بھی میری برتھ ڈے یاد نہیں تو اُس دن میرے والد نے (اللہ اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) مجھے سمجھایا کہ بیٹا لوگوں سے توقع مت رکھا کرو۔ امیدیں باندھو گی تو ہمیشہ دکھی ہوگی۔ دنیا بہت مصروف ہے یہ تمہاری خوشی ہے۔ اِس کو تم محسوس کرو۔ کوئی وِش کرے تو ضرور ویلکم کہو اور کوئی بھول جائے تو تم نظر انداز کر دو۔ بس پھر اُس دن سے وہ جو اندر ایک لڑکی رہتی تھی، جو کہتی تھی مجھے وش کرو...... وہ سمجھ گئی۔ لیکن الحمدللہ! آج تک سب کو میری سالگرہ یاد رہتی ہے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ میرے بچے، میری میاں، میری برتھ

ڈے سیلیبریٹ کرتے ہیں۔ بہن بھائی مبارکباد کے فون کرتے ہیں اور میں خاص کر ذکر کروں گی۔ اپنی بہت اچھی دوست شائستہ فرحان کا، میری برتھ ڈے ہو یا میری شادی کی سالگرہ 'شائستہ کو ہمیشہ یاد رہتا ہے وہ مجھے بہت محبتوں کے ساتھ یاد کرتی ہیں اور اب تو میں بھی اُن کی محبتوں کا انتظار کرتی ہوں۔

3) سونگ تو بہت سارے پسند ہیں۔ لیکن
'زندگی میں تو سب ہی پیار کیا کرتے ہیں'

میرا پسندیدہ گانا ہے اور کیوں؟ اِس کا میرے پاس جواب نہیں ہے لیکن میں جب بھی سنتی ہوں تو آج کی عقیلہ حق 18 سال کی عقیلہ شفیق بن جاتی ہے۔ میں اِس کی نغمگی میں گم ہو جاتی ہوں۔

'میں، میں نہیں رہتی، تم ہو جاتی ہوں'

4) دوشیزہ کی سالگرہ پر مجھ دوشیزہ کے پاس کہنے کے لیے بہت ساری باتیں ہیں، بہت سارے جملے ہیں لیکن سوچ رہی ہوں دوشیزہ کو اتنی ساری باتیں نہیں کرنی چاہیں دوشیزگی پر فرق پڑتا ہے۔

لیکن کہنا تو ہے کیونکہ رضوانہ پرنس نے پوچھا ہے۔ ورنہ رضوانہ کہیں گی...... سوال کا جواب نہیں دیا۔ عقیلہ حق آپ نے حق بات نہیں کہی۔

دوشیزہ کے لیے میری بہت ساری نیک تمنائیں، دوشیزہ کی سالگرہ پر میں دل سے دعا مانگتی ہوں دوشیزہ ہر سال بہت دھوم دھام سے سالگرہ منائیں ہر سال ایوارڈ کی تقریب منعقد ہو ہر سال ایک ایوارڈ عقیلہ حق کے حصے میں آئے۔ دوشیزہ کی عمر بڑھتی جائے اور دوشیزگی برقرار رہے۔ آئندہ جو گیٹ ٹو گیدر رکھی جائے اُس میں میری پاکستان میں موجودگی کی Date کو ضرور مدنظر رکھا جائے۔ اپنے بغیر گروپ فوٹو نے ......

بہت بس کیا کہوں؟
بس یہی کہہ سکتی ہوں۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

مجھے نہیں پتا میں رضوانہ کے سوالات کا صحیح جواب دے پائیں ہوں کہ نہیں کہ بچپن سے امی مرحومہ نے اس نصیحت کے ساتھ تربیت کی تھی کہ خبردار کسی کو جواب دیا تو......

بس اِس ''تو'' کے بعد ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ تو مجھ معصوم بھولی بھالی سی دوشیزہ سے جب ایک ہنستی مسکراتی، زندہ دل دوشیزہ نے سوالات کیے تو میں منع نہ کر سکی اور میں منع کر بھی نہیں سکتی تھی۔

(نزہت جبیں ضیاء)

1) اکتوبر 2009ء میں میرا پہلا افسانہ 'اندازِ مسیحائی' کے نام سے چھپا تھا۔ وہ افسانہ بھی تھوڑا ساہٹ کر تھا۔ الحمدللہ سب نے بہت پسند کیا تھا۔ کچھ رائٹرز نے مجھے کال کر کے بھی مبارکباد دی تھی۔ کافی اچھا رسپانس ملا تھا۔

2) ویسے تو میں اپنی سالگرہ کا کچھ خاص اہتمام نہیں کرتی۔ ضیاء گفٹ دے دیتے ہیں۔ 12 بجے کے بعد بیٹا کیک اور آئس کریم لے آتا ہے۔ بیٹیوں کی کالز آ جاتی ہیں اور میرے عزیز ترین دوستوں کی کالز اور بے شمار میسجز رات 12 بجے سے دوسرے دن 12 بجے تک آتے ہیں۔ مجھے گفٹ لینے اچھے لگتے ہیں چاہے کچھ بھی ہو خصوصاً ضیاء سے لیکن پچھلی سالگرہ میں کبھی بھی بھول نہیں پاؤں گی جب سالگرہ والے دن اچانک بھائی کی طرف سے مجھے پانچ ہزار کا منی آرڈر ملا۔ بات پیسوں کی نہیں بلکہ خوشی اس بات کی تھی کہ میرے مصروف ترین بھائی نے مجھے یاد رکھا (اللہ پاک میرے چاہنے والے رشتوں کو،

میرے بچوں کو، ضیاء کو اور میرے دوستوں کو سلامت رکھے۔ (آمین ثم آمین)

3) یوں تو بہت سارے گانے ہیں جو دلوں کو چھو لیتے ہیں۔ ان میں پاکستانی اور انڈین دونوں ہی ہیں مجھے پرانے گانے زیادہ اچھے لگتے ہیں لیکن کچھ سال پہلے ہم لوگ پکنک پر جا رہے تھے تو گانا اس گاڑی میں سنا۔

آ کہیں دور چلے جائیں ہم
دور اتنا کہ ہمیں چھو نہ سکے کوئی غم

اتنا اچھا لگا کہ میں نے بار بار یہی گانا لگوایا۔ اس گانے کا ایک ایک لفظ دل میں اتر گیا۔ میوزک، سُر، آواز ہر چیز اتنی پرفیکٹ لگی کہ بس...... اس میں شاعر نے جو نقشہ کھینچا ہے اور جس طرح سے گانے والوں نے اپنی خوب صورت آواز میں ریکارڈ کروایا ہے کہ لگتا ہے سیدھا دل میں اُتر گیا ہو میں اکثر یہ گانا سنتی ہوں۔ اگر اس گانے میں ڈوب جاؤں تو لگتا ہے یہ سب کچھ میرے آس پاس ہی ہو رہا ہے۔

4) اپنی سالگرہ پر میں نے اپنے بھائی کے لیے ایک نظم لکھی تھی۔ وہ حاضرِ خدمت ہے۔

ہماری سالگرہ کے دن
اگر تم ساتھ ہوتے تو ہمیں اچھا بہت لگتا
تمہارے ساتھ مِل کر کینڈل بجھاتے ہم
اپنے ہاتھوں سے تمہیں کیک کھلاتے ہم
تم اپنے ہاتھ ہمارے سر پر رکھ کر ہمیں ڈھیروں دعا دیتے
ہماری آنکھ نم ہو جاتی، خود پر رشک ہم کرتے
بڑے ہی پیار سے اور مان سے اپنا رشتہ نبھاتے تم
تمہارے ساتھ مل کر کھل کے ہنستے مسکراتے ہم
ہمیں اچھا بہت لگتا
ہماری زندگی کا یہ دن ہمیشہ یاد رکھتے ہم

سالگرہ کا وہ سماں

یاد تو ہوگا تمہیں، سالگرہ کا وہ سماں
لوگوں کی مبارکیں، ہنس رہے تھے ہم وہاں
کھلے ہوئے تھے لوگ سب نہ کوئی چہرہ تھا دھواں
مسکراتے لوگ سارے دعاؤں کے ہجوم میں
اپنے تحفے دے رہے تھے
ان کے سارے تحفے جاناں
تھے تو بے حد قیمتی
پر دل کو میرے بھائی تھی
میلہ لوٹ لائی تھی
وہ پھول کی نازک کلی
تم نے دی تھی جو مجھے
وہ بالوں میں میرے سجی

شگفتہ شفیق

میرے پیارے سے ''بھائی'' آج اگر تم ہمارے ساتھ ہوتے تو!
ہمیں بہت اچھا لگتا۔

(مسز نگہت غفار)

1) غالباً جنوری 2008ء میں 'دیرآیئد' افسانہ اور ستمبر 2009ء میں 'عید سروے' معہ تصویر کے ساتھ اور نئے لہجے نئی آوازیں میں 'امیدیں' شائع ہوئے اور پھر وقتاً فوقتاً مختلف تحریریں، افسانے، نظمیں، غزلیں شائع ہوتی رہتی۔ میرے بیٹے فہد غفار نے نئی آوازیں نئے لہجوں میں بھی لکھا۔

2) ہماری دادی اماں نے سب کو یہ کہہ کر سالگرہ منانے سے انکار کیا تھا کہ ہمارے ہاں سالگرہ راس نہیں آتی لہٰذا ہماری سالگرہ کبھی نہیں ہوئی۔

3) دل میں چھپا کے پیار کا طوفان لے چلے
ہم آج اپنی موت کا سامان لے چلے
ذرا دیکھیے تو میاں عاشق کی دیدۂ دلیری ڈر

اور خوف نام کو نہیں ہے بالکل جی انجام کی بھی خبر ہے کہ موت یقینی ہے مگر پھر بھی وہ سوئے منزل رواں ٹک ٹک ٹک...... چلے جارہے ہیں ایسے ہی بے خوف اور نڈر عاشق اپنی محبت کو پا لیتے ہیں۔ پیار میں ڈرپوک اور بزدل لوگوں کا کوئی کام نہیں ہے۔ دوسری پسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ میری شادی کے چند سال بعد میری جٹھانی نے مجھے بتایا کہ تمہارے میاں کی آواز بہت اچھی ہے وہ شادی سے پہلے اکثر دونوں بھائی بہن اور کزنز دسٹرڈے نائٹ کبھی کسی کے گھر کبھی کسی کے محفل سجائی جاتی ہے اور سب اپنی اپنی آواز کا جادو جگاتے ہیں۔ بھئی ہم نے اور ہمارے بہن بھائی نے یہ سنا تو ایک روز بے حد اصرار پر غفار صاحب (مرحوم) نے گانا گایا یہ ہی آپ یقین کریں گے اگر وہ دوسرے کمرے میں گا رہے ہوں تو آپ کو یقین نہیں آتا کہ یہ غفار صاحب کی آواز ہے۔

4) دوشیزہ ڈائجسٹ کے حوالے سے تمام دوشیزاؤں کو بھی پیغام میرے خیالات و جذبات ایک شعر کی صورت میں پیش خدمت ہے۔ امید ہے کہ آپ سب کو پسند آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

تو حرمت ہے تو عزت ہے تو ہے پاکیزگی
اس بات کا تو ہر دم رکھنا خیال

آپ سب کو بہت ہی خلوص اور محبت سے حسبِ مراتب سلام و دعائیں۔ خاص طور پر رضوانہ جی کو منزہ سہام کو اور دیگر اسٹاف کو حسبِ مراتب سلام و دعائیں اللہ رب العزت ہم سب کو اپنی رحمتوں کے حصار میں رکھے شاد و آباد اور سلامت رکھے (آمین)

(نفیسہ سعید)

1) میری پہلی تحریر مہرالنساء اسی سال دوشیزہ کے صفحات کی زینت بنی۔ جس کا مجھے بہت اچھا رسپانس ملا۔ دوشیزہ میں شائع ہونے والے خطوط اور ذاتی طور پر میرے پڑھنے والے ساتھیوں نے باقاعدہ مجھے میسیج کر کے اتنی اچھی کہانی لکھنے پر، مبارکباد دی اور میں ان سب کی تہہ دل سے شکرگزار ہوں جن کی حوصلہ افزائی نے میرے اندر مزید لکھنے کی تحریک پیدا کی۔

2) میری سب سے چھوٹے بیٹے کی پہلی سالگرہ میری زندگی کی یادگار سالگرہ ہے۔ اُس سالگرہ میں آخری بار ہم سب بہن بھائی اکٹھے ہوئے تھے۔ جس کے صرف ایک ماہ بعد میرے چھوٹے بھائی کی ڈیتھ ہوگئی اور پھر ہم سب کبھی کسی موقع پر اس طرح اکٹھے نہ ہوسکے۔

3) کسی نظر کو تیرا انتظار آج بھی ہے' کئی سالوں سے اس گانے کو میری پسندیدگی کی سند حاصل ہے۔ پتا نہیں کیوں آج بھی جب میں یہ گانا سنتی ہوں تو یہ میرے دل کے تاروں کو چھو لیتا ہے۔

4) سب سے پہلے تو دوشیزہ کی ٹیم کو مبارکباد جن کی کاوشوں کے نتیجے میں اتنا خوبصورت رسالہ ہم سب کو پڑھنے کے لیے ملتا ہے اس کے بعد اپنے پڑھنے والے ساتھیوں کے نام ایک پیغام۔

آپ کا اندر کتنا بھی میلا کیوں نہ ہو آپ کے الفاظ اور لہجہ ہمیشہ خوبصورت ہونا چاہیے۔ آپ کا لباس شاندار ہونا چاہیے کیونکہ ہم جس معاشرے کا حصہ ہیں وہاں یہ ہی دو چیزیں انسان کو پہچاننے کی کسوٹی ہیں۔ یقین جانیں آپ کے دل کی خوبصورتی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لوگ صرف آپ کی شریں بیانی سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

(راحت وفا راجپوت)

1) دوشیزہ میں کافی سال پہلے 'رنگ کائنات' میں میری ایک مزاحیہ تحریر چھپی تھی۔ اُس کے بعد باقاعدہ طور پر میری پہلی تحریر ایک افسانہ محبت

جنوری 2015 میں چھپا بہت عرصے سے خواہش تھی کہ دوشیزہ جیسے معیاری رسالے میں میری کوئی تحریر چھپے اور کاشی چوہان صاحب کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میری پہلی ہی تحریر کو اِس قابل سمجھا اور دوشیزہ کے اعلیٰ پائے کے رائٹرز کے ساتھ میرا نام بھی لکھا۔

اُس باغ میں ایک پھول کھلا میرے لیے بھی
خوشبو کی کہانی میں میرا نام بھی آیا

اُس بے ساختہ خوشی کو بہت دنوں تک محسوس کرتی رہی۔ پڑھنے والوں نے میری تحریر کو پسند کیا اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ کہانی کے ساتھ ساتھ میری شادی کو بھی پڑھنے والوں نے سراہا۔ اِس کے بعد میری ہر تحریر چھپنے کے بعد وہی حالت ہوتی ہے جو پہلی بار ہوئی تھی۔

2) میری سالگرہ یکم مارچ یعنی بہار کے دنوں میں ہوتی ہے۔ میرا اسٹار Pisces ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کو بہت محبت ملتی ہے میں بھی محبت کے معاملے میں بہت خوش قسمت ہوں۔ بچپن سے ہی میں اپنے دادا اور پھوپو کی بہت لاڈلی تھی۔ میٹرک کے بعد میں لاہور کے ایک اسلامی ادارے میں عربی کورس کر رہی تھی اور ہوسٹل میں رہتی تھی۔ پہلا موقع تھا کہ میں گھر والوں سے دور تھی اور بہت اُداس تھی۔ یکم مارچ کی صبح منہ اندھیرے ہی ملازمہ مجھے بلانے آئی۔ ہوسٹل کی انچارج بہت سخت مزاج تھیں۔ میں نے سوچا پتا نہیں کیا غلطی ہوگئی ہے۔ ڈرتے ڈرتے اُن کے آفس میں گئی تو سامنے پھوپو جان بیٹھی تھیں بے تحاشا خوشی کے جذبات سے میں رونے لگ گئی۔ وہ میرے لیے نیا سوٹ، جیولری اور کیک لے کر آئی تھیں اور ہوسٹل کی ساری لڑکیوں کے لیے حلوہ پوری کا ڈھیر سارا ناشتہ لے کر آئی تھیں۔ میری وہ سالگرہ میری زندگی کی یادگار سالگرہ بن گئی ہے۔ سب لڑکیوں اور ٹیچرز نے مجھے مبارک باد دی اور تو اور انچارج صاحبہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے مجھے گلے لگا کر مبارکباد دی۔ محبت کی اس عظیم یاد پر آج بھی میری آنکھیں بھر آتی ہیں۔ ہوسٹل میں ناشتا چائے اور پاپے کا ملتا تھا سب لڑکیوں نے مزے سے حلوہ پوری کھائی۔ اس سالگرہ کی یاد آج بھی میرے محبت کرنے والے رشتوں کے نام ہوتی ہے۔

3) ایک انڈین گانا مجھے ہمیشہ سے پسند ہے۔
بابل کی دعائیں لیتی جا، جا تجھ کو سکھی سنسار ملے
میکے کی کبھی نہ یاد آئے سسرال میں اتنا پیار ملے

اِس گانے میں جو درد ہے اور ایک باپ کی بے بسی ہے وہ مجھے جکڑ لیتا ہے۔ میری شادی کی مووی میں رخصتی کے وقت یہی گانا لگایا گیا ہے۔ جب بھی میں یہ گانا سنتی ہوں آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اس میں باپ کی بیٹی کے لیے جو دعا اور آس و امید ہے وہ دل کو چھولیتی ہے۔ میرے ابو اب فوت ہوچکے ہیں۔ یہ گانا مجھے اُن کی یاد دلاتا ہے۔ اسی لیے یہ گانا میرے دل کے قریب ہے۔

4) دوشیزہ ایک گلاب کی مانند ہے جس میں لکھا گیا ایک ایک حرف دلوں کو مہکاتا ہے۔ زندگی کی تلخیوں میں خوشی کا ایک ایسا پل ہے جس سے روح کو تسکین ملتی ہے۔

(رامس تنویر احمد)

1) یہ بھی بھلا کوئی بھول سکتا ہے، گو کہ لکھنے کا آغاز اسی ادارے کے ہی دوسرے جریدے آئیڈیل میں 2005 میں شروع ہوگیا تھا مگر اتفاق دیکھئے کہ وہ جنوری کا ہی مہینہ تھا اور سال تھا 2006 جب دوشیزہ میں میری کہانی شائع ہوئی کہانی کا نام تھا 'میرا فواد"

جو کہ ایک سچے واقعے پر بنی تھی اور مجھے یاد ہے اس مختصر افسانے کو اچھا خاصا رسپانس ملا تھا

2) میرے لئے ہر سالگرہ ہی یادگار رہتی ہے اب شادی کے بعد تو یہ موقعہ اور بھی اسپیشل ہو گیا ہے، ایک کیک بیگم خود گھر پر بناتی ہیں بہت اہتمام سے، ایک کیک آفس والوں کے ساتھ کاٹا جاتا ہے اور ایک ڈیڈ کے گھر پر، سو کہا جا سکتا ہے شادی کے بعد تین سال سے منائی جانیوالی ہر سالگرہ یادگار ہے

3) لو جی یہاں تو صفحات ختم ہو جائیں گے مگر لسٹ ختم نہیں ہوگی کافی سارے ہیں ہاں لیکن لتا منگیشکر کی غزل " مجھے خبر تھی" اور جگجیت سنگھ کی گائی ہوئی غزل "تیرے بارے میں جب سوچا نہیں تھا" اکثر میری playlist میں موجود رہتی ہے

4) دوشیزہ وہ جریدہ ہے جس نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی ہے بلکہ اپنے معیار پر بھی کبھی سمجھوتا نہیں کیا سو میرے لئے یہ جگہ بہت ہی خاص ہے اسی لئے بہت سی دعائیں اسکے لئے، سہام مرزا صاحب اللہ انہیں غریق رحمت کرے انکے لئے ایک شعر یاد آ رہا ہے

وہ اکیلا ہی چلا تھا منزل کی طرف
لوگ ساتھ آتے گئے کارواں بنتا گیا
(مجروح سلطان پوری)

اللہ کرے دوشیزہ یونہی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہے (آمین)

(ندا حسنین)

1) دوشیزہ میں میری پہلی تحریر اکتوبر 2015ء کے شمارے میں چھپی جس کا نام عنوان 'ایک ملاقات' تھا۔ اور الحمد اللہ ادارے کی جانب سے بھی بہت اچھا رسپانس ملا۔ خاص طور پر رضوانہ آپی کی جانب سے اُن کے میٹھے لہجے اور خوبصورت اندازِ گفتگو نے مجھے مزید دوشیزہ کے لیے لکھنے کی تقویت دی۔ یہ تو بات ہوئی ادارے کی قارئین دوشیزہ کی جانب سے بھی میرے افسانے کو بہت پسند کیا گیا اور سراہا گیا۔ اس افسانے پر پسندیدگی کا اظہار اب تک مجھے موصول ہو رہا ہے۔ اور بے شک یہ میرے اللہ کا مجھ پر کرم ہے۔

2) اب تک کی زندگی میں ایسا کچھ تو نہیں ہوا کہ سالگرہ یادگار بن جائے۔ البتہ تین مرتبہ ایسا ہوا کہ میری سالگرہ سرپرائز کے طور پر منائی گئی۔ ایک دفعہ بچپن میں میری مامی نے، ایک دفعہ میرے کچھ دوست احباب نے اور پچھلے سال میرے کزنز نے۔ تو یوں یہ سالگرہیں یادرہ گئیں۔

3) میرے پسندیدہ گانے کون سے...... نصرت فتح علی خان کے سبھی گانے مجھے بے حد پسند ہیں۔ خاص طور پر سانوں ایک پل نہ آئے، غم ہے یا خوشی۔ اور دوسرے بہت سے۔ جگجیت سنگھ کا ہونٹوں سے چھو لو تم، یہ غزل بھی بے حد پسند ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ گانے جب بھی سنو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔

4) دوشیزہ کی سالگرہ پر میری جانب سے ایک پیارا سا ناولٹ اور بہت ہی پُرخلوص دعائیں۔ محترمہ منزہ سہام آپی اور رضوانہ آپی جس محنت سے آپ دونوں خواتین اور آپ کی ٹیم جس محنت سے دوشیزہ کو مزید نکھارنے اور کامیاب بنانے کی کوششوں میں سرگرداں ہیں، میں دعا کرتی ہوں دوشیزہ بہت جلد بہت اعلیٰ مقام پر پہنچے۔ دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہو۔ اور جو مقاصد اور امیدیں آپ نے دوشیزہ سے باندھ رکھی ہیں وہ تمام بخوبی پوری ہوں۔ اور دوشیزہ ہر سال یونہی اپنی ترقی و کامیابی کی منزلیں طے کرتا سالگرہ مناتا رہے آمین۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ کی سینئر لکھاری ''گُل'' کی یاد میں مصنفہ کی کچھ یادیں

راستے میں کچھ ساتھی
رہ بدل بھی جاتے ہیں
پر کبھی نہ ملنے کو
کچھ بچھڑ بھی جاتے ہیں

قلم کا تلوار ہونا تو سُنا تھا لیکن آج قلم کا شہتیر ہونا میں نے خود محسوس کیا ہے۔ اس قدر بھاری کہ اٹھائے نہیں اُٹھ رہا۔ کیسے لکھوں کہ میری دوستی کے باغیچے میں اب گُل نہیں ہے۔ گُل کے بغیر بھی کبھی کوئی باغیچہ ہوا ہے۔

ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا

حکایتِ گُل دراصل حکایتِ دل ہے۔ شاید اسی طور دل کو قرار آ جائے۔ میں خوشیاں بانٹنے پر یقین رکھتی ہوں لیکن آج اپنا دکھ بانٹنے جا رہی ہوں کہ یہ دکھ سانجھا ہے یہ نقصان برابر کا ہے۔ 'دوشیزہ' ہی نے مجھے یہ دوست دی تھی۔ آج اس سے بچھڑنے کا دُکھ بھی دوشیزہ ہی کے ساتھ بانٹنے آئی ہوں۔

97ء کا دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ ہم نے شہر قائد سے اکٹھے ہی جا کر وصول کیا تھا۔ وہ پہلی ملاقات کیا خبر تھی کہ عمر بھر کا سرمایہ بن جائے گی۔ دوستی کی میراث باقی رہ جائے گی اور ان گنت ملاقاتوں کا شاخسانہ ثابت ہوگی۔

میری ذات گُل اور ثمینہ۔ میں تثلیث کی قائل تو نہیں لیکن یہ مثلث میری زندگی کی تقریباً دو دہائیوں پر حاوی ہے۔ زندگی کے اس دور سے، بے خبری کے عالم میں شروع ہونے والی یہ دوستی، جب سود و زیاں کا بارِ گراں رشتوں کو پابند اور مجبور نہیں کرتا ایسی پختہ ثابت ہوئی کہ اس کی تر و تازگی ملاقات کی بھی محتاج نہ رہی۔ برسوں بعد بھی ملے تو باتوں کا سلسلہ وہیں سے شروع ہو گیا۔

زمان و مکان کی قید سے آزاد، غرض اور مجبوریوں سے پرے، ایسا خالص، سچا اور سُچا رشتہ، ایسی دوستی، وہ بھی قحط الرجال کے اِس کنگال دور میں جب کوئی بندہ ہے نہ بندہ شناس۔

گُل اکثر یہ کہتی تھی۔

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

ہماری عمروں میں اس قدر تضاد تھا کہ جب میری شادی ہوئی اور میں بھی رخصت ہو کر گُل ہی

'الوداع'

تم نے جاتے سے
ہم کو دیکھا نہیں
اِک ذرا سی نگاہ
ہم پہ ڈالی نہیں
سانس خاموش کی
الوداع......
بس کہا
اور سو بھی گئے

کاشی چوہان

کے شہر میں آن بسی تو گل نے ایک بار مجھے کہا۔
''میرے گھر والے اس دوستی پر حیران ہوتے ہیں کہ کرنل کی ماں کی لفٹین کی بیوی سے دوستی۔''

اور پھر ایک زندگی سے بھرپور قہقہہ جو گل کا خاصہ تھا۔ دوستی میرے نزدیک جواز کی محتاج نہیں ہوتی۔ مزاج میں کچھ باتیں یکساں نکل آتی ہیں۔ وہ زندہ دل بہت تھی اور میں نے بچپن سے سیدھا بڑھاپے میں قدم رکھا۔ ذہنی ہم آہنگی ایسی ہوئی کہ میں اب تک جب کوئی پھڑکتا ہوا شعر کوئی چلبلا سا لطیفہ اسے Send کرتی تو یہ سوچ کر مسکرا اٹھتی کہ اسے پڑھ کر گل نے پھر وہی قہقہہ لگایا ہوگا۔

آخری آخری ملاقاتوں میں، میں نے گل سے کہا۔ ''گل اتنے زندہ دل انسان کو اس قدر بیمار جسم نہیں ملنا چاہیے تھا۔ فرشتوں سے کوئی Clerical Mistake ہوگئی ہے۔''

صحت نے ساتھ نہ دیا اور عمر نے وفا نہ کی اور ایک گلِ رعنا کو ہم سے چھین لیا وہ جو قدروں، اصولوں اور روایتوں کی چھاؤں میں پروان چڑھی تھی، اور جس نے عمر بھر پاسداری کی سعی میں گزار دی۔ اس کے افسانے شاعری، اس کی باتیں سب خود اس ہی کی طرح سچے اور دل کو چھو لینے والے ہیں۔ زندگی کی تلخیوں کو بھی اس نے گل سی شادابی کے ساتھ شگفتہ لہجے میں بیان کیا، قلم میں سیاہی کی جگہ خونِ جگر بھر کر لکھا۔ جو لوگ زخم ہنس ہنس کر سہہ لیتے نشانوں کی خبر وہ بھی رکھتے ہیں۔

پھر اس کا بھی کیا کیجیے کہ پھولوں کی عمر کم ہوتی ہے۔ بہار جانفزا دکھلاتے ہیں اور پھر جس مٹی سے ان کا خمیر اُٹھتا ہے اُسی مٹی میں مل جاتے ہیں۔ رزقِ زمیں بن جاتے ہیں۔ وہ 'گل' ہی تو تھی۔

یہ برگِ گل ہی تمنا، یہ رہگزاری دھوپ
یہ خوش خرام کھلے سر کہاں چلی آئی

ہاں مگر اس طرح زندگی کو زندہ دلی کے نام کر کے کم ہی لوگ جی پاتے ہیں۔

ماریا تمہارا اپنی ماں کے لیے اس قدر تڑپ کر رونا اور رعنا تمہارا صبر سے ٹھہر ٹھہر کر رونا میرے دکھ کو اور بھی سوا کر گئے۔ میرا وعدہ رہا دوستی کی یہ روایت باقی رہے گی۔ (انشاءاللہ)

میرا رب تمہیں صبر جمیل عطا فرمائے اور گل کو اپنے جوارِ رحمت میں گوشۂ خاص عنایت فرمائے۔ (آمین)

☆☆......☆☆

گل کی یادیں

گل کی یاد میں لکھاری بہنیں اپنے خیالات ارسال کر رہی ہیں۔ جیسے جیسے ہمیں اُن کے نامے ملتے رہیں گے۔ ہم اپنے قارئین تک پہنچاتے رہیں گے۔

مِنی اسکرین

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

م ش خ

قارئین اور ناظرین آپ کی دعا کے زیر سائے ARY ڈیجیٹل نیٹ ورک ترقی کی منازل بہت تیزی سے طے کر رہا ہے اور یہ ہمارے لیے قابل رشک بات ہے۔ ویسے تو اے آر وائی کے کچھ مذہبی پروگرام تو ایسے

ARY ڈیجیٹل کی سیریل ''گزارش'' میں جاوید شیخ، نعیمہ زیدی اور سارہ اشرف

بہت مقدم سمجھتے ہوئے ان کی رائے کا بھرپور احترام کرتے ہیں اور ان کی اصلاحی روشنی کے مدنظر بہتر سے بہتر معیار کے لیے مسلسل کوشاں رہتے ہیں کہ اپنے دل میں کسی تشنگی کو جگہ نہیں دے سکتے ہم پروگراموں اور اپنی محنت کے پل

ہیں جو معلومات کا ایک خزانہ ہیں اور نئی نسل کی نہ صرف یاد دہانی ہوتی ہے ان پروگراموں کو وہ اپنے دلوں کے نہاں خانوں میں چھپالیتے ہیں۔ مذہبی احکامات پر ہمارے ناظرین اور قارئین جس طرح اپنی رائے کا کھل کر اظہار کرتے ہیں بغیر کسی جھجک کے ہم اُن کی تجاویز اور آراء کو

باندھنے کے قائل نہیں ہیں۔ اے آر وائی کو یہ اعزاز ہے کہ اس نے فلسفیانہ' ایمان افروز' معلوماتی ' اخلاقی تقاضوں کے مطابق اپنے پروگرام تشکیل دیے ہیں۔ ناظرین اے آر وائی اور قارئین گرامی آپ کی محبتوں، خلوص، اور چاہت کے ساتھ ایک سال کا سفر تمام ہوا اور

اب 2016ء کا سفر ہو چکا ہے۔ خداوند کریم آپ اس سفر میں لمحہ بالمحہ خوش رہیں۔ کیونکہ جب لفظ رنگوں میں ڈھلتے ہیں تو زندگی کے سارے منظر خوبصورتی سے سمٹ آتے ہیں۔ جس سے جذبات اور احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ 2016ء آپ کے دلوں میں خواہشات کی تکمیل کے لیے امید کے چراغ روشن رکھے اور سارا سال آپ کو بے پناہ محبت اور خراج تحسین ملے اور آپ دعاؤں کے سائے میں رہیں۔

رشتے داروں کے اصرار پر دوسری شادی کر لیتا ہے۔ تاکہ زبیدہ کو ماں مل جائے اور یہی اُس کی بھول تھی اور اُس کی بیوی صفیہ زبیدہ کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کر سکی اور پیسوں کے لالچ میں زبیدہ کی شادی ایک ابنارمل لڑکے سے کرنا چاہتی ہے چونکہ صفیہ مکار، سازشی، لالچی اور انتہائی چالاک عورت ہے۔ صفیہ کی بیٹی نائلہ جو زبیدہ کی سوتیلی بہن ہے۔ زبیدہ اُسے سگی بہنوں کی طرح چاہتی ہے۔ جبکہ صفیہ اُس سے بہت جلتی ہے۔ ظفر زبیدہ سے محبت کرتا ہے جو

ARY ڈیجیٹل کی سیریل ''میرے جیون ساتھی'' میں حریم فاروق اور حسین نیازی

زندگی کے اس سال کو ہنسی خوشی گزاریں پچھلا سال تو گزر گیا اور پھر اس موقع پر شاعر نے کیا خوب کہا۔

میرے روز شب تھے بندھے ہوئے موسموں کی طرح
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا کبھی سال پل میں گزر گیا

آیئے ناظرین اور قارئین آپ سے خوب باتیں ہوگئیں اب چلتے ہیں ARY نیٹ ورک کے پروگراموں کی طرف ARY زندگی سے سوپ 'منزل کہیں نہیں' دیکھا جا رہا ہے۔ اس سوپ کو تحریر کیا ہے اس بخاری نے سوپ کی کہانی مکمل گھریلو ہے۔ زبیدہ بھولی بھالی اور سادگی پسند لڑکی ہے رحمت زبیدہ کا باپ انتہائی شریف انسان ہے جو ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ ہے۔ بیوی کے انتقال کے بعد

اس کے خالہ کا لڑکا ہے۔ کیا صفیہ سوتیلی ماں زبیدہ کی شادی ابنارمل لڑکے سے کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور ظفر زبیدہ سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے یا پھر صفیہ کی بیٹی نائلہ سے شادی کر لیتا ہے۔ ان تمام باتوں کا جواب آپ کو ARY زندگی سے آن ایئر ہونے والے سوپ 'منزل کہیں نہیں' دیکھنے کے بعد ہی ملے گا۔ اس سوپ کے فنکاروں میں شہریار زیدی' عدنان جیلانی' بابر خان' فریال راجپوت' نوید رضا' یاسر رضوی اور سہیل خان قابل ذکر ہیں۔ یہ سوپ ARY زندگی سے پیر سے لے کر جمعرات تک رات 9 بجے دکھایا جا رہا ہے۔ ARY زندگی سے پیش کیے جانے والا سوپ 'ہماری بٹیا' کو

ناظرین نے بہت پسند کیا ہے۔ مانا کہ اس کی کہانی کو ناظرین پسند کررہے ہیں۔ سوپ 'ہماری بٹیا' کے خوبصورت کردار میں فضا کے والد نے بہت خوبصورتی سے روایتی تہذیب کا اظہار کیا ہے اس کی ہدایت ایس حسن عباس کی ہیں جبکہ فنکاروں میں فاطمہ آفندی' فرحت ناز' شائستہ جبیں' فرقان قریشی' حسن عباس' فرقان قریشی' عدنان شاہ ٹیپو' ایم حنیف اور ارشد فاروقی قابل ذکر ہیں۔

یہ سوپ پیر سے لے کر جمعرات تک روزانہ رات 7 بجے دیکھایا جارہا ہے۔ ARY زندگی کے سوپ 'پھلجھڑی' کی کہانی دو سگی بہنوں اور دو سگے بھائیوں کے گرد گھومتی ہے

ARY زندگی کے سوپ

'منزل کہیں نہیں'' میں فریال راجپوت

اس سوپ کی ہدایت افتخار افی تحریر گل نوخیز اختر کی ہے۔ سوپ کے فنکاروں میں اشرف خان' سلمیٰ حسن اور ایمان خان شامل ہیں۔ یہ سوپ ARY زندگی سے جمعہ سے اتوار تک روزانہ رات 7 بجے دکھایا جارہا ہے۔ آیئے اب چلتے ہیں ARY ڈیجیٹل سے دیکھائی جانے والی خوبصورت اور سحرانگیز سیریل کی طرف سیرل 'وصال یار' اسے تحریر کیا ہے۔ آمنہ ریاض نے جبکہ ہدایت عاصم علی کی ہیں۔ یہ سیریل ڈیجیٹل سے رات 9 بجے بروز پیر دیکھائی جارہی ہے۔ اس سیریل کے فنکاروں میں عائشہ خان' شہزاد خان' مریم نواز' حسن نیازی اور سینئر اداکار بہروز

ARY ڈیجیٹل کی سیریل

''وصال یار'' میں عائشہ خان

سبزواری قابل ذکر ہیں۔ سیریل خاتون منزل اس سیریل میں حنا دل پذیر نے کمال کی اداکاری کی ہے۔ اسے تحریر کیا ہے فصیح باری نے جبکہ ہدایت مظہر معین کی ہے۔ اس کے فنکاروں میں قوی خان' بشیر جان نے کمال کی اداکاری کی ہے۔ جبکہ دیگر فنکاروں میں فضیلہ قاضی' ذیبا شہناز' ادی غزل اور پروین اکبر قابل ذکر ہیں۔ یہ سیریل ہر جمعرات کی رات 8 بجے دکھائی جارہی ہے اس موقع پر سیریل' خاتون منزل' کا تذکرہ نہ کرنا زیادتی ہوگی جبکہ سیریل 'میرے جیون ساتھی' کو تحریر کیا ہے۔ مہا ملک نے جبکہ ہدایت عبداللہ بدنی کی ہیں۔ اس کے فنکاروں میں یمی پاشا' وسیم عباس' صبا حمید' مریم فاروق اور حسن نیازی قابل ذکر ہیں۔ یہ سیریل ہر جمعرات کی رات 9 بجے دکھائی جارہی ہے۔ سیریل 'اعتراض' ہر منگل کی رات 8 بجے دیکھائی جارہی ہے۔ سیریل 'گزارش' ہر منگل کی رات 8 بجے دیکھائی جارہی ہے۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت دیں' خوش رہیں آپ لوگ۔

☆☆......☆☆

ناول
رفعت سراج

دامِ دل

قسط 12

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کردیں گی' رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

عطیہ بیگم مرگ ناگہانی کے صدمے سے نڈھال تکفین وتدفین کے جگر پاش مرحلے پھر غم گساروں کے ہاتھوں بچی کھچی توانائی فروخت کر کے آنکھیں مونڈے یوں لیٹی تھیں گویا خود بھی موت سے مانوس ہونے کی کوشش کر رہی ہوں ان کی بے خبری کا یہ عالم تھا کہ انہیں چمن کی آمد یا قدموں کی چاپ بھی نہ چونکا سکی۔ چمن نے چند ثانیے خاموش ماتمی چہرہ دیکھا۔ پھر گود میں سوئی بچی کو احتیاط سے سنبھالا اور دبے قدموں واپس پلٹ آئی مگر باہر نکلنے سے پہلے پلٹ کر ایک بار ضرور دیکھا مبادا آمدن کا پتا نہیں چلا تو رفتن نے کچھ اثر کیا ہو مگر وہ ایک کھینچی ہوئی تصویر کی طرح اسی انداز میں نظر آئیں۔

چمن لاؤنج میں آئی تو بری طرح چونک گئی سامنے یاور صوفے پر مہ پارہ کے ساتھ نظر آیا جو اس کی گود میں سو چکی تھی۔ یاور بھی یوں اچانک چمن کو سامنے دیکھ کر گڑبڑا سا گیا۔ سوگئی ہے...... آپ اسے میرے بیڈروم میں لٹا دیں...... چمن نے بے تاثر لہجے میں سوئی ہوئی مہ پارہ پر نظر جما کر کہا اور یاور کی طرف دیکھنے سے احتراز کیا۔

آپ کے بیڈروم میں......؟ یاور بری طرح الجھ گیا...... ظاہر ہے اس وقت وہ اپنے گھر میں نہیں تھی۔

جی...... وہ سامنے میرا بیڈروم ہے اور اس کے برابر والا آپا کا...... یہ کہہ کر اس نے رُک کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میری اور آپا کی شادیوں کے بعد بھی ہمارے بیڈروم آج بھی اسی حالت میں ہیں جس حالت میں ہم نے چھوڑا تھا...... پاپا نے تو گلدانوں کے پھول تک Change نہیں کیے...... آپ نے تو شادی کے بعد کبھی یہاں رات نہیں رکے ورنہ آپ کو پتا ہوتا۔ چمن کے لہجے میں لاشعوری طور پر تلخی اتر آئی...... یاور سے مخاطب ہو کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی سنگین وارداتوں میں مطلوب مجرم سامنے بیٹھا ہو...... اور طویل Charge Sheet ہو مگر ثبوت کوئی نہ ہو جسے شک کا فائدہ دے کر کسی بھی وقت بری کیے جانے کا احتمال رہتا ہو۔

جبکہ دکھ نے توجہ میں وہ ارتکاز پیدا کیا ہوا تھا کہ برزخ سے ایمن کی آواز آ رہی تھی۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
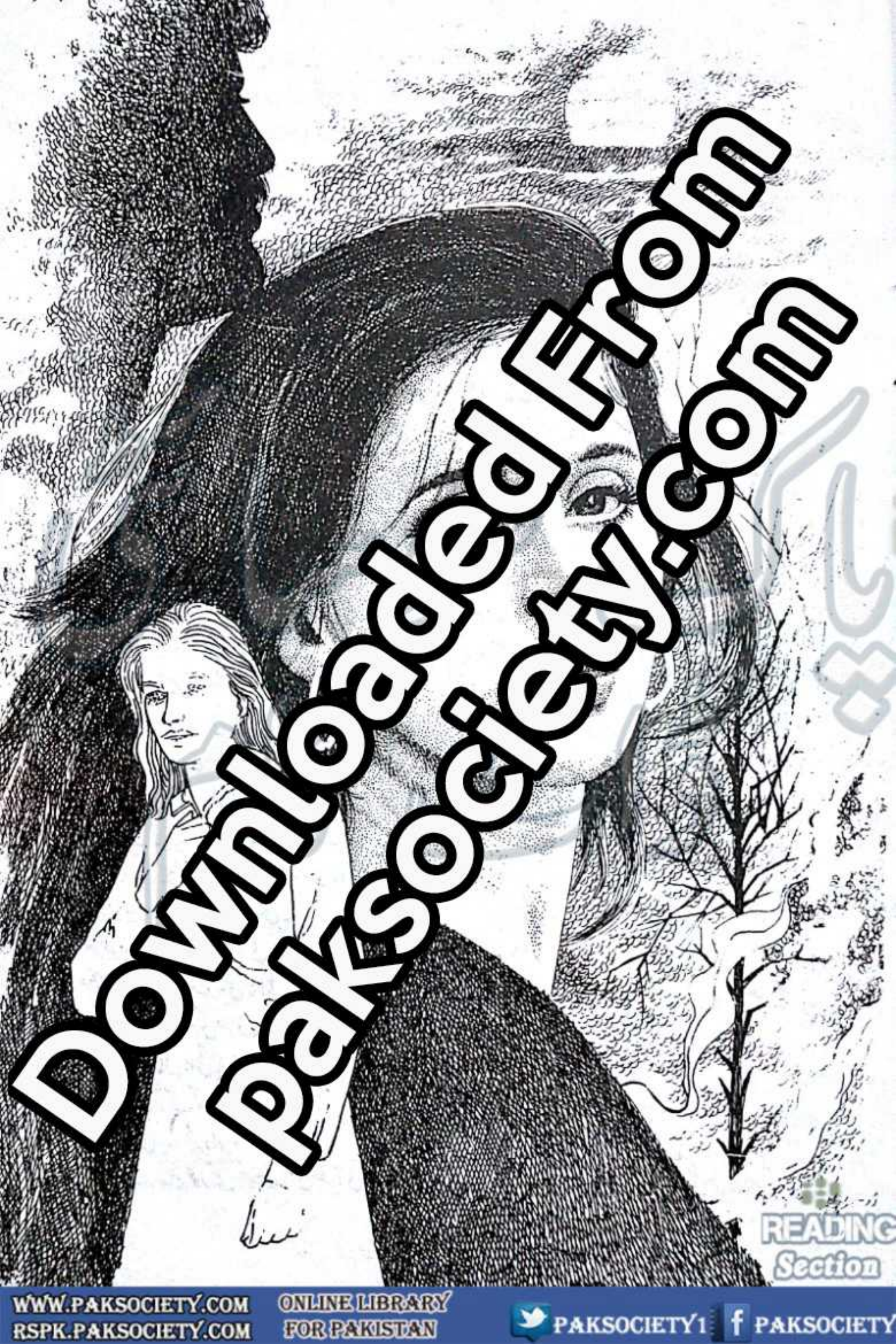
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

نہیں شادی کے شروع دنوں میں کئی مرتبہ یہاں رُکا ہوں...... رات زیادہ دیر ہو جاتی تھی انکل اور آنٹی روک لیتے تھے یاور نے جلدی سے جواباً کہا اور مہ پارہ کو محتاط انداز میں سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

آپ نے تیسری بیٹی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا...... میرا خیال ہے آپ نے تو شاید اسے ابھی تک دیکھا ہی نہیں...... چمن کے زخم کا ایک ایک ٹانکہ کھل رہا تھا...... اسے کھولن اس بات پر تھی کہ یہ شخص جس نے اس کی بہن کی آنکھوں میں کبھی آنسو خشک نہیں ہونے دیے آج دنیا کو دکھانے کے لیے یہاں کیوں رک گیا ہے۔

یہ تو بہت چھوٹی ہے...... صرف چند دن کی...... اتنے سے بچے کو تو اپنے ماں باپ کی بھی پہچان نہیں ہوتی...... یاور گڑبڑا کر یونہی بول پڑا۔

ماں باپ کو تو اپنے بچے کی پہچان ہوتی ہے...... چمن نے برجستہ کہا۔

نہیں بس وہ ہاسپٹل میں ایمرجنسی میں چلتی رہی پھر...... آج وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔ قبرستان میں ہی اچھی خاصی شام ہو گئی تھی...... یاور نے بہت محتاط جواب دیا۔ چمن کی نظریں کمانوں پر کھینچے ہوئے تیروں سے کم نہ تھیں۔ پھر بھی اس نے بڑی حاضر دماغی سے بھرپور غمگین شکل بنانے کی حسب توفیق کوشش ضرور کی...... بچیوں کے بارے میں بھی کچھ سوچا ہوگا چمن نے یاور کی طرف پھر بڑے تیکھے پن سے دیکھا۔

Definitely فی الحال تو یہیں رہیں گی...... آنٹی سے زیادہ بہتر دیکھ بھال کوئی نہیں کرسکتا...... امی کو تو اکثر Joints pain کی شکایت رہتی ہے زیادہ Tens ہونے سے B.P شوٹ کر جاتا ہے لیکن اس پر بھی سوچتے ہیں فی الحال تو یہ یہیں رہیں گی یاور نے بغیر لگی لپٹی کے صاف صاف جواب دیا۔ کیونکہ اسے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وقت رخصت تینوں بچیاں اس کے گلے نہ ڈال دی جائیں اور تین بچیوں کے ساتھ وہ فردوس کے سامنے جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ دکھ سے چمن کا کلیجہ شق ہونے لگا۔ ماں سے محروم بچیاں زندہ باپ سے بھی محروم ہونے جارہی تھیں، معجزاتی طور پر اگر یاور بچیوں کو ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر بھی کرتا تو چمن اور عطیہ بیگم کسی صورت بچیاں اس کے حوالے نہ کرتیں جن بچیوں کی وجہ سے فردوس نے ایمن کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ اس شقی القلب فردوس کے حوالے بچیاں کسی صورت نہیں کی جاسکتی تھیں۔ چمن ایک تو احمقانہ امید کی سرکشی کی وجہ سے پوچھ بیٹھی تھی کہ شاید باپ میں کچھ تو انسانیت نظر آئے۔ دل کو باد نسیم کے جھونکے جیسا ہلکا سا قرار ملے کہ اس شخص نے کسی کرشماتی لمحے میں اس کی بہن کو کوئی روحانی خوشی بھی دی ہوگی...... جو وہ دل کی کتاب میں پھول پتی کی طرح رکھ کر برزخ میں لے گئی ہوگی۔

مگر لمحوں میں اچھی خاصی تسلی ہوگئی......

مشکور احمد کی ہنرمند بیٹی نااہل کے ہتھے چڑھ گئی...... بہرحال یقین کرنا پڑا یاور بیٹی کو ایک بوجھ کی طرح اٹھائے اس کے بیڈ روم کی طرف جارہا تھا جس طرف چمن نے اشارہ کیا تھا۔

بے قدراں نال لائی یاری
تے لٹ گئی تڑک کرکے
ہوشیار باش...... خبردار...... خبردار......

دنیا میں کچھ صابر عورتیں ہمیشہ راضی نظر آتی ہیں صرف ایک بار روٹھتی ہیں پھر ستم ظریف دنیا کی طرف مڑکر

نہیں دیکھتیں۔
خودیاری نہیں توڑتیں اللہ خود بے قدروں کے شکنجے سے انہیں آزاد کرتا ہے......اور یاریاں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتی ہیں۔
چمن اپنی جگہ ایستادہ تھی، بچی فرشتوں سے مسکراہٹ کا تبادلہ خیال کر رہی تھی...... برزخ کے نقرئی دریچے سے ایمن اپنی بیٹی کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی......
آج بہت سے لوگ اس کا نام لے کر روئے تھے......
اور آج ہی وہ مدتوں بعد جی بھر کر مسکرائی تھی۔ چمن کی نظر یاور کی پشت پر جمی تھی......
بیوی کی موت......کہنی کی چوٹ......کل ہی کہیں ہار پھول پہن کر بیٹھ جائے گا جو اس کی زندگی میں ہی دوسری شادی کے لیے آمادہ نظر آتا تھا......اس نے گہری سانس لی اور سوئی ہوئی بچی کا رخسار آہستگی سے چوم لیا۔

☆......☆......☆

جوان موت کا غم ہے...... ماں باپ کو آہستہ آہستہ ہی صبر آئے گا......مگر بیٹا ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ بانو آپا کو ہزار اندیشوں نے بے حال کیا ہوا تھا سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ اس نازک موڑ پر چمن ثمر کو تین بچیاں تحفے میں نہ دے دے۔ اس وقت تو اس کی بات میں بہت وزن آسکتا تھا کہ بے ماں کی بچیوں کو کون سنبھالے گا جبکہ اس گھر میں تو سرے سے کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔
ثمر کو فائلوں کے ساتھ لاؤنج میں اپنے حساب سے مصروف پایا تو جھٹ پاس آ بیٹھیں اور سب سے پہلے اپنی انسان دوستی اور رقیق القلبی کا مظاہرہ کیا تاکہ سخت بات سے پہلے بیٹے پر ماں کا اچھا بلکہ بہترین امپریشن نقش ثبت ہو جائے۔
جی امی...... یہ تو ایسا حادثہ ہے جس نے سب ہی کو چونکا کر بلکہ ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ثمر نے بھی ہمدردی اور دکھ کے تاثرات کا اظہار کیا۔
اللہ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ (آمین) بیٹی ہو یا بیٹا اولاد تو اولاد ہی ہوتی ہے بانو آپا نے پانی پر پُل باندھنے کے لیے تختے ترتیب دینا شروع کیے۔
جی امی...... آنٹی تو بار بار بے ہوش ہو جاتی ہیں...... ان کو سنبھلنے میں کافی وقت لگے گا...... ثمر نے افسوس بھرے لہجے میں کہا اور ایک اور فائل اٹھا کر کھولنے لگا بانو آپا بنظر غائر اس کی مصروفیت جانچ رہی تھیں...... کیونکہ بعض اوقات سامنے والے کی مصروفیات کی نوعیت سے بھی کہی ہوئی بات بے اثر ہو جاتی ہے۔
توجہ سے اثر مشروط ہوتا ہے۔
ہاں......وقت سے بڑا مرہم کوئی نہیں...... آہ......ہا......
یاور کے ماں باپ تو ظاہر ہے بچیوں کی وجہ سے اس کی دوسری شادی میں جلدی کریں گے اور کرنا بھی چاہیے ......سوتیلی سہی...... ماں تو ماں ہی ہوتی ہے اور بچیوں کے سر پر ایک عورت کا ہاتھ ضرور ہونا چاہیے۔ بیٹی ذات بہت بھاری ذمہ داری ہوتی ہے ذرا سی اونچ نیچ ہو جائے تو خاندان کو بٹہ لگ جاتا ہے اب بانو آپا نے خوف و ہراس کی فضا تیار کی۔

جی امی...... ثمر کو چنداں دلچسپی نہیں تھی کہ پوچھے یہ اونچ نیچ کا کیا مطلب نکلتا ہے۔ چمن تو ہمدردی میں بچیوں کی ذمہ داری لے سکتی ہے...... مگر ہم نہیں...... بانو آپا نے اب کارڈ پھینکنا شروع کیے۔

کیسی باتیں کر رہی ہیں امی...... ماشاء اللہ تین تین بچیاں...... کوئی مذاق ہے...... ان کا باپ موجود ہے...... دادا دادی، نانا نانی موجود ہیں ہم کون ہوتے ہیں؟ ثمر نے ماں کی بات کو کو بہت ہلکا لیا اور ہوا میں اڑا دیا......

تمہاری بات دوسری ہے میں چمن کی بات کر رہی ہوں...... بہن I.C.U میں تھی تو بچی اٹھا کر یہاں آ گئی تھی...... ارے اس کی دادی کو دے کر آتی...... ان کے بیٹے کی اولاد ہے...... وہ پالیں...... کیوں...... غلط کہہ رہی ہوں میں......؟

مدعا فرما کر اختتام پر انہوں نے بیٹے کی صوابدید کو للکارا۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... Impossible...... ثمر نے قطعی فیصلہ کن انداز میں پر بانو آپا نے کھل کر سکون کا سانس لیا۔

دو چار دن کے لیے بھی اجازت نہ دینا...... ایک مرتبہ آ گئیں تو تمہارے گلے کا ہار بن جائیں گی...... خالہ کی عادی ہو گئیں تو زندگی بھر بھگتنا...... بانو آپا نے اس جنرل یا سپہ سالار کی طرح ثمر کا مورال بلند کرنے کی کوشش کی جو خراب اور مخالف موسم میں سپاہیوں کو جنگ کے لیے پرجوش کرتا ہے۔

کیسی باتیں کرتی ہیں امی جان...... کوئی مذاق ہے کیا...... میں تو ایک گھنٹے کے لیے Allow نہیں کروں گا...... ثمر نے دوٹوک جواب دیا۔

بانو آپا کے تو رگ و ریشے میں تراوٹ اتر گئی۔ یوں گویا کہ جھلستی رات کے بعد جب نور کے تڑکے ٹھنڈی نرم ہوا بدن کو چھو کر حواس کو شگفتہ کرتی ہے۔

اب مزید نشستن کی چنداں ضرورت نہیں تھی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں...... جوڑوں کا گمشدہ درد گویا یاد آنے لگا۔

اے ہاں...... وہ میری کیلشیم کی گولیاں ختم ہو گئی ہیں...... کل یاد سے لیتے آنا ورنہ پھر جوڑ جوڑ دکھنے لگے گا...... چلنا پھرنا دوبھر ہو گا......

لگے ہاتھوں بیٹے کو یاد دلایا کہ وہ زیادہ چلنے پھرنے کی سکت نہیں رکھتیں خدمت کے لیے بیوی کو پاس رکھو...... یا دوسری لے آؤ......

☆......☆......☆

نوزائیدہ بچی جسے ابھی تک کوئی نام نہیں دیا گیا تھا۔ گہری نیند میں سو چکی تھی اور چمن کے دائیں پہلو میں لیٹی تھی جبکہ بائیں طرف مہ پارہ تھی جس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا اس کے برعکس مہ وش مغرب کے بعد ہی لاؤنج میں صوفے پر لڑھک گئی تھی۔ شاید وہ کچھ سمجھدار تھی اور نانی خالہ کے ساتھ روئی بھی بہت تھی۔

رونا بھی ایک مشقت ہی ہے۔

رونے کے عمل میں سارے حواس مشقت اٹھائے ہیں۔ خون کا ایک ایک خلیہ آنسوؤں کی تیاری میں بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔ آنسو کسی جگہ جمع نہیں ہوتے کہ بوقت ضرورت نکال کر کام میں لایا جائے...... یہ تو دل کے

سب سے نرم گوشے میں ان واحد میں ایک ضرب کاری تخلیق ہوتے ہیں اور آنکھوں کے راستے باہر دوڑ لگاتے ہیں جتنی شدید ضرب کاری ہوتی ہے اتنی ہی تعداد میں تیار ہوتے ہیں۔ رسید وترسیل بلا وقفہ ہوتی ہے جیسے جب بادلوں کو برسنے کا حکم ملتا ہے تو قطرات ان واحد میں جھڑی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

اس مشقت کے دوران کوئی اور کام نہیں ہو سکتا...... یہ اس مزدور کی مشقت سے بڑی مشقت ہے جو آٹھویں منزل پر آٹھ مرتبہ سامان چڑھاتا ہے۔

نرم و نازک بچی اتنی مشقت اٹھانے کے بعد نیم بے ہوشی کے انداز میں سو چکی تھی اب صبح سے پہلے اٹھنا محال تھا۔

مگر مہ پارہ حیرت کے سراب میں سیر کناں تھی...... عظیم حیرت کا اور نیند کا آپس میں اینٹ گتے کا بیر ہے حیرت کی آمد نیند کی رفت ہے۔

چمن نے پٹ پٹ چھت کی طرف گھورتی مہ پارہ کا رخسار چوم لیا۔

سو جاؤ بیٹا...... سب سو گئے ہیں۔

خالہ جب سو جاتے ہیں تو اللہ میاں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ پھر واپس نانو کے پاس نہیں آتے۔ مہ پارہ نے از حد معصومیت سے جواب دیا...... گویا وہ سونے کے عمل سے خوفزدہ تھی۔

یہ آپ سے کس نے کہا بیٹا...... چمن نے پریشان ہو کر پوچھا......

ماما سو رہی تھیں تو سب کہہ رہے تھے وہ اللہ میاں کے پاس چلی گئیں۔ ماما تو روز ایسے ہی سوتی تھیں روز تو اللہ میاں کے پاس نہیں جاتی تھیں......

چمن نے بے اختیار اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر بھینچ لیا...... جی چاہا نے سرے سے تڑپ کر روئے...... مگر اب محل نہ تھا...... اُس نے بمشکل خود پر کنٹرول کیا خالہ ہمیں بھائی نہیں چاہیے بھائی لینے گئے تو اللہ میاں کے پاس جانا پڑتا ہے۔ میں اللہ میاں سے دعا کروں گی ہماری ماما کو واپس بھیج دیں...... ہمیں بھائی نہیں چاہیے یہ جو چھوٹی سی Doll ہے ناں جو ہاسپٹل سے آئی ہے یہی صحیح ہے۔ بچے عین فطرت پر ہوتے ہیں۔

فطری بات کرتے ہیں...... فطرت قدرتی نظاروں کی طرح بچوں کے ذریعے بھی اپنی بھرپور ترجمانی کرتی ہے......

سچے موتی جیسا ایک ایک حرف آنسوؤں کا آبشار تخلیق کرنے لگا۔

☆......☆......☆

ثمر نے ہلکا پھلکا ناشتہ خود ہی بنا لیا تھا۔ ایک باؤل میں Cereal اور ایک کپ چائے۔ اس نے صبح سویرے ہی یہ کام کر لیا تھا اس سے پیشتر کہ بانو آپا اس کے ناشتے کا تردد کریں۔ پھر بہت بہت آرام سے تیار ہو کر آفس چلا آیا۔ آفس پہنچتے ہی کہ چونکا دینے والی خبر اس کی منتظر تھی ہوائیوں کہ جیسے ہی اس نے نشست سنبھالی عمیر ایک تہہ شدہ کاغذ لیے حاضر ہو گیا اور ثمر کے سامنے رکھ دیا۔

یہ کیا ہے ثمر نے کاغذ اٹھاتے ہوئے نظر اٹھا کر عمیر کی طرف دیکھا۔

مس ندا کا Resigination ہے سر...... عمیر نے مودبانہ جواب دیا۔

مس ندا نے Resign کر دیا ہے...... اچانک...... آپ کی ان سے کوئی بات ہوئی......؟

کیا وجوہات ہیں......؟ ثمر ذہنی طور پر الجھ گیا تھا...... کیونکہ وہ اس گھر میں بیٹھ کر اس گھر کے حالات کا جائزہ لے چکا تھا اب تو ندا کے نانا بھی گھر آ گئے تھے پھر کیا ہوا......؟ یہاں پر آ کر سوچ خود بخود رک گئی تھی۔

سر ندا کے نانا جان Paralyse ہو گئے ہیں...... ظاہری بات ہے وہ ان کو چھوڑ کر آفس کیسے آ سکتی ہیں۔ عمیر کے جواب سے ادھوری تصویر فوراً مکمل ہو گئی۔

کچھ پتا ہے...... ندا کے نانا گھر پر ہیں یا کسی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں......؟ ثمر نے پوچھا...... کیونکہ اس کے پاس لے دے کے عمیر ہی ایک ذریعہ تھا جس سے کچھ خبر مل سکتی تھی۔

جی وہ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں لیکن مجھے یہ نہیں پتا کہ کس ہاسپٹل میں ہیں عمیر نے سوال کا جواب اور ضمنی سوال کا جواب پیشگی دے دیا۔

او کے...... او کے...... کوئی مسئلہ نہیں...... آپ جا سکتے ہیں ثمر نے الجھے الجھے انداز میں کاغذ کھول کر متن پر نظر دوڑاتے ہوئے عمیر کو آزاد کیا۔ جیسے اخلاقیات نے پابند کیا ہوا تھا۔

عمیر اجازت پاتے ہی چلا گیا۔ ثمر نے سطروں پر نظریں دوڑانا شروع کیں۔

Termination سے ڈرنے والی نے خود ہی معذرت کر لی...... ثمر زیر لب مسکرایا اور گہری سانس لے کر اپنا سیل فون اٹھا لیا...... اور ندا کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆......☆......☆

نانا جان ان حکیم صاحب کو تو ہاسپٹل کے نام سے ہی نفرت ہے۔ اب یہاں ہمارے سر پر کیوں سوار ہیں......؟ حکیم صاحب نے کچھ دیر کو کمرہ چھوڑا تو ندا جیسے پھٹ پڑی۔ یاد ہی نہ رہا کہ نانا کان کو اب بات کرتے ہوئے بہت دقت پیش آ رہی ہے۔ ندا کا جملہ سن کر وہ حکیم صاحب کی شان میں گستاخی برداشت نہ کر سکے اور پھٹ پڑنے کو بے تاب ہو گئے مگر وائے بدنصیبی شعلہ بیانی چنگاری میں تبدیل ہو چکی تھی اور چنگاری بھی وہ جو بجھنے سے پہلے ٹمٹماتی ہے بے بسی سے اپنا دایاں ہاتھ بیڈ پر مارا اور ندا کو غصے سے گھور کر رہ گئے۔

اسی وقت ندا کے سیل فون پر رنگ ہونے لگی۔ ندا ٹرالی پر دواؤں کی شیشیاں ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ Ring کی آواز سن کر چونک پڑی۔ سوچ آئی کہ کس کا فون ہو سکتا ہے شبیر حسین کا اعصابی نظام تقریباً مفلوج ہو چکا تھا ورنہ Ring کی آواز پر وہ ضرور چونکتے وہ آوازیں سن کر نہیں چونک رہے تھے مگر تاثرات سے سب کچھ محسوس کر رہے تھے ہاسپٹل آتے ہی ندا نے شبیر حسین کے بڑے بیٹے جو امریکہ میں تھے۔ ان کو فون کر کے بتا دیا تھا جس پر انہوں نے ندا کو ہدایت کی تھی کہ وہ ان کو بہترین ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرائے اور اپنا اکاؤنٹ نمبر بھیجے وہ اسے چوبیس گھنٹے میں دو ہزار ڈالرز پاکستانی روپے بھجوا دیں گے۔

برصغیر کے باشندوں کا یہی مزاج ہے...... مردہ پرستی اور قریب المرگ انسان کو بہت اہمیت دیتے ہیں...... اور اس موقع پر ثواب کمانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

اسی وجہ سے ندا نے بے فکر ہو کر ریزائن بھی کر دیا کہ اب تو دو ہزار ڈالرز آ رہے ہیں اب اسے کیا پتا تھا کہ دو لاکھ تو ہاسپٹل میں ایسے اٹھ جاتے ہیں جیسے محلے میں بتاشے بٹتے ہیں۔

ثمر کا نام دیکھ کر انہوں نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

جی سر...... بس یہ تو ہونا ہی تھا...... بار بار تو بے ہوش ہو جاتے تھے...... اچھا ہی ہوا کہ اب خاموشی سے

ہاسپٹل آ گئے چل پھر نہیں سکتے۔ کم سے کم ڈھنگ سے علاج تو ہو جائے گا...... اللہ جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے اگر فالج نہ ہوتا تو علاج کیسے ہوتا؟ وہ اپنے فطری بے ساختہ انداز میں بولتی چلی گئی۔

ثمر نے دوسری طرف سنتے ہوئے گویا اپنا سر ہی پیٹ لیا تھا......

نانا Paraliset ہو گئے اور وہ شکر کر رہی تھی۔

سب شور دور ختم ہو گیا...... سکون سے لیٹے ہوئے ہیں...... اب آپ دیکھیے گا بالکل ٹھیک ہو جائیں گے انجیکشن پر انجیکشن لگ رہے ہیں وہ بہت وثوق سے بتا رہی تھی جیسے ہاسپٹل پہنچ کر اسے تمام الجھنوں سے نجات مل گئی ہو۔ آپ کس ہاسپٹل میں ہیں......؟ ثمر نے پوچھا استعفے کا ذکر جان بوجھ کر نہیں کیا اگر ذکر کر دیتا تو وہ دو پیراگراف پڑھے بغیر سانس نہ لیتی۔

آپ آ رہے ہیں سر......؟ آ جائیں...... یہ ہاسپٹل بہت اچھا ہے ہر طرح کی فسیلٹی ہے میں نے پرائیویٹ روم لیا ہے ظاہر ہے نانا جان کے پاس مجھے ہی رکنا ہے۔ اٹینڈنٹ کے لیے الگ سے بیڈ ہے واش روم بھی بہت بڑا ہے، لیدر کے صوفے ہیں عیادت کے لیے آنے والے بہت دیر تک آرام سے اس روم میں بیٹھ سکتے ہیں چائے کافی بھی بنا سکتے ہیں...... ڈونٹ وری......

وہ ثمر کو یوں تسلی دے رہی تھی جیسے کسی مہمان کو دعوت پر انوائٹ کر رہی ہو ثمر یہ سب سن کر ایک ذہنی خلجان میں مبتلا ہو گیا...... وہ تو کسی مہنگے ترین ہاسپٹل کا نقشہ کھینچ رہی تھی۔

آپ نے کتنا Deposite جمع کرایا ہے......؟ ثمر نے ذرا ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ابھی تو ففٹی تھاؤزینڈ جمع کرائے ہیں...... ٹین تھاؤزینڈ کی میڈیسن آئی تھیں وہ بڑی معصومیت سے تفصیل بتا رہی تھیں۔

آپ کے پاس اتنے پیسے تھے......؟ ثمر نے متردد ہو کر پوچھا...... مجھے پتا تھا کہ نانا جان کیش کہاں رکھتے ہیں اس لیے جب میں نے تلاشی لی تو تین جگہ سے پیسے ملے ایک لاکھ گیارہ ہزار...... میں تو حیران رہ گئی اتنے سارے پیسے نانا جان نے چھپا کر رکھے ہوئے تھے مجھے تو کہتے رہتے تھے پیسے ہی نہیں ہیں...... تمہارے ماموں نے ابھی تک پیسے نہیں بھجوائے آگے بہت مشکل ہو جائے گی...... وغیرہ...... وغیرہ وہ اب کوفت بھرے لہجے میں گویا ہوئی لیکن اتنے پیسوں میں ہاسپٹل کا خرچ پورا ہونا مشکل ہے اس ہاسپٹل میں آنے کا مشورہ آپ کو کس نے دیا تھا......؟ ثمر نے آنے والی مشکل کو مدنظر رکھ کر بات کر رہا تھا۔

ڈونٹ وری سر...... ماموں جان آج ٹو تھاؤزینڈ ڈالرز بھجوا رہے ہیں...... ہو جائے گا علاج...... کوئی بائی پاس تو تھوڑا ہی ہو رہا ہے جو دس پندرہ لاکھ لگیں گے...... شکر ہے کہ نانا جان اسٹرونگ ہے ورنہ بہت خرچہ ہوتا لگے ہاتھوں اس نے جلدی سے شکرانہ بھی ادا کر لیا۔

اور اگر پیسے آنے میں دیر ہو گئی......؟ وہ فکرمندی سے بولا...... حالانکہ اسے اتنا حساس ہونے کی مطلق ضرورت نہیں تھی مگر اس بے وقوف و معصوم سی لڑکی کو بے یار و مددگار چھوڑنے پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی تھی۔

تو ماموں جان کے کہنے پر ان کو یہاں لائی ہوں...... نانا جان بے ہوش ہو گئے تو میں نے آپ کو اتنا فون ملایا کہ کیا بتاؤں...... مگر ہر مرتبہ پاورڈ آف ملا۔ پھر مجبوراً حکیم صاحب کو ہی بلانا پڑا...... انہوں نے ایمبولینس منگوائی تو وہ لوگ خود ہی اٹھا کر ہاسپٹل لے آئے......

اوہ...... ثمر نے گہری سانس لی...... ایمن کی تدفین کے مراحل سے گزرتے ہوئے اس نے فون آف کر کے

چمن کے پاس رکھوا دیا تھا کیوں کہ ایسے موقعوں پر کبھی کبھی لوگ اپنے قیمتی سیل فون سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔
لیکن ثمر نے ندا کو وضاحت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔
اوہ...... ہاں بس کسی وجہ سے فون میرے پاس نہیں تھا...... یہ بتایئے آپ کے نانا جان کی طبیعت کیسی ہے؟ ثمر نے اخلاقی فرض کے طور پر سوال کیا۔
جی بس...... ابھی تو کوئی خاص فرق نہیں ہے مگر ہوش میں ہیں اور بالکل خاموش ہیں ان کی خاموشی سے میرا دل گھبرا رہا ہے ان کی چیخ پکار سننے کی پکی عادت جو پڑ گئی ہے ندا نے اپنی حالت راز کے ساتھ ساتھ اپنی عادت کا بھی شکر کیا اختصار سے بات کرنے کی بھی عادت جو نہیں تھی۔
سر آپ آئیں گے ناں......؟ اب دیکھیے ناں...... ہمارے رشتے دار تو یہاں ہیں نہیں پڑوس والی آنٹی ہمارے گھر کی دیکھ بھال کر رہی ہیں میں اتنے دم اکیلی کیا کروں گی مجھے تو زیادہ سونے کی عادت بھی نہیں ہے ...... پتا نہیں یہاں کب تک رہنا پڑے آپ کی مورل سپورٹ کی ضرورت تو ہے ناں...... ندا نے پھر طومار باندھی......
Sure...... آپ پریشان نہ ہوں مجھے جب بھی موقع ملا چکر لگا لوں گا...... ثمر نے خاطر جمع کے ضمن میں جواب دیا۔
تھینک یو سر...... آپ یہ نہ سوچیے گا کہ اب میں جاب نہیں کر رہی تو میرا آپ سے تعلق ختم ہو گیا۔ میں ہمیشہ آپ کو مس کروں گی آپ نے آفس میں مجھے جس طرح برداشت کیا ہے یہ آپ ہی کی ہمت ہے آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی کس مجھے Terminate کر دیتا ندا نے اب بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔
ثمر چونک پڑا۔
اس کا مطلب ہے وہ بے وقوف نظر آتی ہے، بے وقوف ہے نہیں۔ کم سے کم اسے اپنے باس کی ''Labour'' کا احساس تو ہے۔
Not at all...... آپ اس طرح نہ سوچیں...... بہر حال آپ محنت سے کام کرنے کی کوشش کرتی تھیں جو نظر بھی آتی تھی۔ اپنا خیال رکھیے اور نانا جان کا بھی۔
ثمر نے اپنی طرف سے بات سمیٹی کہ دوسری طرف سے تو امکانات ہی نہیں تھے۔ خدا حافظ......
خدا حافظ کہہ کر اس نے فوراً کان سے موبائل ہٹا لیا اس پیشتر مزید ایک منٹ کی درخواست کی جاتی۔

☆......☆......☆

دور کے رشتے دار بھی آتے ہیں تو تسلی دلاسے کو کچھ کہتے ہیں۔ میں نے تو دیکھا نہیں مگر سنا ہے ایمن کی ساس آئی تھیں۔
امی...... اب بس بھی کریں...... انہیں تو سرے سے آنا ہی نہیں چاہیے تھا مگر دنیا دکھاوے کے لیے آنا پڑا ہوگا...... میری بہن کو I.C.U میں چھوڑ کر ہزار باتیں سنا کر چلے گئے۔ جو پیدا ہوئی تھی وہ ان کے بیٹے کی اولاد تھی...... آپا جہیز میں لے کر نہیں گئی تھیں۔ اب ہمارا ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں...... ہمارے لیے وہ آپا سے پہلے مر گئے تھے۔
نہ ان کو یاد کریں نہ ان کا ذکر کریں...... آپ کیا سمجھ رہی ہیں یاور بھائی رات کو رُک گئے تھے۔ اب وہ دوبارہ

آئیں گے......ان کی ماں آنے دے گی۔ نیا دن چڑھا سورج تپنے لگا تو چمن ماں کو بے رحم حقیقتوں سے سامنا کرنے کا حوصلہ دینے لگی۔ یوں بھی موت ایک حادثہ ہوتی ہے ایک دکھ بھری یاد ہمیشہ کے لیے یہ اللہ کا نظام ہے اولاد کی ہمیشہ کی جدائی پر ماں پچھاڑیں کھاتی ہے رو رو کر بے ہوش ہوتی ہے مگر مردہ اولاد کی قبر میں اس کا ساتھ جا کر نہیں لیٹتی......اللہ صبر بھی دیتا ہے اور بہت سے کام بھی جو کیے بنا چارہ نہیں۔

عطیہ بیگم بھی آنسو بہا بہا کر نڈھال ہوگئی تھیں۔ اتنا روئی تھیں گویا آنسوؤں کے سوتے ہی خشک ہو گئے تھے کل سے آنسوؤں کی برسات کے بیچ لب نہ ہلے تھے۔ اب جو حواس بحال ہوئے تو ذہن مختلف سمتوں میں دوڑنے لگا......پہلا خیال ایمن کے سسرال کا ہی آیا......مگر چمن نے آدھی بات اچک اس موضوع کو ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کی کوشش کی۔

امی......آپا چلی گئیں مگر ان کی امانتیں ہمارے پاس ہیں اب ہمیں ان کا خیال کرنا ہے چمن نے ماں کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے دبایا۔ یہی سوچ کر تو کلیجہ منہ کو آتا ہے میری عمر دیکھو اور ان بچیوں کی عمر دیکھو......کیسے نباہوں گی یہ ذمہ داری......عطیہ بیگم پھر آبدیدہ ہونے لگیں۔

اللہ جس پر ذمہ داری ڈالتا ہے اسے قوت وتوفیق بھی دیتا ہے یہ بات میں نے آپ سے اور بابا سے کئی مرتبہ سنی ہے آپ اپنی ہی کہی بات بھول رہی ہیں چھوٹی کو تو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ کیوں کہ چھوٹے بچے راتوں کو جاگتے ہیں آپ راتوں کو جاگیں گی تو باقی دو کے کام کیسے کریں گی......چمن نے مسئلے کا فوری حل بتایا تاکہ عطیہ بیگم خود کو الجھنے سے بچائیں اور کچھ تسلی ہو۔ لیکن بیٹا......تمہارا شوہر اور تمہاری ساس......ان کی اجازت کے بغیر تم نے اتنی بڑی ذمہ داری کیسے لے سکتی ہو۔ عطیہ بیگم کو واہموں نے ستانا شروع کیا آپ اس کی فکر نہ کریں میں ثمر کو کنوینس کرلوں گی تو وہ اپنی امی کو خود ہی سنبھال لیں گے......دنیا کو نظر آرہا ہے وہ کیسے اگنور کرسکتے ہیں......آپا زندہ تھیں تب کی بات اور تھی مگر اب ثمر کو پتا ہے کہ یہ چند دن کی بچی ماں سے محروم ہوچکی ہے۔

بہت مشکل ہے......میں بانو آپا کا مزاج جانتی ہوں بیٹا......وہ بیٹے کو کچھ نہ کچھ کہتی رہیں گی تمہارے گھر کا ماحول خراب ہوگا......عطیہ بیگم بجائے پرسکون ہونے کے مزید پریشان ہوگئیں۔

گھر کا ماحول......چمن کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ بلا ارادہ در آئی۔ امی......انسان بہت کچھ سوچتا ہے مگر بہت کچھ اس کی سوچ کے مطابق نہیں ہوتا......میں نے بھی ابھی صرف سوچا ہے......عمل کروں گی تو فیس بھی کروں گی......اگر کسی کو چند دن کے بچے پر رحم نہیں آتا تو وہ ظالم ہے......اور آپ کیوں مجھے مجبور کریں گی کہ میں ظالموں کو خوش کروں اور میرا شمار بھی ظالموں میں ہو......

چمن کے دوٹوک انداز میں کچھ ایسا تھا کہ گم صم سی عطیہ بیگم بھی بری طرح چونک پڑیں کیا کرو گی تم......؟ وہ سہمے سہمے انداز میں چمن کی طرف دیکھنے لگیں......

وہی کچھ جو اس بچی کی بہتری اور بھلائی میں ہوگا......مگر ایک دم نہیں......ظلم سے بھاگتے نہیں ہیں......ظلم سے لڑتے ہیں امی......اس نے عطیہ بیگم کے کندھے پر آہستگی سے سر رکھ دیا۔

بیٹا جو کچھ کرنا سوچ سمجھ کر کرنا......میرے کمزور دل میں اب مزید کچھ سہنے کی طاقت نہیں......عطیہ بیگم نے چمن کے سر پر لرزتا ہوا ہاتھ پھیرا۔

امی اب تو درست اور صحیح وہی ہے جو ان بچیوں کے حق میں ہے......چمن نے آہستگی سے جواب دیا ایک

طرح سے فیصلہ سنا دیا۔ مگر اس طرح کہ عطیہ بیگم کو احساس تک نہ ہوا کہ وہ کوئی فیصلہ سنا رہی ہے۔

☆......☆......☆

امی جان...... حد ہوگئی...... ایمن کو دنیا سے رخصت ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے ہوئے ہیں اور آپ کو میری دوسری شادی کی فکر ہونے لگی...... یہ بہت زیادتی ہے......

یاور ماں کی باتیں سن کر پہلے تو حیران و ششدر رہ گیا پھر بہت خفا خفا انداز میں کہہ کر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا......

ارے کیا تم عدت میں بیٹھو گے......؟ تم مرد ہو...... جانے والی چلی گئی اب تم کتنا بھی غم مناؤ...... واپس نہیں آنے کی...... فردوس نے بڑی بے رحمی اور ڈھٹائی سے بیٹے کو گھور کر دیکھا......

دکھ تو ہے ناں...... آٹھ نو سال کا ساتھ تھا بہت خدمت کی ہے اس نے جائز نا جائز بہت کچھ برداشت بھی کیا ہے اور پھر میرے تین بچوں کی ماں بھی تھی۔

بچوں کی نہیں...... بچیوں کی...... فردوس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر قطع کلامی کی بچے یا بچیاں...... اولاد تو ہے ناں...... یاور ایمن کے اچانک منظر سے غائب کے باعث درحقیقت بہت دل برداشتہ تھا...... جانے والی معذرتیں کرنے معافیاں مانگنے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کرنے آنے والی نہیں تھی۔ ظالموں کو منہ چڑا کر چلی گئی تھی...... جدائی کے احساس کی پہلی طویل رات کاٹ کر یاور کا ذہن بالکل غیر جانبدارانہ انداز میں کام کر رہا تھا تقابلی جائزہ تب لیا جاتا ہے جب دو افراد آمنے سامنے ہوں اور جو زیادہ زور آور اور چھا جانے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ دیکھنے والوں کے ذہن پر قابض ہو جاتا ہے اور جب سامنے صرف ایک ہو تو اکثر اس کے نشانے خطا رکھے جاتے ہیں یا چوک جاتے ہیں...... فردوس ابھی میدان میں تن تنہا تھی...... کونے میں چھپی ہوئی ایمن کے خلاف ہرزہ سرائی کر کے یاور کو بدگمانی کی جلن سے نڈھال نہیں کر سکتی تھی اس لیے یاور بھیگے صابن کی طرح ہاتھ سے پھسلا پھسلا جاتا تھا۔

دوسرے جانے والی سر سے پاؤں تک سچائی تھی...... اور سچائی اپنا وجود منوالی ہے اور جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

یاور منظر سے غائب ہو چکا تھا...... فردوس کھڑی دانت پیس رہی تھی رات سسرال رک کر آیا ہے مکار عورت نے خوب ڈوز پلائے ہوں گے تب ہی پٹھے پر ہاتھ دھرنے نہیں دے رہا...... اولاد بھی یاد آ رہی ہے اسے تو اس کا باپ ہی قابو کرے گا......

اب اسے وہاں نہیں جانا چاہیے بچے اٹھا کر لے آیا تو ہوگئی اس کی دوسری شادی...... فردوس کے دماغ میں اب کھچڑی پک رہی تھی۔

☆......☆......☆

امی...... میں آج گھر چلی جاتی ہوں...... ثمر کو کافی پریشانی ہو رہی ہوگی۔ امی جان کا موڈ بھی آف چل رہا ہوگا انہیں گھر کا کام کرنے کی عادت نہیں رہی...... ایمن کی رحلت کا چوتھا دن تھا کہ چمن بچی کی ضروری اشیاء بیگ میں سمیٹ کر عطیہ بیگم کے پاس چلی آئی۔۔ عطیہ بیگم حق دق سی ہو کر چمن کی شکل دیکھنے لگی۔

بیٹا...... اتنی جلدی...... روز کوئی نہ کوئی تعزیت کے لیے آ جاتا ہے تم سے بڑا حوصلہ ملتا رہتا ہے وہ بولتے بولتے آبدیدہ ہونے لگیں۔

امی...... میں دوبارہ آ جاؤں گی آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں......؟ اب جو نئے امتحان شروع ہو گئے ہیں

ان سے بھی تو گزرنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ثمر کا موڈ ٹھیک رہے پھر اس نئی گڑیا کے لیے بھی تو اس گھر میں جگہ بنانا ہے۔
اصل معاملہ یہی تھا جو چمن کو رہ رہ کر گھر کا خیال آ رہا تھا کہ نئی ذمہ داریوں کا ذکر پہلے سے ہی ہو جانا چاہیے۔ اسے احساس تھا کہ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے مگر طے تو کرنا تھا اگر تمہاری ساس رضا مند نہ ہوئیں تو عطیہ بیگم کے اندیشے بجا تھے 'ہائی پروفائل' کیس تھا کوئی مذاق نہیں۔
امی اگر میں ثمر کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی تو امی جان کو پھر خود ہی سنبھال لیں گے۔
زندگی میں ابھی تازہ اور نیا ردھم تھا...... چمن کی خوش فہمی فطری تھی...... ثمر کا یہ کہنا کہ وہ خود ہی گئی تھی اس کا گھر ہے خود ہی واپس آ جائے...... اپ اپنے اندر بہت وسعت رکھتا تھا۔
لیکن پہلے ثمر تو قائل ہو...... عطیہ بیگم کی کسی طور تسلی نہیں ہو رہی تھی۔
امی...... جب انسان فیصلہ کن حیثیت میں بات کرتا ہے تو سامنے والا بھی بہت سوچ سمجھ کر جواب دیتا ہے کیونکہ فیصلہ کن مرحلے کا مطلب اگلا اور نیا موڑ ہوتا ہے...... چمن کے لہجے میں ایسا کچھ تھا جس نے عطیہ بیگم کو چونکا کر رکھ دیا تھا گھبرا کر بولیں۔
نہیں...... نہیں......؟ تم عورت ہو...... تمہیں احتیاط کرنا چاہیے...... دو کو سنبھال لوں گی تو تیسری کو بھی سنبھال لوں گی...... تم بس اپنا گھر بار سنبھالو۔
امی...... میں تو ایک بات کر رہی ہوں...... آپ بے فکر رہیں سوچ سمجھ کر ہی بات کروں گی چمن ماں کو سراسیمہ دیکھ کر بہت نرمی سے گویا ہوئیں۔
ہاں بیٹا...... دیکھ بھال کر...... اب میں اور تمہارے بابا ڈھلان کی طرف جا رہے ہیں ذرا سا پاؤں پھسلا اور ہم کہیں کے نہیں رہے...... عطیہ بیگم نے مزید تاکید کے ضمن میں چمن کو سمجھایا۔
چمن مسکرا پڑی...... مسکراہٹ میں گہری اداسی اور معنی پنہاں تھے بڑے سخت مرحلوں سے گزر کر بات کرنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔
جہاں سوال سے پہلے انکار کا خطرہ ہو وہاں خاموش ہی رہتی ہوں بے فکر رہیے۔
چمن کے انداز میں اب اعتماد تھا کہ عطیہ بیگم اس کو اس کی سمجھداری سے متعلق شکوک و شبہات کو پس پشت ڈالنا پڑا۔
اچھا میری بیٹی...... اللہ تمہارا...... حامی و ناصر ہو...... غم کی شدت ہنوز بھی ہزار باتوں سے بھی اس الاؤ کی گرمی کم نہ ہو سکتی تھی۔
بس آپ کی دعائیں ہی چاہیں...... شکر ہے ہمت کی کمی نہیں ہے...... گرتی ہوں مگر سنبھل جاتی ہوں......
چمن نے آگے بڑھ کر عطیہ بیگم کو گلے سے لگا لیا عطیہ بیگم نے بھی بے ساختگی کے انداز میں اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پیشانی چوم لی۔

☆......☆......☆

امی جان دکھ کی بات تو ہے ناں...... بچیاں بہت چھوٹی ہیں اور چھوٹے بچے ماں کے بغیر خوار ہو جاتے ہیں...... کوئی بھی پیار کرنے والا ماں کی طرح نہیں ہو سکتا۔
افشاں کی تنہائی دور کرنے صبح سے آئی بیٹھی تھی بانو آپا کے منہ سے نکل گیا تھا کہ بہو بیگم تو لگتا ہے بچے

جوان کر کے ہی لوٹیں گی..... تب خلاف توقع افشاں نے ماں کو انسانیت کا سبق پڑھانا شروع کر دیا تھا بیٹی کا مزاج بدلا پا کر جز بز سی ہو کر بولیں ارے میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی...... جانے والی چلی گئی وہ اتنی ہی لکھوا کر لائی تھی سوگ تین دن کا۔

سوگ تین دن کا امی جان...... غم تو زندگی بھر کا ہے ناں...... میں ایک دن آپ سے بات نہ کروں تو آپ کے فون آنا شروع ہو جاتے ہیں...... اولاد شے ہی ایسی ہے افشاں نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھ کر چلنے کے لیے پر تولے۔

جگ جگ...... سات بیٹوں کا منہ دھلاؤ...... اللہ تمہیں گرم ہوا سے بھی بچائے بانو آپا تو یوں دہل کر بولیں جیسے افشاں نے کسی انہونی کا اندیشہ ظاہر کیا ہو۔ اب میں چلوں گی امی جان...... بچے اسکول سے آتے ہی کھانا مانگتے ہیں راستے میں اتر کر چکن وغیرہ بھی لینا ہے...... بیف اور مٹن کو تو ہاتھ نہیں لگاتے افشاں بچوں کا خیال آتے ہی بڑی فکر مندی سے اور بنا تاخیر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ٹھیک ہے میرا بیٹا...... بانو آپا نے کھڑے ہو کر بیٹی کی پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا۔

ماشاء اللہ میری بیٹی کے قدم بہت اچھے ہیں...... گھر میں پاؤں رکھتے ہی رونق ہو جاتی ہے...... اب پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہتی جاتی تھیں۔

ماں کے دلار سے چال ہلارے لینے لگتی ہے افشاں کی رفتار میں موسیقیت اترنے لگی۔

افشاں کو خدا حافظ کہہ کر پلٹی ہی تھیں کہ کال بیل کی آواز نے چونکا دیا۔

شاید کچھ بھول گئی تھی...... انہیں لگے ہاتھوں افشاں کا ہی خیال آیا۔

چوکیدار اس اثنا میں گیٹ وا کر چکا تھا۔ چمن اپنا اور بچی کا بیگ دونوں کاندھوں پر لٹکائے بچی کو بڑے پیار سے سینے سے لگائے اندر آتی دکھائی دی۔

بانو آپا کے حساب سے یہ ایک 'دلخراش' منظر تھا چند لمحوں کے لیے تو انہیں جیسے چکر آ گئے اس کی گود میں بچی...... اور بچی بھی وہ جس کی ماں دائمی رخصت لے کر جا چکی تھی......

السلام وعلیکم امی جان...... چمن نے ان کی نظروں میں دل کا سارا اخبار پڑھ کر محتاط انداز میں سلام کیا......

یہ کیا ہے......؟ وہ اتنی حواس باختہ ہو چکی تھیں کہ سلام کا جواب دینے کے بجائے بچی کی طرف اشارہ کر کے کچھ کا کچھ بول گئیں۔

میری مرحومہ بہن کی نشانی...... اللہ کی رحمت ہے امی جان...... چمن کو 'یہ کیا ہے......؟'' قسم کے سوال پر شدید قسم کے تحفظات تھے۔

تو دلہن جس گھر میں رحمت برسی ہے اسی گھر میں رہنا چاہیے۔

ارے اتنا سا تو بچہ تو باپ کی دوسری شادی کی بہانہ بنتا ہے۔ بہت سے لوگ بچے پر ترس کھا کر بچے کے باپ کو اپنی بیٹی دے دیتے ہیں۔

امی جان آپ دوسری شادی کی بات بہت مزے لے کر کرتی ہیں جیسے کوئی شوقیہ خوشبودار پان کھاتا ہے...... ابھی تو میری بہن کا کفن بھی میلا نہیں ہوا...... آپ کی کچھ نہیں لگتی تھی...... مگر میرا تو خون کا رشتہ تھا کم از کم اسی کا احساس کر لیجیے چمن کے دل پر سچ مچ زور سے چوٹ پڑی تھی۔

اللہ جنت نصیب کرے...... بلکہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ مگر بیٹا یہ اللہ کی مرضی ہے ہمارا کیا قصور ہے جو ہم پرائے بچوں کی ذمہ داریاں اٹھائیں۔

دو چار دن کے لیے لائی ہو تو مرنے والی کی خاطر برداشت کرلیں گے اگر گود لینا چاہتی ہو تو سن لو میرے آنگن میں صرف ثمر کے بچے کھیلیں گے امی دو کو سنبھال رہی ہیں ایک تو میں ہی سنبھالوں گی......

یوں سمجھے اب یہ میرے ساتھ اس گھر میں ہی رہے گی......

چمن کو دوٹوک انداز میں بات اس لیے کرنا پڑی کہ وہ فیصلہ کرچکی تھی وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا اور یوں بھی بانو آپا کا ردعمل خلاف توقع جس کے لیے وہ اپنا ذہن پہلے ہی بنا چکی تھی۔

بانو آپا کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

ارے شوہر کی اجازت کے بغیر پرایا بچے کیسے پال سکتی ہو......؟ میری اور ثمر کی بات ایک ہوتی ہے زیادہ خوش فہمی میں مت رہنا ہفتہ دس دن رکھ کر شوق پورے کرو...... وہ بھی اس لیے اجازت دے رہی ہوں ماں باپ سوگ میں ہیں۔

اب بانو آپا نے حکمیہ اور آمرانہ انداز میں بات کی اور خون کے گھونٹ پیتی اندر کی طرف چل پڑیں۔

اب تو انسانیت کا سوال ہے جہاں انسانیت نہیں وہاں رہنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں چمن کے دماغ میں حق ضائع ہونے کے احساس سے طوفانی جھکڑ چلنے لگے تھے وہ اس وقت پہلے سے زیادہ فیصلہ کن انداز میں سوچ رہی تھی۔ زیادتیوں پر سمجھوتے ہو سکتے ہیں جانوں پر کون کرتا ہے......؟

☆......☆......☆

سر آج نانا جان میں خاصی امپروومنٹ نظر آرہی ہے کئی مرتبہ بات کرنے کی کوشش بھی کی ہے ندا ثمر کو شبیر حسین کی حالت کے بارے میں بہت خوش ہو کر بتا رہی تھی جو نہ جانے کیوں کشاں کشاں عیادت کو چلا آیا تھا حالانکہ اس نے دو دن کی سوچ بچار کی تھی کہ اسے کئی مرتبہ مدد کے لیے Call کیا گیا اور اس نے انسانیت کے ناطے اپنا اخلاقی فرض ادا کیا۔

اب اسے عیادت کے لیے کیوں جانا چاہیے؟ جبکہ ندا Resign بھی کرچکی ہے مگر آج وہ F.T.C بلڈنگ کے قریب پہنچا تو یوں لگا کوئی میکانکی ان دیکھی قوت اسے ہاسپٹل کی طرف کھینچ رہی ہے بیس اکیس سال کی ہمہ وقت افراتفری میں مبتلا ہونگی بے وقوف سی لڑکی سے اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی وہ لڑکی جو اب Ex-Employes تھی خیر آپ سے فون پر بات ہوئی تو میں سمجھی آپ راستے میں ہیں اور ادھر آرہے ہیں مگر آپ نے تو دو دن فون پر خیریت بھی نہیں پوچھی...... ندا نے گویا شکوہ کیا اب یہ الگ بات ہے کہ شکوہ بھی بہت بے ڈھنگا تھا۔

میں بہت Busy رہا ہوں ...... شاید آج بھی نہ آپاتا...... اس طرف ایک ضروری کام نکل آیا تو سوچا خیریت بھی پتا کرتا چلوں۔ ثمر نے بڑے صاف گوئی سے جواب دیا۔

لیجیے میں تو خوش ہو رہی تھی کہ آپ اسپیشلی نانا جان کی عیادت کرنے آئیں ہیں۔ ندا کو درحقیقت بہت مایوسی ہوئی یہ لاشعوری حواس کا شعوری ردعمل تھا وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتی تھی کہ اسے ثمر کے جواب سے اتنی مایوسی کیوں ہوئی......؟

سر میں نے آپ کو تنگ بھی تو بہت کیا ہے، میرے ریزائن کرنے سے آپ نے سکون کا سانس لیا ہوگا۔ معاً ندا کو اپنی کوتاہیاں فوراً ہی یاد آگئیں۔

وہ نہ طنز کر رہی تھی نہ کوئی من چاہا ردعمل حاصل کرنے کی نیت سے ڈائیلاگ بول رہی تھی اس نے تو بڑی

سادگی سے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کیا تھا اور ثمر کو ہر قسم کی کوتاہی سے بری الذمہ قرار دیا تھا وہ پوری سچائی کے ساتھ اپنے باطن کا احتساب کر رہی تھی۔

وہ پہلے دن سے ثمر کی شخصیت سے متاثر تھی جو کسی مشین کی طرح اپنے معمولات نمٹاتا نظر آتا تھا۔ اس میں موجود کسی حسین سی لڑکی کو بھی اس نے اپنے قیمتی وقت میں سے چند سیکنڈ نہیں دیے تھے نہ کسی طرف نگاہ غلط ڈالتا پایا گیا...... آفس میں اکثریت اسے بہت Rude اور Pruod گرداندتی تھی میل، فیمیل، جونیئرز کے ساتھ اسے بھی غیر ضروری بات چیت کرتے نہیں دیکھا گیا تھا۔

اور یہی وہ تمام خصوصیات تھیں جس کی بنا کر ندا خود ہی آگے بڑھ بڑھ کر بڑے اعتماد سے اپنے مسائل کے ٹوکرے اس کے سامنے خالی کر دیتی تھی۔

آپ زیادہ غور نہ فرمایا کریں مس ندا...... کارٹون لگتی ہیں میں سکون کا سانس لوں یا سانس لینا ہی بھول جاؤں، آپ کو کیا فرق پڑتا ہے......؟ ثمر نے اب ہلکے پھلکے انداز میں مسکرا کر بات کی۔

ندا اس وقت کسی ذہنی دباؤ میں نہیں تھی کیوں کہ وہ ریزائن کر چکی تھی ثمر اس کا 'ایکس باس' تھا۔

اس نے سوئے ہوئے شبیر حسین پر ایک سرسری نظر دوڑائی۔

سر...... آپ بہت پریکٹیکل ہیں اور بہت نیک نیت بھی ہیں۔ آپ نے مجھے بہت زیادہ Help کیا ہے۔ میں آپ سے بہت امپریس ہوں۔ اب دیکھیے ناں جو بھی نیک انسان ہوتا ہے اس سے سب امپریس ہی ہوتے ہیں۔

اگر آپ اتنے اچھے نہ ہوتے تو میں Expect ہی نہ کرتی وہ ایک انتر اچھیٹری چلی گئی ارے...... آپ میری بیوی سے پوچھیں تو وہ کہے گی دنیا کا سب سے ظالم اور برا انسان اس کا شوہر ہے۔

اس کے قصیدے سن کر بجائے خوشی کے ثمر کو ہنسی آ گئی۔

ندا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

آپ کی مسز آپ کو ایسا کیوں سمجھتی ہیں آپ ان کے باس تو نہیں ہیں۔

آفس میں اگر لوگ آپ کو ایسا سمجھتے ہیں تو ان کا Concern ہے۔

ندا ہونقوں کی طرح وہ بھی کہہ گئی جو کہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

چلیے اس بہانے یہ تو پتا چل گیا کہ میرے جونیئرز میرے بارے میں کس قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔ ثمر کی مسکراہٹ بڑی بے ساختہ تھی۔

سوری سر...... میرے منہ سے نکل گیا...... ندا بری طرح گھبرا گئی۔

آپ بولتی کب ہیں......؟ آپ کے منہ سے بس نکلتا رہتا ہے ثمر نے اس کی خاطر جمع کی نیت سے ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور ریسٹ واچ پر نظر دوڑانے لگا ندا بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سر آپ کی مسز بہت خوبصورت ہوں گی...... میں گارنٹی سے کہہ سکتی ہوں۔

بڑی بات ہے...... آپ ایسی باتیں گارنٹی کے ساتھ کر لیتی ہیں' بہرحال وہ بہت حسین ہیں...... آئیڈیل، پرفیکٹ اور بہت Loving ثمر نے بہت اعتماد کے ساتھ ایک غیر شادی شدہ لڑکی کے سامنے اپنی بیوی کی تعریف کی جبکہ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے۔

آپ کسی دن انہیں اپنے ساتھ لے کر آئیے گا...... میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی انہیں بور ہونے نہیں دوں

گی...... ندا نے یہ بھی وضاحت دے ڈالی۔
وعدہ نہیں کرتا البتہ کبھی موقع ملا تو ضائع نہیں کروں گا...... او کے...... اب مجھے اجازت ثمر نے کھڑے ہو کر شبیر حسین کی طرف نگاہ کی جو مسکن دواؤں کے زیر اثر بہت گہری نیند میں تھے منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے جس سے لگتا تھا انہیں سانس لینے میں دقت پیش آ رہی ہے۔
سر...... میں آپ کا Wait کروں گی...... مریض کی عیادت کرنے سے بہت ثواب ملتا ہے ندا نے اپنی خواہش کے بانکپن کو اخلاقیات کے لبادے میں چھپانے کی لاشعوری کوشش کی تھی۔
وہ ثمر سے متاثر تھی۔
ایک خوبصورت جواں مرد، لگژری کار، اعلیٰ طبقے کی ساری تام جھام، کھائے ہوئے گال، نہائے ہوئے بال دور سے ہی پتا چلتے ہیں اتنی زبردست ظاہری حالت...... ندا کیا ندا ایسی ہزاروں لاکھوں لڑکیاں ایسے ظاہر سے متاثر ہوتی ہیں۔
لیکن یہاں ایک بڑی آفاقی سچائی کا زور تھا ندا معصوم تھی اسے پتا تھا ثمر ایک شادی شدہ مرد ہے وہ اسے پسند کرنے کے باوجود کبھی اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کسی شادی شدہ گھر بار والے شخص کو اپنے دل میں جگہ دے سکتی ہے۔
وہ اپنے باس سے متاثر تھی، ثمر سے نہیں۔
مجھے بھی تو ثواب کمانے کا بہت شوق ہے دعا کریں اللہ مجھے وقت اور توفیق عطا فرمائے آمین...... ندا کو یہ حسین دعا قبول کرانے کی بہت جلدی تھی جھٹ آمین کہہ دیا۔
ثمر نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا اور بانو آپا نے ایک دم اسے آلیا۔
السلام وعلیکم امی جان...... خیریت آپ یہاں اکیلی بیٹھ کر کیا کر رہی ہیں......؟
چمن تو گھر پر ہی ہے ناں......؟ اس نے شام کو فون کر کے بتایا تھا کہ وہ گھر آ گئی ہے۔ ثمر نے ماں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے معمول کے لہجے میں بات کرنا کی کوشش کی۔
بس یہی بتانا تھا...... جو بتانے والی بات تھی وہ نہیں بتائی......؟ بانو آپا کا ضبط جواب دے رہا تھا بہت تلخ لہجے میں گویا ہوئیں تھیں۔
ثمر نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا...... اندر جانے کی عجلت استعجاب میں اٹک گئی۔ وہ بتانے والی خاص بات کیا ہے آپ ہی بتا دیجیے...... ثمر نے پھر معمول کے لہجے میں بات کرنے کی شعوری کوشش کی......
مرحومہ بہن کی دودھ پیتی بچی اٹھا کر لے آئی ہیں...... دلہن بیگم...... کیا ڈھٹائی ہے تم سے اجازت لی تھی......؟ بانو آپا نے کڑے تیور کے اتھ یوں گھورا کہ پلک نہ جھپک جائے مبادا کوئی تاثر مس ہو جائے۔
ہاں تو کیا کریں امی جان...... اس وقت تو مجبوری ہے ناں...... جو سمجھ بھی آتی ہے میں چمن کو خاص طور پر تاکید کر دوں گا کہ بچی کی وجہ سے امی جان کو ڈسٹرب نہیں ہونا چاہیے...... آپ ریلکس کریں...... ثمر نے اس واقعے کو اس طرح نہیں لیا جس طرح بانو آپا کو توقع تھی...... وہ تو بیوی کے ساتھ بھرپور تعاون کے موڈ میں دکھائی دے رہا تھا ان کا تو کلیجہ شق ہونے لگا...... ہر شے اندھیرے میں ڈوبتی دکھائی دی۔
اتنے چھوٹے بچے جو ساتھ رکھتا ہے بچہ اس سے مانوس ہو جاتا ہے پھر یہ بہانہ بن جائے گا کہ بچی کو چمن کی

عادت ہوگئی ہے...... بیٹا یہ گھنٹی گلے میں مت باندھو...... اللہ رکھے بچی کا باپ زندہ ہے اپنے بچوں کے لیے دوسری ماں لے آئے۔ یہ بچے اس کی ذمہ داری ہیں اب بانو آپا نے اثر انداز ہونے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا اور بڑے پیار سے سمجھانے والے انداز میں بولیں۔ ابھی تک ثمر جہاں تک آیا تھا بانو آپا نے اسے ایک انچ آگے بڑھنے نہیں دیا تھا۔ لاونج کا داخلی دروازہ بند تھا۔ چمن کو خبر نہیں تھی کہ ثمر گھر آچکا تھا بانو آپا یہیں کھڑے کھڑے اپنے مسئلے کا حل چاہتی تھیں۔

امی جان کیسی باتیں کرتی ہیں ایمن کی ڈیتھ کو چند دن گزرے ہیں اور آپ یاور کی دوسری شادی کی بات کر رہی ہیں......؟

وہ لوگ ایک بڑے دکھ سے گزر رہے ہیں...... ہم سب کو ان کا احساس کرنا چاہیے یہ کہہ کر ثمر نے قدم آگے بڑھا دیے۔

بانو آپا کے سارے تیر خطا جا رہے تھے ان کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا۔

قدم اٹھانا دوبھر ہوگیا جبکہ ثمر کے قدم تیز تھے۔ تھک ہار کر لوٹنے والے کو اس چہرے پر نظر کرنے کی جلدی تھی جو روزگار کی تمام مصروفیات کے دوران اپنے ہونے کو محسوس کراتا تھا۔ ستانے کے عمل کے دوران دل سے نکل کر میز پر براجمان ہو جاتا تھا یوں بھی جنگ کے بعد صلح کی لذت کھٹائی میں پڑ گئی تھی۔

چمن آئی بھی اور اس طرح کہ جیسے آئی نہیں فوراً دوبارہ چلی گئی تھی۔

شادی شدہ مرد کے لیے ایک خاص مدت کے بعد بیوی سے دوری اعصابی بوجھ بن جاتی ہے ہلکے کام بھی بوجھل ہو جاتے ہیں۔

ثمر اندر جا چکا تھا بانو آپا حیرت کی منزل پر کھڑی تھیں حیرت عقل و دلائل کی آخری حد ہے۔ الفاظ گم تھے تدبیریں ڈھیر۔

☆......☆......☆

چند دن دبے پاؤں گزر گئے چمن نے گیسٹ روم کو اپنا وقتی ٹھکانہ بنا لیا تھا بچی کا نام مشکور احمد نے نور العین تجویز کیا تھا اور از راہ تکلف یاور سے بھی فون پر مشاورت کر لی تھی وہاں سے بڑا غیر جذباتی رد عمل سامنے آیا تھا جس کا متن یہ تھا کہ یہ آپ کی بیٹی کی نشانی ہے اب سارے ٹھیکے آپ ہی کے پاس ہیں۔

چمن نے گیسٹ روم میں نور العین کی تمام ضروری اشیاء مرتب انداز میں رکھ دی تھیں۔ جب ثمر گہری نیند سو جاتا اور بچی جاگتی تو وہ گیسٹ روم میں آجاتی تھی اس طرح ثمر کو محسوس ہی نہیں ہوا کہ گھر میں کوئی بچہ بھی ہے کبھی کبھی ثمر کے سامنے رو پڑتی تو وہ گھبرا کر چمن سے کہتا۔

سب کام چھوڑو...... بس تم اسے سنبھالو۔

ثمر کا انداز چمن کے لیے باعث تقویت تھا...... برسوں کے دوران جو ہلکی پھلکی کدورتوں نے دل پر جالے بنے تھے وہ مکڑی کے کمزور جالے ہی ثابت ہو رہے تھے اس تعاون پر چمن ثمر کی تہہ دل سے مشکور تھی۔

مگر بانو آپا کے چہرے پر مستقل ناگواری کی لکیریں یوں نقش تھیں جیسے تاشقند و بخارا کی درسگاہوں پر پتھر پر نقش تاریخی عبارتیں جو مٹائے نہ مٹیں۔ ایسی ہی صورت کے لیے کہا گیا تھا

روتے کیوں ہو؟

یا شکل ہی ایسی ہے
مگر ثمر کے تعاون کا ردعمل ایسا تھا کہ چمن پہلے سے زیادہ بانو آپا کی خدمت کر رہی تھی۔
مگر خواہش کی شدت نے دل کو پکا کر لوہے سے فولاد میں ڈھال دیا تھا۔ان پر چمن کی خدمات کا مطلق اثر نہ تھا اپنا پوتا کھلانے کی خواہش جنون کے درجے پر تھی اور جنون کی وحشت بھری قوت صرف قدرتی آفات سے ہی زیر ہوسکتی ہے۔
ارے یہ چوبیس گھنٹے کا باجا تو اٹھا کر لے آئی ہو...... یاں سے کچھ سیکھ کر اٹھاتیں۔نماز پڑھتی ہوں تو چار کی آٹھ پڑھ جاتی ہوں......اسے اوپر گیسٹ روم میں ہی رکھا کرو۔ بانو آپا تسبیح کے دانے گھماتی اس کے سر پر چڑھ دوڑی تھیں۔
امی جان بچے کے رونے کا کوئی وقت تو نہیں ہوتا...... مجھے نیچے کام کرنے ہوتے ہیں تو لے آتیں ہوں...... چمن نے بڑے ادب ورسانیت سے جواب دیا۔
ارے دو بچے پال پوس کر جوان کر دیے اب یہ ٹیں ٹیں پیں پیں برداشت نہیں ہوئی اسے اٹھا کر اوپر لے جاؤ......چھوڑو کام وام...... یہ ہوتے رہیں گے بانو آپا نے حکمیہ کہا اور صوفے پر دھرنا مار کر لاؤنج میں بیٹھ گئیں۔
امی جان اگر آپ کے پوتے ہوتے تو تب بھی آپ ایسے ہی کہتیں......؟ چمن آٹا گوندھتے گوندھتے بچی کو چپ کرانے صحن سے باہر آئی تھی مگر دھیان آٹے کی طرف ہی لگا ہوا تھا انسان کا ذہن بیک وقت کئی سمتوں میں لگا ہو تو لاشعوری طور پر بھی جھنجھلا جاتا ہے اس پر مستزاد نور العین بھی یوں رو رہی تھی جیسے کوئی اسے مسلسل چٹکیاں کاٹ رہا ہو پھر رویے بھی مزاج و ماحول پر ہر صورت اثر انداز ہوتے ہیں۔
ارے پوتے تم سے ملتے تو عادتیں بھی پڑ جاتیں......مگر وہ تو کسی بھاگوان سے ہی ملیں گے بانو آپا بھی اپنی نازک طبع پر بچی کی چیخ پکار برداشت نہ کر پا رہی تھیں نیزے کی اَنی کی طرح ایک نوکیلا جملہ چمن کے دل میں گاڑ دیا۔
بہت عرصے سے کسی بھاگوان کی آمد کی خوشخبری سن رہی ہوں اب لے ہی آئیں۔مگر پہلے ثمر کو قائل کر لیں کہ وہ اپنے ٹیسٹ کرالیں میری رپورٹس کلئیر ہیں جو ثمر نے اپنی آنکھوں سے دیکھی پڑھی ہیں۔بے اولادی کا ناجائز طعنہ سن کر چمن فطری طور پر ٹیمپرامنٹ Loose کر جاتی تھی اس کے باوجود اس کے لہجے میں نرمی ورسانیت تھی۔
پھر وہی بے حیائی اور نمک حرامی......ارے کتنا برداشت کریں۔پرائے بچے ہمارے گھر میں پال رہی ہو......احسان فراموش......کوئی ماں یہ گالی برداشت نہیں کر سکتی تم جگہ خالی کرو...... آج ہی بھاگوان لے آؤں۔
مگر ہر بار تھوک کر چاٹتی ہو...... بے غیرتوں کی طرح منہ اٹھا کر آجاتی ہو۔ پتا ہے ہاں بانجھ طلاق یافتہ کو کوئی نہیں پوچھتا......دوسرا نکاح کسی نو بچوں کے باپ سے ہی ہوسکتا ہے جس کو اولاد کی تمنا ہی نہ ہو۔ پہلے ہی بچوں نے پاگل بنا دیا ہوا ہو......جسے بچوں کے لیے آیا کی ضرورت ہوگی وہی بانجھ سے نکاح کرے گا۔
بانو آپا اب کف اڑانے لگی تھیں چمن نے پھر ان کے بیٹے کو گالی دی تھی۔ وہ اکلوتا بیٹا جو لاکھوں کماتا تھا خوبصورت جواں مرد جسے لوگ اپنے منہ سے بیٹی دینے کی خواہش کا اظہار کرتے تھے پہن اوڑھ کر سامنے آتا تو نظر بھر کر نہ دیکھتیں مبادا ان کی اپنی ہی نظر نہ لگ جائے۔
ہزاروں چھانٹ کر ان کی نظر انتخاب چمن پر ٹھہری تھی پانچ فٹ چھ انچ کا قد۔
(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

سالگرہ محبت

گھر ایک ہی تھا۔ بس گھر کے درمیان میں پھولوں کی نازک سی باڑھ تھی۔ یوں ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے دن میں کئی باران کے جھگڑے ہوتے تو تکرار ہوتی۔ جیت ہمیشہ جواد کے حصے میں آتی تھی۔ اس پر جواد کی فاتحانہ مسکراہٹیں۔ عروہ کا تن من جلا ڈالتیں، اور جواد......

نہیں جانا مجھے تمہارے ساتھ' ڈرائیور ہے گھر میں۔'' عروہ انتہائی غصے سے تنک کر بولی۔ چہرہ لحہ بہ لحہ سرخ ہو رہا تھا۔

تو ماتھے پر تیوریاں چڑھائے، درشت لہجہ لیے جواد بھی اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور اُس کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتا ہوا بولا۔

''کیوں نہیں جاؤ گی؟''

اونچا لمبا' بے داغ چہرہ تازہ شیمپو' کلون کی مہک، عروہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

''چلو۔'' جواد اب کے نرمی سے بولا تھا ٹون بدل کر۔

''کہانا...... نہیں جانا مجھے تمہارے ساتھ۔'' عروہ اب کے چیخی۔

''کیسے نہیں جاؤ گی۔ جواد نے اُس کا بازو پکڑا۔ اور لاؤنج کی جانب چل پڑا اب اُس کا رخ پورچ کی طرف تھا۔

''چھوڑو...... چھوڑو۔'' عروہ برابر چیخ رہی تھی۔ مگر اس آہنی شکنجے سے خود کو آزاد نہ کر پائی۔

عمرانہ تائی نے اسے بے بس دیکھا تو ان کے پیچھے دوڑیں۔ اتنی دیر میں جواد اسے گاڑی میں دھکیل چکا تھا۔ دروازہ لاک سسٹم تھا۔ ورنہ وہ خود ہی نکل آتی۔ عمرانہ آخر کار گاڑی تک آ گئیں جوڑوں کے درد کے باوجود۔ عروہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو جمع تھے۔

انہیں یکدم اس ننھی چڑیا پہ بے حد پیار آیا اور ساتھ ہی جواد پر شدید غصہ۔

''تائی اماں۔'' شیشہ بند ہونے کی وجہ سے عروہ کی آواز ان تک نہ پہنچ پائی مگر عمرانہ کو اندازہ ہو گیا تھا۔

ماں کو دیکھ کر جواد نے شیشہ نیچے کیا۔

''شرم کرو۔'' وہ انتہائی غصے سے دیکھ کر بولیں۔ جواد ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔

''اسے بتا دیں شرفو تین دن کی چھٹی پر ہے' اور میں ہی اسے پک اینڈ ڈراپ کروں گا۔'' جواد کے فاتحانہ انداز و لہجے پر عروہ کھول کر رہ گئی۔

''ٹھیک ہے مگر اس طرح۔'' عمرانہ تھکے ہوئے انداز میں بولیں۔

''اماں یہ خود انکار اور نخرے کر رہی تھی۔ تو زبردستی اسے گھسیٹنا پڑا اپنی منگیتر کو لے جا رہا ہوں، کوئی غیر تھوڑی ہے۔'' جواد مزید اکڑتا ہوا بولا۔

عروہ نے تلخی سے اسے گھورا۔ جواد کے لبوں کی جاندار مسکراہٹ اسے سرتاپا جلا گئی۔ کیونکہ جواد اپنی مرضی میں کامیاب ہوا تھا۔

''آپ جائیں امی ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ اسے کالج ڈراپ کر کے آفس چلا جاؤں گا۔ اور واپسی پر اسے لیتا آؤں گا۔''

جواد نے ماں کو مطمئن کیا تو وہ گہری سانس لے کر عروہ کو تسلی دیتے ہوئے اندر جانے لگیں۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے سے قبل جواد نے عروہ کو ٹشو نکال کر دیا۔ جسے اس نے یکسر نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ چہرہ اور آنکھیں بھیگے ہوئے تھے۔

''چہرہ صاف کر لو...... ورنہ یہ فریضہ بھی مجھے ہی انجام دینا پڑے گا۔'' جواد نے مسکراتے ہوئے اُس کی گھورتی بھیگی آنکھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تو عروہ نے جلدی سے ٹشو تھام لیا۔ وہ جانتی تھی کہ جواد ایسا کر گزرے گا۔

''شاباش دیکھی میری محبت۔'' جواد قہقہہ لگا کر بولا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ عروہ جانے کیوں خود کو اس قدر بے بس پاتی کہ خود پر شدید غصہ آنے لگتا۔

کالج آنے تک وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔

☆......☆......☆

حفیظ علی اور سلیم علی ایک بہن سمیرا کے دو بھائی تھے۔ عمرانہ اور ناہید اُن کی بھابیاں تھیں۔ حفیظ کا ایک بیٹا جواد جبکہ سلیم علی کی اکلوتی بیٹی عروہ ہی پھوپو سمیرا کی تین بیٹیاں تھیں صحیفہ، آئینہ اور سدرہ۔

جواد اور عروہ کی باقاعدہ منگنی نہ ہوئی تھی۔ مگر سب کو علم تھا کہ عروہ جواد کی دلہن بنے گی۔ جواد عروہ سے چھ سال بڑا تھا عروہ کے بعد ایک بھائی پیدا ہوا مگر وہ وفات پا گیا۔ یوں عروہ سب کی آنکھ کا تارا تھی۔ جواد اس پر رعب جماتا۔ اپنا حق جتاتا عروہ اکلوتی ہونے کے سبب بے حد لاڈلی تھی۔ حسین نرم مزاج اور بھولی بھالی اسے جواد کی دھونس جمانے، من مانی کرنے والی عادت سخت ناپسند تھی اور جواد اس پر اپنا استحقاق جمانا خوب جانتا تھا۔

گھر ایک ہی تھا۔ بس گھر کے درمیان میں پھولوں کی نازک سی باڑھ تھی۔ یوں ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے دن میں کئی بار ان کے جھگڑے ہوتے تو تکرار ہوتی۔ جیت ہمیشہ جواد کے حصے میں آتی تھی۔ اس پر جواد کی فاتحانہ مسکراہٹیں۔ عروہ کا تن من جلا ڈالتیں، اور جواد کا یہ کہنا کہ دیکھی میری محبت۔ عروہ بنا کچھ کہتے کئی کئی دن اس کے سامنے نہ آئی اس کا بس نہ چلتا کہ جواد کا......'' اس سے آگے بے بسی ولاچاری تھی۔

عروہ جواب تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی اس کی پھوپو سمیرا کی بیٹی آئینہ سے گہری دوستی تھی۔ وہ آئینہ سے ہر بات کرتی۔ اسے اپنا راز دان سمجھتی تھی۔ دونوں ایک ہی کلاس میں تھیں۔

آئینہ کو جواد کی ہٹ دھرمی اور عروہ کی بے زاری کا بخوبی علم تھا۔ ستم یہ کہ آئینہ دل ہی دل میں جواد کو چاہتی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دونوں کی بات طے ہے۔ مگر دل کا کیا کرتی۔ جو، جواد کو دیکھتے ہی اُس کی طرف ہمکنے لگتا تھا۔ اکثر و بیشتر عروہ کو الٹے سیدھے مشوروں سے نوازتی رہتی۔ اور عروہ اپنی سادگی کے سبب آئینہ کو اپنا دوست ہمدرد، راز دار مانے ہوئے تھی۔ اس کے برعکس جواد سب باتوں سے بے خبر عروہ کو چاہتا تھا۔ ایم بی اے کرنے کے بعد ایک اچھی فرم میں اچھی پوسٹ پر نوکری کر رہا تھا۔ عروہ اسے دل و جان سے عزیز تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس پر اپنا حق جمانا فرض سمجھتا تھا۔

حفیظ علی اور سلیم اپنے کاروبار میں اُلجھے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جواد کاروبار سنبھالے۔ مگر ابھی وہ کچھ سال نوکری کر کے تجربہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار کاروبار ہی اسے سنبھالنا تھا۔ سو وہ اپنا شوق پورا کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

''ارے کیا ہوا، روتی ہوئی آئی ہو کیا؟''

آئینہ اسے دیکھتے ہی بولی تو سسکتے ہوئے عروہ نے اسے پورا واقعہ سنا ڈالا۔ دونوں کلاس بنک کر کے گھاس کے ایک قطعے پر آ بیٹھی۔

''ہوں...... تو یہ بات ہے آئینہ کے اندر سرشاری سی لہرائی تھی۔ عروہ کس طرح بنے گی تم دونوں میں۔ جواد تو ساری زندگی تمہیں سسکا سسکا کر مار ڈالے گا۔

آئینہ کے انداز میں ہمدردی پا کر عروہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''کیا کروں میں...... وہ آنکھیں صاف کر کے گلوگیر آواز میں بولی۔

تم اس سے شادی سے انکار کر دینا۔ یہ کوئی بات ہے بھلا۔ آئینہ پیار سے اسے گلے لگا کر

بولی۔ عروہ پوری طرح اس کی باتوں میں آجاتی تھی۔

''ہاں تو اور کیا۔ کوئی ایک دن کی بات تھوڑی ہے۔ یہ تو عمر بھر مجھے ذلیل کرے گا۔'' عروہ کا کہنا تھا کہ آئینہ کے اندر اطمینان ہلکورے لینے لگا۔ اُس کا مقصد صرف اور صرف یہی تھا کہ عروہ جواد سے شدید نفرت کرنے لگے۔ یوں اُس کا راستہ صاف ہوجائے گا۔ عروہ خود بخود ہٹ جائے گی۔ اور یوں وہ جواد کو حاصل کرلے گی۔

وہ اپنی دلفریب سوچوں میں خوابوں کے سفر پر تھی کہ عروہ کے ہلانے پر چونکی اور مسکرادی۔

''چلو بس کرو...... آؤ تمہیں گرم گرم چائے پلواؤں۔'' آئینہ اٹھتے ہوئے بولی اور عروہ کے ساتھ کینٹین کی طرف آگئی۔ عروہ اُس کی باتوں پر سمجھانے پر کسی حد تک ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔ عروہ پر سوچ کے نئے در کھلتے گئے۔ کچی عمر تھی، سادگی و بھولپن تھا۔ جس نے جو سمجھایا بتایا اسے درست مانتی گئی۔ اور فیصلے کرتی گئی۔ یہ جانے بغیر کہ اس کے فیصلے اُس کی سوچ کتنی غلط ہے۔ جواد اور عروہ کے دل میں روز بروز فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔

''کیا ہے ماما...... دوسرا ڈرائیور رکھ لیں ناں۔'' پورے ایک ہفتے وہ جواد کے ساتھ آنے جانے پر سخت نالاں ہوکر وہ ناہید سے اُلجھ پڑی۔ غصہ اُس کی آنکھوں میں اترا ہوا تھا۔ ناہید مسکراتے ہوئے اُس کے پاس آگئیں اور پیار سے اُسے دیکھا۔

''جواد کے ساتھ تم زیادہ محفوظ نہیں ہوتی ہو کیا؟'' ناہید کی بات پر عروہ بدک کر بولی۔

''امی پلیز اس ہٹلر کو آپ محافظ نہ کہیں۔'' عروہ کے نتھنے پھولے۔

''اچھا چھوڑو، آجائے گا نیا ڈرائیور اور نئی گاڑی بھی۔'' ناہید نے بتایا تو عروہ پر جیسے خوف کا پہاڑ سا سرک گیا۔

''سچ امی!'' وہ فرطِ مسرت سے ان کے گلے جالگی۔

''ہاں میری جان!'' انہوں نے عروہ کی روشن پیشانی چوم لی۔

''اور ایک مزے کی خبر سنو، صحیفہ کی شادی جلد ہونے والی ہے۔ لڑکا دو ماہ کی چھٹی پر آرہا ہے۔ بس یوں سمجھو اگلے ایک ماہ میں شادی ہے۔ آج سمیرا باجی کا فون آیا تھا۔''

اور کل ہم سب ان کے گھر جائیں گے۔ سب نے مل کر کچھ معاملات نمٹانے ہیں۔ کل ویک اینڈ بھی ہے تم تیار رہنا۔ اور ہاں اپنی تائی جان کا حال پوچھ آنا انہیں صبح سے خاصا بخار وفلو ہورہا ہے۔ میں نماز پڑھ لوں۔'' عروہ کو بہت خوش دیکھ کر ناہید بھی اسے ہدایات دے کر باہر چلی گئیں۔

عروہ لباس بدل کر اپنی مختصر تیاری کرکے تائی عمرانہ کی طرف چلی گئی۔ لان کی باڑھ عبور کرکے وہ لاؤنج میں آگئی۔

شام کا ملگجا سا اندھیرا لاؤنج میں اُترا ہوا تھا۔ عمرانہ اپنے کمرے میں تھیں۔ عروہ کھلے دروازے میں اندر آگئی۔

عمرانہ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھیں۔ زکام کی وجہ سے ان کی ناک سرخ ہورہی تھی۔ ''چائے بنادوں آپ کے لیے۔'' عروہ نے پوچھا۔

''ارے کہاں تکلیف کروگی تم۔'' وہ اسے روکنے لگیں۔

''ارے نہیں تو...... فٹافٹ بنالاتی ہوں، بلکہ کچھ اور بھی جو آپ کا جی چاہیے۔'' عروہ جانتی تھی کہ وہ اسے منع کرتی رہیں گی۔

''نہیں اور کچھ نہیں دلیہ اور سوپ تو بنا رکھا

ہے۔ تم بس تین کپ چائے بنالو، جواد بھی پیئے گا۔'' عروہ کو بتا کر وہ ناک پر ٹشو رکھنے لگیں۔
''جی۔'' جواد کے نام پر عروہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی تھی۔
''تو یہ گھر پر ہے۔'' عروہ کا حلق کڑوا ہوا، وہ کچن میں آ گئی۔ پانی ابلنے کو رکھا اور کپ نکالنے لگی کہ پانی پینے کے ارادے سے جواد کچن میں آ گیا۔ عروہ کو دیکھتے ہی اُس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگنے لگی۔ جبکہ اُس کی موجودگی پر عروہ کو بہت اُلجھن محسوس ہو رہی تھی۔
''سلام کا رواج ختم ہو گیا ہے کیا؟'' ایک گھونٹ پانی پینے کے بعد وہ طنز کرتا ہوا بولا۔
''صبح کیا تو تھا۔'' وہ بھی چپ نہ رہی۔
''اونہہ...... بڑا احسان کیا مجھ پر۔'' جواد قریب آ گیا۔ عروہ جلدی جلدی کپوں میں چائے انڈیلنے لگی تاکہ فوراً یہاں سے نکلے۔
''اچھی لگ رہی ہو یہاں پر۔'' جواد کے لہجے میں یکایک شیرینی ٹپکنے لگی۔ وہ ٹرے اٹھا کر جانے لگی تو اس نے روکا۔ اور کیبنٹ کھول کر بسکٹ نکالے۔ پلیٹ میں رکھے اور اس کے ساتھ ہی عمرانہ کے پاس آ گیا۔
''مزے کی چائے بنی ہے۔'' عمرانہ نے تعریف کی تو عروہ مسکرا دی۔
''بس ٹھیک ہی ہے۔'' جواد نے شرارت کی۔
''اوں، ہوں، میری بیٹی کو تنگ نہ کرو۔'' عمرانہ نے مصنوعی غصے سے جواد کو گھورا۔ جو عروہ کو میٹھی میٹھی نظروں سے تک رہا تھا۔

☆......☆......☆

پیپرز ختم ہوئے تو عروہ نے سکھ کا سانس لیا۔ اب صحیفہ آپی کی شادی کی بھرپور تیاری کرنا چاہتی تھی۔ صبح سے ہی ناہید کے سر میں سخت درد تھا۔ انہیں اکثر و بیشتر آدھے سر کا درد شدید ہو جاتا تھا۔ اور وہ بے حال ہو جاتیں۔ عروہ کو آج لازمی شاپنگ پر جانا تھا۔ وہ جھنجلائی کھڑی تھی کہ سلیم صاحب بھی آ گئے، مگر ان کا جانے کا قطعی موڈ نہ تھا۔ اتنے میں جواد آ گیا اسے سلیم صاحب سے کوئی کام تھا۔ عروہ منہ بنائے کھڑی تھی۔
''اچھا ہوا تم آ گئے۔ عروہ کو شاپنگ پر لے جاؤ، میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ ہماری بٹی کا موڈ خراب ہو رہا ہے۔'' سلیم صاحب نے مسکرا کر کہا تو جواد نے اک نگاہ اس پر ڈالی۔
''ٹھیک ہے چاچو۔'' وہ فوراً ہی تیار ہو گیا تھا۔ تب سلیم صاحب نے ہزار کے کئی نوٹ مزید عروہ کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ عروہ تھینک یو پاپا کہہ کر بیگ میں رکھ کر مسکراتی ہوئی باہر کی طرف چلی گئی۔ جواد جانے کیوں خاموش سا ہو گیا۔ عروہ کا موڈ اب قدرے بہتر تھا۔ اسے صرف شاپنگ سے غرض تھی۔ بھلے ساتھ کوئی بھی ہو، مگر وہاں جواد تھا۔ عروہ کو اُس کا پتا بعد میں چلا۔
''کہاں چلنا ہے؟'' وہ مین روڈ پر گاڑی لا کر بولا۔
''یونائیٹڈ مال۔'' عروہ سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔
''ہوں......'' جواد نے ہنکارا بھرا اور گاڑی موڑ کر مطلوبہ راستے پر ڈال دی۔ اس سے پہلے وہ میوزک آن کر چکا تھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی گاڑی میں سُر بکھیر رہی تھی۔
دونوں چپ تھے۔ عروہ نے خیر کیا بات کرنی تھی۔ جواد بھی خاموش تھا۔ یونائیٹڈ مال کے پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کر کے وہ اسے ساتھ لیے سیڑھیاں چڑھنے لگا کہ عروہ کا پاؤں پھسلا۔

جواد نے فوراً اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ عروہ نے چھڑانا چاہا مگر جواد نے گرفت مزید مضبوط کر لی۔ عروہ تلملا کر رہ گئی۔

سفید بے داغ شرٹ اور نیوی بلیو جینز میں جواد کا اونچا لمبا سراپا وجیہہ شخصیت' وہ کئی نظروں کا محور بن رہا تھا۔ ساتھ میں عروہ جیسی حسن کی مورتی 'شاندار کپل' کے الفاظ کئی ہونٹوں پر آئے۔ جواد کا اِس پر استحقاق جمانا، خود جواد کو خواب سا لگ رہا تھا۔

ڈریس ویلی پر آ کے وہ اپنے لیے لباس پسند کرنے لگی۔ ایک سوٹ اسے بے حد پسند آیا۔ جواد اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

''یہ نہیں...... یہ لو......'' اچانک ہی جواد نے پنک اور اسکن کلر کے دلکش سوٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سوٹ واقعی شاندار تھا۔ مگر عروہ کی آنکھوں میں اُلجھن تیرنے لگی۔

پہننا مجھے ہے مجھے اپنی پسند کا لینا ہے۔'' عروہ اُس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے کچھ ہٹ دھرمی سے بولی۔

''دیکھنا مجھے ہے۔ بس یہی تم لو گی۔'' جواد نے نہ صرف کہا بلکہ کاؤنٹر تک آ گیا اور پیک کروالیا۔ عروہ بے بسی سے دیکھتی رہ گئی۔

پھر جیولری اور جوتا لینے پر بھی جواد نے اپنی مرضی چلائی۔ عروہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بے بسی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ جواد اپنا حق استعمال کرتا رہا۔

''تمہیں میری پسند میں ڈھلنا چاہیے۔ مجھے کیا پسند ہے کیا برا لگتا ہے کس چیز کو میں اچھا سمجھتا ہوں۔ اس پر تمہیں غور کرنا ہے اور عمل بھی۔'' جواد اس کے حوصلے کو آزما رہا تھا۔

یہاں تک کہ عروہ نے گرے کلر کا شولڈر بیگ پسند کیا۔ جسے جواد نے مسترد کر کے بے حد خوبصورت کالا بیگ اس کے لیے خریدا۔

عروہ کا جی چاہ رہا تھا کہ سب چیزوں کو بیچ چوراہے میں رکھ کر آگ لگا دے۔ اس پر جواد کا کہنا۔

''اور ہاں ان سب چیزوں کو تم نے ہی استعمال کرنا ہے۔ ضائع نہیں یہ نہ ہو کہ تم سب قیمتی چیزیں اُٹھا کر ماسی خیراں کو دے دو۔ اُس کی بیٹی کا تو مفت میں جہیز تیار ہوتا رہے گا۔'' جواد طنزیہ ہنسی لیے بولتا رہا اور وہ سنتی و سلگتی رہی۔

''کچھ کھا لیا جائے اب۔'' اُس کی نم آنکھوں میں جھانک کر جواد نے پوچھا۔

''مجھے کچھ نہیں کھانا۔'' عروہ دوسری طرف دیکھتے ہوئے انکار کر گئی۔

''کھانا تو پڑے گا، چلو یہاں سے تو چلیں۔'' سامان اٹھائے وہ حکمیہ انداز اختیار کرتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھے۔ عروہ کا موڈ سخت خراب تھا۔

جواد نے یہاں بھی زبردستی اسے اپنی پسند کا برگر کھلایا اور کولڈ ڈرنک پلائی عروہ آج سے پہلے خود کو کبھی اتنی بے وقوف نہ لگی کہ وہ جواد کے جھانسے میں آتی گئی۔ بے دلی دکھاتی منہ بنا کر کھاتی رہی۔ اس عالم میں بھی وہ جواد کے دل میں اُتر رہی تھی۔ اس پر جواد کا دل جلانے والا جملہ۔

''فرمانبردار بن کر تم اور بھی پیاری لگتی ہو؟'' عروہ نے اُسے گھور کر دیکھا اور جلدی جلدی پیپسی کے سپ لینے لگی کہ جلدی سے اس 'Teased' ماحول سے نجات حاصل کر سکے۔ جواد نے اُس کی جلد بازی محسوس کر لی تھی۔ عروہ فوراً کھڑی ہو گئی اور تیزی سے باہر آ گئی۔ جواد ساتھ چلتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔

''ہم یونہی ہمسفر بن کے چلتے رہیں۔'' عروہ کے دل سے صدا آئی۔ ''اللہ نہ کرے جی اللہ نہ کرے۔'' گاڑی میں اب منی بیگم کی صدا گونج رہی تھی۔ جو عروہ کو آج سے پہلے اتنی بری اور زہریلی نہ لگی تھی کہ
''اِک بار مسکرادو، اک بار مسکرادو''
جواد کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور عروہ پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ ناہید اور سلیم صاحب کو اُس کی شاپنگ بے حد پسند آئی۔ جواد جا چکا تھا۔ عروہ سخت اُلجھی ہوئی تھی۔
''یہ کیا بات ہوئی پاپا، اس نے میری پسند کی کوئی چیز نہیں لینے دی۔ ذرا یہ بیگ دیکھیں مجھے گرے پسند تھا اور اس نے یہ بلیک لے لیا۔'' عروہ کی آنکھیں بھر آئیں۔
''ناہید نے اسے گلے لگالیا۔ بیٹا یہ تو بہت نفیس ہے جواد کی پسند بری نہیں۔'' ناہید نے اُس کا دل رکھنا چاہا۔
''آپ بھی اُس کی سائیڈ لے رہی ہیں۔'' عروہ ابھی تک اپنی چیزوں کا غصہ نکال رہی تھی جبکہ ناہید اور سلیم ہنس رہے تھے۔ اگلے دن وہ آئینہ کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ آئینہ کے دماغ میں کئی سوچیں چل رہی تھیں۔
''واقعی...... تم اتنی کمزور کیسے پڑ گئیں اس کے سامنے عروہ۔'' آئینہ تاؤ دلا رہی تھی۔
''کیا کرتی پھر؟'' عروہ پلکیں صاف کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں بولی۔
''انکار کر دیتیں۔ نہ لیتیں۔'' آئینہ اُسے طیش پہ طیش دلا رہی تھی۔ ''یہی حال رہا تو تم اس سے اک دن بیاہ بھی رچا بیٹھو گی۔'' آئینہ کا کہنا تھا کہ عروہ پھٹ پڑی۔
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا میں اس ضدی، اکھڑ مزاج اور من مانی کرنے والے سے ہرگز، ہرگز شادی نہ کروں گی۔ دیکھ لینا انکار نہ کیا تو میرا نام بھی عروہ سلیم نہیں۔'' آئینہ کے سارے نشانے ٹھیک جگہ پر لگ رہے تھے۔ اس نے عروہ کے دل سے جواد کو کسی حد تک اُتار لیا تھا۔ اب وہ نئی ترکیبیں سوچ رہی تھی۔
صحیفہ کی شادی کے دن قریب آ گئے۔ عروہ دو دن پہلے ہی سمیرا پھپھو کے گھر آ گئی۔ ڈھولک بجانے، ہلا گلا کرنے میں اسے خوب مزا آ رہا تھا۔ مہندی والے دن وہ سبز اور پیلے دلکش سوٹ میں حسن کی دیوی لگ رہی تھی۔
عمرانہ نے آ کر اُس کی خوب بلائیں لیں۔ جواد بھی اُسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر بارات اور ولیمے کے دنوں میں تو جیسے اُس پر حسن ٹوٹ کر برسا تھا۔ ہر نگاہ بس اُسی پر ٹھہری تھی۔
عروہ کے کانوں نے اڑتے اڑتے سنا کہ عمرانہ کسی خاتون کو بتا رہی تھیں کہ عروہ اُن کی بہو بنے گی۔ عروہ کے اندر تک کڑواہٹ اُتر آئی۔
اِدھر آئینہ بہانے بہانے جواد کے پاس آتی۔ کبھی کھانے کا پوچھتی کبھی کوئی اور بات کرتی۔ جواد اسے محض ایک کزن اور چھوٹی بہن کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ اُس نے محسوس ہی نہ کیا کہ آئینہ کی آنکھوں میں کون سے رنگ اُترے ہوئے ہیں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آئینہ دل میں کیا لیے پھرتی ہے۔
اس کے برعکس عروہ اُس سے کتراتی پھرتی، جواد کو پتا تھا کہ وہ اُسے تنگ کرتا ہے اس لیے عروہ اُس سے دور رہتی ہے۔ مگر اُس کی سوچ کے کسی حصے میں نہ تھا کہ عروہ اُس سے اس حد تک دور ہو رہی ہے اور اپنے تئیں اس رشتے کو ختم کر چکی ہے۔ یہ سوچ بنا کہ جواد اُس سے کتنی کچی اور

کھری محبت کرتا ہے۔

☆......☆......☆

جواد نے کئی سال پہلے ہی اپنی سالگرہ منانی ترک کردی تھی اب وہ بچہ تھوڑی تھا۔ آج بھی وہ اس دن کو فراموش کیے بیٹھا تھا۔

آفس سے آکر وہ لیٹا تھا کہ سمیرا پھپو کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ کسلمندی سے بستر میں پڑا تھا کہ دروازہ ناک ہوا۔

''یس۔'' کہتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھا۔ آئینہ اندر آگئی۔

''اوہ......کیسی ہو؟'' آداب سلام کے بعد جواد نے پوچھا۔

''آپ کی دعا ہے، مبارک ہو۔'' آئینہ اٹھلا کر بولی۔

''کس بات کی؟'' جواد نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

تب آئینہ نے بیگ سے خوبصورت پیکنگ میں لپٹا تحفہ اس کے سامنے کردیا۔

''سالگرہ مبارک ہو۔'' جواد حیرت سے دیکھتے ہوئے اُس کی بات پر غور کرتے ہوئے بولا۔

''ارے شکریہ......مگر اس کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے سالگرہ منانی ہی چھوڑ دی۔ خیر تمہیں یاد رہا، شکریہ۔'' جواد بڑے بھائیوں کے انداز میں بولا تھا۔

آئینہ اندر سے بل کھا کر رہ گئی۔

''آؤ باہر پھپو سے ملتے ہیں۔'' وہ اُسے ساتھ لیے لاؤنج میں آگیا اور سب باتیں کرنے لگے آئینہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی تھی۔

آج صبح جب عروہ نے اسے جواد کی سالگرہ کا بتایا تو اُس نے عروہ کو خوب لتاڑا، کہ خبردار جو اُس نے جواد کو سالگرہ کی مبارکباد دی۔ ورنہ وہ یہی سمجھے گا کہ تم اس سے محبت کرتی ہو، چاہتی ہو اُسے۔''

آئینہ کے الفاظ میں وزن تھا۔ عروہ وہیں رُک گئی۔ ورنہ وہ تو جواد کی سالگرہ کا کئی دن پہلے سے سوچے بیٹھی تھی۔ اب موڈ بدل گیا تھا۔ تب وہ سر ہلا کر بولی۔

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، بھلا مجھے کیا پڑی ہے اس اکھڑ مزاج کے منہ لگوں۔'' عروہ کا کہنا تھا کہ آئینہ کے دل کی کلی کھل گئی۔

عروہ پوری طرح اُس کی باتوں میں بلکہ جال میں پھنس چکی تھی۔ یوں آج آئینہ نے دل کے ہاتھوں مجبور کر جواد کو پانے کے لیے پہلا قدم اٹھالیا۔

جواد جسے دیکھتے ہی اُس کے اندر کا حسد پوری طرح عود کر آتا تھا کہ اُسے جواد کو عروہ سے ہر حال میں چھین لینا ہے۔ اب جو دل چاہتا تھا وہی کررہی تھی۔ دماغ سے سوچے بغیر۔ انجام سے بے خبر ہو کر۔

☆......☆......☆

جواد کا دل بے حد اُداس ہو رہا تھا۔ اُسے عروہ سے اس قدر بے رخی کی امید نہ تھی کہ وہ اسے سالگرہ دو لفظ کہنے بھی نہ آسکتی تھی۔ یکدم اُسے آئینہ کا تحفہ یاد آیا۔

کھولا پرفیوم کے ساتھ کارڈ منسلک تھا۔

''جواد کے لیے......بہت محبت کے ساتھ۔''

جواد اس کے لکھے الفاظ پر دم بخود رہ گیا۔ یہ الفاظ کسی بہن کی محبت جیسے نہ تھے۔

تب بے اختیار اُسے شادی کے دنوں میں آئینہ کا بہانے بہانے سے اُس کے نزدیک آنا اُس سے بے تکلف ہونا یاد آنے لگا۔

''یہ آئینہ کن چکروں میں پڑ رہی ہے اُسے معلوم ہے کہ میں عروہ کا ہوں، پھر بھی۔'' جواد نے بے دلی سے دونوں چیزیں سائیڈ میز پر رکھ دیں۔ اور عروہ کے رویے کے بارے میں سوچنے لگا۔

☆......☆......☆

دن اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہے تھے۔ کئی دنوں سے اس نے عروہ کو نہ دیکھا تھا۔ اب وہ ڈرائیور کے ساتھ کالج آتی جاتی تھی۔ انہی دنوں جواد کی ترقی ہوگئی۔ اُسے بھرپور محنت کا صلا ملا۔ حفیظ اور عمرانہ بے حد خوش تھے۔

عمرانہ نے مٹھائی منگوائی اور جواد کے حوالے کی، کہ ناہید اور سلیم کو دے آئے۔'' جواد اندر ہی اندر بہت خوش ہوگیا۔

''او کے امی!'' وہ بڑا ڈبہ اٹھائے پھولوں کی درمیانی باڑھ پار کر کے بنا کھٹکے کے اندر کی طرف آ گیا۔

دروازہ کھلا ہی رہتا تھا سو کھلا تھا۔ لاؤنج سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔

عروہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ جواد اُس کی پشت پر تھا کہ یکدم وہ چونک گیا۔ کیونکہ عروہ اُس کا ذکر کر رہی تھی۔

''میں اور جواد سے شادی، ناممکن، تم یقین کرو آئینہ میں نے اگر اس سے شادی کرلی تو میں ساری عمر روتی ہی رہوں گی۔ آئینہ تم سچ کہتی ہو۔ وہ واقعی بہت عجیب ضدی، حق جتانے والا اپنی چلانے والا انسان ہے۔ تم کتنی اچھی ہو۔ میری پیاری دوست جو مجھے اس سے بچالیا۔ آج میں تمہارے مشوروں پر نہ چلتی تو سچ میں بہت غلط فیصلے کر جاتی۔ وہ کوئی آخری مرد نہیں ہے کہ میں حامی بھرلوں۔''

''تم نے مجھے کھائی میں گرنے سے بچالیا۔ میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔'' جواد سے اور کچھ نہ سنا گیا۔ صدمے اور غصے سے وہ اُلٹے قدموں واپس آ گیا۔ سارا کھیل اُس کی سمجھ میں آرہا تھا۔ آئینہ اُسے متنفر کر کے خود مجھے پانا چاہتی ہے۔ جواد کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ آئینہ کا گلا دبادے۔

''ارے کیا ہوا...... واپس کیوں لے آئے۔'' عمرانہ اُسے دیکھتے ہی بولیں۔ جو مٹھائی کا ڈبہ جوں کا توں اٹھائے کھڑا تھا۔

''آپ خود دے آیئے گا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے بجانا مناسب نہ سمجھا۔'' جواد بے ربط سا بولتا اپنے کمرے میں آ گیا۔ ڈبہ وہیں میز پر رکھ دیا۔

عمرانہ اُس کا رویہ دیکھ کر حیران سی تھیں۔

''اُف، کمرے میں آ کر وہ بستر پر ڈھے سا گیا۔ عروہ کے الفاظ سیسہ بن کر کانوں میں اُتر رہے تھے۔

''کیا اتنی نفرت...... میں اس سے جس قدر محبت کرتا ہوں اور وہ کس قدر پاگل ہے۔'' عروہ کا گریز اُس کی بے رخی سب سمجھ میں آرہا تھا۔ تب اک مسکراہٹ اُس کے لبوں پر اتر آئی۔

''بھولی ہے بالکل...... ناسمجھ سی تمہیں پیار کرنا سکھانا پڑے گا۔'' وہ سوچتے سوچتے اندر تک مطمئن ہوگیا۔ اگلا قدم یہ تھا کہ اُسے فی الفور عروہ سے نکاح کرنا تھا۔

☆......☆......☆

دو دن کی سوچ بچار کے بعد تمام معاملات کا جائزہ لینے کے بعد تیسرے دن اس نے ناشتے کے بعد اپنا مدعا بیان کر دیا۔ حفیظ اور عمرانہ حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''کیوں بیٹا کوئی مسئلہ ہے کیا۔'' عمرانہ نرمی سے بولیں۔ تو حفیظ مسکرا دیے۔ ضرور جواد نے کچھ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا۔

''کوئی مسئلہ نہیں امی...... بس آپ اس جمعہ کو نکاح رکھ لیں۔ رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی۔ کوئی لمبا چوڑا پروگرام بھی نہ بنائیں۔'' وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتا کہتا اُٹھ گیا۔ تو عمرانہ اور حیرتوں میں ڈوب گئیں۔

''بیگم کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔ جواد نے یونہی تو ایسا کرنے کو نہیں کہا۔'' حفیظ چند لمحے سوچنے کے بعد بولے۔

''ہاں مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ خیر شادی تو ہونی ہے چلو اس تقریب کے بہانے کچھ ہلا گلا ہو جائے گا۔''

حفیظ نے خوشی کا اظہار کیا۔ یوں دونوں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے لگے، دن بھی کم تھے۔

رات وہ سلیم اور ناہید سے ملنے چلے آئے اور مدعا بیان کر ڈالا۔

''ارے اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کیا بات ہوگی۔ بھائی صاحب جیسا آپ کا حکم۔'' سلیم سر جھکا کر بولے۔ یوں کچھ معاملات طے کرنے کے بعد وہ چائے پی کر گھر آ گئے۔

ناہید عروہ کو دودھ کا گلاس دینے آئیں۔ تو اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

''عروہ!'' وہ پیار سے بولیں۔

''جی امی!'' عروہ موبائل رکھ کر اُن کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تمہیں پتا ہے ناں ابھی بڑے بھائی صاحب اور بھابی آئے تھے۔''

''جی......'' عروہ کا دل جیسے سکڑ کر پھسلا تھا۔

''اس جمعہ کو تمہارا اور جواد کا نکاح ہے۔ رخصتی تمہارے پیپرز کے بعد ہوگی۔'' ناہید کا کہنا تھا کہ عروہ کے آس پاس دھماکے ہونے لگے۔ اُس کا رنگ جیسے بدلا۔ وہ حواس باختہ سی ہوگئی۔

''نہیں امی...... پلیز مجھے جواد سے شادی نہیں کرنی۔'' وہ جیسے رو پڑی۔ ناہید ہکا بکا رہ گئیں۔

''کیا کہہ رہی ہو، تمہیں بچپن سے معلوم تھا۔ اس بات کا پھر انکار کیوں؟'' ناہید ذرا تلخی سے بولیں۔

''ہاں تو آپ نے اپنی مرضی کی...... مجھ سے پوچھ کر کب ایسا کیا۔ میری اُس کی بنتی کب ہے۔ نہ مزاج نہ عادت۔'' وہ اکھڑے انداز میں بولی۔

''بس...... اس بات کو یہیں دفن کر دو۔ خبردار جو بات کسی کو پتا چلی حد ہوگئی ہے۔ ہمارے لاڈ پیار کا یہ صلہ دے رہی ہو تم۔''

''کیا برائی ہے جواد میں...... اپنا بچہ، دیکھا بھالا، شریف، اعلیٰ ملازمت، وجیہہ شخصیت' پاگل ہوگئی ہو تم۔'' ناہید کا غصہ شدید تر تھا۔ عروہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

''وہ بہت ضدی اور اکھڑ ہے۔'' عروہ کو یہی کہنا یاد رہا۔

''بیٹا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ جواد بہت نفیس اور ہمدرد بچہ ہے۔ ہماری گودوں میں کھیلا ہوا۔ اس میں کوئی بری عادت نہیں۔ تھوڑا مزاج تیز ہے۔ تو کیا ہوا؟ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میاں بیوی میں دوستی و محبت کا رشتہ تب قائم ہوتا ہے جب دونوں کے دل صاف ہوں۔ ایک دوسرے میں برداشت کا مادہ ہو، اچھی بری عادتیں ہر کسی میں ہوتی ہیں۔ تم ابھی سے دل میں غلط فہمیاں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ پھر عمرانہ بھابی تم سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ سب تمہیں

چاہتے ہیں۔'' وہ انتہائی نرمی و پیار سے اُسے سمجھا رہی تھیں۔ مگر عروہ کے دل میں آیا اُبال اور ملال کم نہ ہوا۔ ناہید نے اُسے دودھ پینے کی تلقین کرتے ہوئے آخری بات کی۔

''اور ہاں تم ہماری بیٹی ہو۔ ہماری عزت ہو۔ اور ہماری عزت تمہارے دم سے ہے۔ کوئی ایسی بات نہ کرنا کہ زندگی بھر کی عزت خاک میں مل جائے۔ مجھے اپنی بیٹی پر مان و فخر ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ تم ہمارا مان اور فخر قائم رکھو گی۔'' چلو اب دودھ پی کر سو جانا۔ اُس کی روشن پیشانی چوم کر ناہید باہر آ گئیں عروہ کو سوچوں کے گرداب میں چھوڑ کر۔

''اُف کیا کروں......'' ناہید کے جانے کے بعد عروہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ساری زندگی ہر لمحہ اُس شخص کے ساتھ گزارنا۔ کیسے ہوگا یہ سب، سوچتے سوچتے جانے کس پل اُسے نیند آنے لگی۔ دودھ کا گلاس جوں کا توں رکھا تھا۔ لائٹ بند کر کے وہ بستر پر ڈھے گئی اور نیند نے اسے ہر سوچ سے آزاد کر دیا۔

آئینہ نے سنا تو جیسے سارے خواب مسمار ہوتے نظر آئے۔ اندر سے حسد و صدمے کی لہریں اٹھنے لگیں۔ صرف 6 دن بعد ہی جواد اور عروہ کا نکاح تھا۔ عروہ بے حد خاموش تھی۔ دوسرے لفظوں میں بے بس و لاچار۔ آئینہ تلملا رہی تھی۔

''تم مان کیسے گئیں؟'' وہ اس پر چڑھ دوڑی۔

''کیا مطلب؟'' عروہ نے اُلٹا اس پر سوال داغا۔

''مطلب تم تو جواد کو ناپسند کرتی تھیں، اس سے بیزار تھیں۔ وہ تمہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ تم پر رُعب جماتا تھا۔ آئینہ حقیقت میں اُسے آئینہ دکھا رہی تھی۔ عروہ کا سر جھک گیا۔ وہ آہستہ آہستہ بولی۔

''میں کیا کروں......اور ایک مشرقی لڑکی اور کر بھی کیا سکتی ہے۔'' وہ سسکی۔

''بزدل کہیں کی......'' آئینہ ہولے سے بڑبڑائی۔ عروہ بس سسکیاں لیتی رہی۔

☆......☆......☆

دونوں گھروں میں تیاریاں ہو رہی تھیں۔ آئینہ جلے پیر کی بلی کی طرح دن گزار رہی تھی۔ عروہ سے جواد کی ملاقات و دیکھنے پر پابندی تھی۔ جواد اس دوران بس ایک بار ہی آیا۔ تب وہ کمرے میں تھی۔ جواد ایک بار آئینہ سے ملنا چاہتا تھا۔ نکاح سے پہلے، یہ آئینہ ہی تھی جس نے عروہ کے دماغ میں خناس بھرا تھا۔ عروہ اب کالج نہ جاتی تھی۔ یہ اچھا موقع تھا۔

آفس سے اٹھ کر وہ سیدھا کالج آ گیا۔ سوئے اتفاق آئینہ بس کا انتظار کر رہی تھی کہ جواد کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئی۔ دوسرے پل دل مارے مسرت کے بلیوں اچھلنے لگا۔

''آپ......'' وہ گڑبڑائی۔ انتہائی سنجیدگی سے جواد اُسے گاڑی میں بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔ آئینہ کے دل کی کلی کھل گئی۔ وہ جلدی سے فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔ اندر کلون کی دلفریب مہک نے اُس کا بھرپور استقبال کیا۔

''آپ کیسے آ گئے؟'' آئینہ بولی تو اپنے خدشے کی تصدیق پر جواد کا تنا چہرہ اور تپ گیا۔ وہ گاڑی آگے بڑھا کر بولا۔

''آئینہ تمہیں شرم آنی چاہیے۔'' الفاظ تھے کہ آئینہ کا دماغ بھک سے اڑا۔

تم نے عروہ کے دماغ میں میرے خلاف کیا کیا بھرا، آخر کیوں؟'' وہ اس قدر چلا کر بولا کہ

آئینہ سہم کر کانپی۔
"مجھے کیوں الزام دے رہے ہیں۔ آپ کا رویہ ہی ایسا ہے کہ عروہ آپ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔" آئینہ اب خود کو سنبھال کر بولی تھی۔
"بس کرو مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔ تم اسے میرے خلاف بھڑکاتی رہی ہو۔" عروہ کے انکار کا سن کر تو جیسے جواد کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔
"میں ایسا کروں گی؟" آئینہ گڑبڑا کر بولی۔
"اس لیے کہ تم سے اپنے راستے کا کانٹا سمجھتی ہو۔ مجھے حاصل کرنے کے لیے تم نے عروہ کے دل و دماغ میں میرے لیے نفرت کے بیج بوئے۔ میں تمہاری حرکتوں کو سمجھ گیا تھا۔ مگر اب کان کھول کر سن لو، میں اُسے تمہاری نادانی سمجھ کر معاف کرتا ہوں۔" آئینہ کا سر جھک گیا۔ آنکھیں پانیوں سے بھر آئیں۔ شرمندگی کے مارے وہ رو دینے کو تھی۔ جیسے یکدم کسی نے سر سے چادر چھین لی ہو، بے لباسی کا احساس ہوا تھا۔
"تم میری چھوٹی بہنوں کی طرح ہو آئینہ۔" جواد کا لہجہ اُس کی حالت دیکھ کر پسیج گیا۔ وہ اسے مدبرانہ انداز میں سمجھانے لگا۔ کسی بزرگ کی طرح۔
آئینہ کو اپنی غلطی کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ آنسو بند توڑ کر گالوں کو تر کرتے اُس کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ وجود لرزہ براندام تھا۔ جواد کو اُس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ اُس نے ٹشو اُس کی طرف بڑھایا اور نرمی سے بولا۔
"تمہاری اس غلطی پر تمہیں معاف کرتا ہوں۔ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے میری کوئی بہن نہیں۔ تمہارا کوئی بھائی نہیں۔ میں پہلے بھی تمہیں بہنوں جیسا سمجھتا تھا۔ اور آج سے تم میری سگی بہنوں سے بھی بڑھ کر ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے آئینہ کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ تب وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔
"پلیز مجھے معاف کر دیں جواد بھائی۔ میں بہت غلط سوچ رہی تھی۔ مجھے خود سے گھن آ رہی ہے۔" آئینہ بھرائی آواز میں اپنی غلطی کا اعتراف کر رہی تھی۔ جواد مسکرا کر بولا۔
"بس اب چپ ہو جاؤ اور شکر ہے یہ بات کسی کو پتا نہیں چلی اور تم عروہ سے اب اس سلسلے میں کچھ نہ کہو گی۔ بس اپنے بھائی کی خوشی میں شامل ہونے کے لیے بھرپور تیاری کرو۔" جواد خوش دلی سے بول رہا تھا۔
آئینہ پرسے گرد ہٹ رہی تھی۔ وہ چہرہ صاف کر کے سر ہلا کر رہ گئی۔ گھر آنے پر جواد باہر آیا۔ اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ آئینہ مسکرا دی۔
"اندر نہیں آئیں گے۔" وہ اُسے بلانے لگی۔
"نہیں اور تم کسی سے ذکر بھی نہ کرنا۔ فی الحال چلتا ہوں۔ پھر آؤں گا۔ جیتی رہو۔" یہ کہہ کر اُس نے گاڑی موڑ لی۔ آئینہ اُسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اس نئے واقعہ پر حیران بھی تھی خوش بھی کہ خدا نے اُسے ذلت سے بچا لیا تھا۔ اور اک نئے پاکیزہ رشتے سے آشنا کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

پورا گھر بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ آخر اکلوتے بیٹے، بیٹی کا نکاح تھا۔ عروہ بے حد سنجیدہ تھی۔ دلہن بن کر اُس پر خوب روپ آیا تھا۔ جواد کی وجاہت بھی کم نہ تھی۔ ایجاب و قبول کے بعد دونوں کو ایک ساتھ بٹھا دیا گیا۔ عمرانہ اُس کی بلائیں لے رہی تھیں۔

خوب پیار کر رہی تھیں۔

آئینہ اس موقع پر خوب چہک رہی تھی۔ گویا سگے بھائی کا نکاح ہو۔ بہت ہلا گلا تھا۔ ہزاروں تصویروں میں عروہ کا من موہنا روپ قید ہو رہا تھا۔ جواد نے جی بھر کر اسے دیکھا۔ وہ لگ رہی اتنی پیاری رہی تھی۔

رات گئے تقریب کا اختتام ہوا۔ آئینہ اس کے پاس ہی رُک گئی تھی۔ عروہ بھی لباس تبدیل کر کے جیولری اُتار کر ہلکی پھلکی ہوگئی۔ تاہم بے حد چپ تھی۔ عجب تناؤ اس کے چہرے پر تھا۔

آئینہ اُس کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔ اسے سامنے بٹھا کر بولی۔

''کیا بات ہے تم بہت عجیب ہو رہی ہو۔'' آخر کار اس نے پوچھ لیا۔

''تمہیں سب پتا ہے پھر یہ سوال کیوں؟'' عروہ انتہائی سنجیدگی سے بولی۔

''عروہ سب بھول جاؤ۔ اب تم جواد بھائی کی بیوی ہو۔ وہ واقعی بہت نائس انسان ہیں۔ ہماری سوچ اُن کے بارے میں بہت غلط تھی۔'' عروہ حیرت سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''عروہ ہم لڑکیاں بہت بے وقوف ہوتی ہیں۔ کچی عمروں میں ان کی سوچیں بھی ریت کی مانند ہوتی ہیں۔ جو ذہن سے پھسلتی رہتی ہیں۔ اور غائب ہو جاتی ہیں۔

ہم عقل سے پیدل، اس عمر میں ہمارے اندر سمجھنے اور پرکھنے کی بہت کمی ہوتی ہے۔ جب تک کوئی بڑا ہمیں صحیح راہ نہ دکھائے۔ تب تک ہم غلط ہی کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں جب درست سمت کی پہچان کرائی جاتی ہے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم واقعی بے وقوف ہیں۔''

''جواد بھائی تم سے بہت سچی محبت کرتے ہیں، آج تم نے دیکھا نہیں کہ ان کی نظروں میں تمہارے لیے عزت، پیار، محبت، احترام اس نئے رشتے کی الوہی چمک، دمک رہی تھی۔

پلیز تم سب پچھلی باتیں بھول جاؤ اور اب اس نئی زندگی، نئے رشتے کے بارے میں سوچنا، اللہ وہی کرتا ہے جو ہمارے لیے بہتر ہوتا ہے۔''

''ہم تو بس ایویں ہی پاگل سے بندے ہیں۔'' آئینہ یکدم کھلکھلا کر ہنس پڑی تو عروہ اُس کی باتوں پر غور کرنے لگی۔

''آؤ گفٹس دیکھیں۔ واؤ...... جواد بھائی نے تمہیں کس قدر پیاری انگوٹھی پہنائی ہے۔'' آئینہ اُس کا مخملی ہاتھ تھام کر مخروطی انگلی میں پھنسی انگوٹھی کو تعریفی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تو عروہ اس لمحے کو یاد کرنے لگی جب جواد نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے انگوٹھی پہنائی تھی۔ اُسے اس وقت کچھ احساس نہ ہوا۔ اب وہ لمحات یاد آئے تو شرم نے آن گھیرا۔

آئینہ نے دیکھا کہ انگوٹھی دیکھتے ہوئے عروہ کے چہرے پر شرمیلی مسکان نے احاطہ کر لیا تھا۔ تب وہ جان گئی کہ عروہ کے دل میں جواد نے جگہ بنالی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں دونوں کو خوش رہنے کی دعائیں دیں۔ رات گئے باتیں کرتے کرتے کہیں وہ جا کر سوئیں۔

☆......☆......☆

عروہ اب اس نئے رشتے کے حوالے سے سوچتی۔ تو دل میں عجب گدگدی کا احساس پیدا ہونے لگتا۔ وہ تصور ہی میں جواد سے باتیں کرنے لگتی یکدم وہ خود سے بھی قریب محسوس ہونے لگتا۔

☆......☆......☆

موسم بہت سرد ہو گیا تھا۔ آج صبح سے ہی

دھند کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔
ناہید اور حفیظ کو آج دوسرے شہر جانا تھا۔ کسی عزیز کی عیادت کے لیے سو وہ دوپہر کے بعد روانہ ہوگئے۔
رات وہیں رہنا تھا۔ ماسی خیراں عروہ کے پاس تھی۔ آفس سے آکر جواد کام میں لگ گیا۔ سرِ شام ہی پھر دھند پڑنے لگی تھی۔ سبھی آج بستروں میں دبکے پڑے تھے۔
جواد آج کی تاریخ کیسے بھول سکتا تھا۔ 25 جنوری آج عروہ کی سالگرہ تھی۔ وہ اُس کا تحفہ بھی لے چکا تھا۔
چائے پی کر وہ کھڑکی کھول کر یونہی دیکھنے لگا تو لان میں عروہ نظر آگئی۔
سخت سردی میں اُسے جھرجھری سی آگئی۔ وہ جانتا تھا عروہ اس موسم کی دیوانی ہے۔ لبوں پر مسکراہٹ لیے وہ دراز کھول کر ڈبیہ جیب میں رکھ کر باہر آگیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ہی تو وہ دشمنِ جاں کھڑی تھی۔
ذرا آہٹ پر مڑی تو جواد کو پیچھے کھڑا پایا۔ دونوں دھند کے بیچ کھڑے تھے۔
''آپ......'' عروہ گھبرا کر بولی۔
''اتنی سردی میں پاگل ہوگئی ہو کیا؟'' جواد کا لہجہ فکرمند سا تھا۔ عروہ مسکرادی۔
''اتنا مزا آرہا ہے۔'' اُس کی آواز میں خوشی کے گھنگھرو بول رہے تھے۔ جواد قریب آگیا۔ اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔
''آج کیا تاریخ ہے پتا ہے ناں۔ 25 جنوری سالگرہ مبارک ہو۔ تم نے تو مجھے بھلا دیا ناں۔ عروہ جن سے محبت ہوتی ہے ان کے بارے میں باخبر رہا جاتا ہے۔ جواد کی آواز محبت سے چور تھی۔
''سوری۔'' عروہ یکدم بولی۔
''معاف کیا......اور ہاں تمہیں جو شکایت ہو مجھ سے ہی کرنا۔'' عروہ اُس کی بات پر بول ہی نہ سکی۔
''اپنا گفٹ نہیں لوگی۔'' جواد کی قربت میں سرشاری تھی۔
''دے دیں......'' عروہ بھی حق سے بولی۔
تب جواد نے دو نازک سے گولڈ کے کڑے اُس کی کلائی میں ڈال دیے اور اُس کے ہاتھ تھام لیے۔ عروہ کسمسائی۔
''بہت سردی ہے۔ چلو اندر۔ دیکھو تو کیسی دھندلی چاندنی ہو رہی ہے اور سخت سردی۔'' جواد اسے ساتھ لیے اندر آگیا۔
عروہ کو تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ جواد نہ صرف محبت کرنے والا بلکہ بہت خیال رکھنے والا تھا۔
''جاؤ اور سو جاؤ......میری نیند اڑا کر۔'' وہ شرارت سے سرگوشی کرتا مسکراتا ہوا اندر کی جانب مڑ گیا۔
عروہ کے اندر خوشی وانبساط کے موسم رقصاں تھے کہ جواد جیسا شاندار شخص اُس کا نصیب ہے۔ اُس کی چھوٹی بڑی خوشی محسوس کرنے والا سب نے ان دلفریب لمحات میں اُس کی سالگرہ منا ڈالی۔
مگر سب سے پیارا اور انمول تحفہ تو اُس کی محبت تھی۔ جس نے عروہ کی پور پور پر قبضہ کر کے اُسے جواد کا اسیر بنا ڈالا تھا۔ اور یہ سالگرہ اُس کی زندگی کی حسین ترین سالگرہ تھی۔
جس نے عروہ کے اندر خوشی کے سارے پھول کھلا دیے تھے۔

☆☆......☆☆

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

''تم اس طرح نہیں جاسکتے ہو عبدالعلی! اس سلسلے کو ختم کرو۔ ورنہ اس سے شادی کرلو۔ کم از کم گناہ سے ہی بچ جاؤ گے۔ شادی تو تم نے ویسے بھی دوسری کرنی ہی تھی۔ آف کورس تمہارے باپ کی روایت جو ٹھہری کہ یہ...... '' وہ ایک دم نہ صرف چپ ہوئی بلکہ بری طرح لڑکھڑا کر پوری قوت سے......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا بائیسواں حصہ

پھر قدر یہ سب آرائشیں مردوں کو متوجہ کرتی ہیں۔ مائل کرتی ہیں۔ میں شرعی پردہ نہیں کرتی کزنز سے البتہ آرائش سے ضرور بچتی ہوں۔ اللہ توفیق عطا فرمائے تو شرعی طریقے سے پردہ بھی کرنے لگوں گی۔''

وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ جبھی قدر نے آہ بھر کے سر جھکا لیا تھا۔ اتباع نے حیرانی سے اس کا یہ ملول انداز دیکھا۔

''کیا ہوا قدر......!'' اسے تشویش لاحق ہوئی۔

''میں تمہارے جیسی نہیں بن سکتی ہوں کبھی شاید اتباع! جبھی تمہارے بھائی کے دل پر حکومت بھی نہیں کر سکتی شاید...... آج ہماری زندگی کا بے حد اہم دن تھا۔ میں بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔ کس کے لیے......؟ تمہارے بھائی جان کے لیے آف کورس......! مگر انہوں نے مجھے ایک نگاہ سے نوازنا بھی گوارا نہ کیا۔ بلکہ میرے بجائے اس امن فساد کو دیکھتے رہے۔ دل جل رہا ہے میرا۔'' وہ پھر سے کلسنے لگی۔ اتباع گہرا متاسفانہ سانس بھر کے رہ گئی۔

''امن سے جیلس مت ہو پلیز! بھائی جان کا ان سے ہرگز ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اتباع نے عاجزی سے یقین دلانا چاہا تھا۔ وہ اس قدر متنفر ہوئی۔

''جس دن اس کی بات پکی کرنے ہم ان کے گھر گئے۔ موصوف اس کے کمرے سے برآمد ہوئے تھے۔ پھر نتیجہ یہ نکلا کہ محترمہ نے رشتے سے ہی انکار کردیا۔ کسی کے لحاظ کے بغیر...... کیا سمجھوں میں اس سے؟'' وہ چیخی۔ اتباع نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ حقیقت جانتی تھی۔ مگر وہ اس لائق نہیں تھی کہ بتائی جاتی۔ یہاں شنوائی کے چانس نہیں تھے۔ ارسل اپنی جگہ سے سرکنے پر آمادہ نہ تھا۔ پھر اس چرچے کا فائدہ۔ لیکن آنے والے وقت میں اس خاموشی سے کتنا نقصان

ہونے والا ہے۔ اس کا اندازہ اگر اتباع کو ہوتا تو لازماً وہ اسی وقت عبدالعلی کی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے بات کو واضح کر دیتی۔ وضو کر کے وہ نماز پڑھنے کو گئی جبکہ قدر وہیں بیٹھی رہی تھی۔ اب یہ حالات کے رخ کی تھی ساری معنی خیزی جس نے اس کا بدگمانی سے بھرا دماغ مزید سلگا ڈالا تھا۔ نماز پڑھ کر واپس آنے والا عبدالعلی ہی تھا۔ جو اس کے پاس سے گزر کر اندر چلا گیا تھا۔ قدر اس نظر اندازی پر جتنا بھی جلی ہو البتہ وہاں مزید بیٹھی نہیں رہی۔ اس جھنجلاہٹ اور غصے میں اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اب بھوک کا احساس گہرا ہو کر اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ ہر خیال وقتی طور پر اپنے ذہن سے جھٹک کر وہ کچن کی جانب آئی تھی۔ مگر دروازے پر ہی رک جانا پڑا۔ کچن میں عبدالعلی امن کے ساتھ موجود تھا۔ اس سے محض تھوڑے فاصلے پر کھڑا وہ غالباً اس کے آنسو پونچھ کے ہٹا تھا۔

''تمہارے جذبات اتنے بے مایا نہیں ہونے چاہئیں ہیں امن! پلیز اس کا فائدہ بھی نہیں ہے۔ بہتر ہے تم خود کو مزید کسی آس میں رکھ کر برباد نہ کرو۔ نکل آؤ اس فیز سے...... ورنہ ہم میں سے کوئی بھی خوش نہیں رہ پائے گا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ آج اگر سب اس بات سے ناواقف ہیں تو ہمیشہ ضروری نہیں ایسا ہی رہے۔ ذرا سوچو...... اگر بوجانی کو پتا لگا تو......''

معاً عبدالعلی اس کی موجودگی کو محسوس کر کے ہی ایکدم گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔ قدر کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے جیسے، اُس کی نگاہوں میں اتنی بدگمانی...... اس کی وجہ گہرا شک تھا کہ عبدالعلی ایک لمحے کو سہی چکرا سا گیا۔ گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی اسے قدر کے سامنے اپنا آپ مجرم محسوس ہوا۔

''صرف تسلی دینے سے بات نہیں بنے گی۔ آپ اس کے دکھ کا مداوا کریں۔ شادی کر لیں اس سے۔'' وہ جس انتہا درجے کی بدگمانی اور خود ساختہ یقین کی سرحد پر کھڑی تھی۔ جذباتیت اور غصے کی انتہاؤں پر تھی وہیں ایسی بات کہی جا سکتی تھی۔ امن کے پیروں تلے سے زمین سرکی تھی۔ چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہوا تھا۔ تو عبدالعلی اس درجہ بدتمیزی بے لحاظی اور گستاخی پر قہر و غیض سے بپھر کر چیخا تھا۔

''شٹ اپ قدر! یہاں سے جاؤ۔'' وہ آنکھوں میں غضب کی سرخیاں لیے مٹھیاں بھینچے جیسے خود پر جبر کر رہا تھا۔ ضبط کر رہا تھا۔

''کیوں چلا جاؤں میں یہاں سے......؟ تا کہ تم اس کے ساتھ گلچھرے اڑا سکو......؟''

وہ پھر بنا سوچے سمجھے روتے ہوئے چیخی۔ عبدالعلی کا ضبط جواب دیتا محسوس ہوا۔ کچھ کہے بنا اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے دروازے کی جانب دھکا دیا تھا۔ امن منہ پر ہاتھ رکھے روتی ہوئی کچن سے بھاگی تھی۔ قدر نے نفرت چھلکاتی نظروں سے باہر جاتی امن پھر عبدالعلی کو دیکھا تھا۔ جو خود بھی پلٹ کر باہر جا رہا تھا کہ اس نے طیش میں بپھرتے آگے بڑھ کر اس کا بازو دونوں ہاتھوں میں دبوچا اور مجنونانہ کیفیت میں واپس کھینچتے ہوئے چیخی۔

''تم اس طرح نہیں جا سکتے ہو عبدالعلی! اس سلسلے کو ختم کرو۔ ورنہ اس سے شادی کر لو۔ کم از کم گناہ سے ہی بچ جاؤ گے۔ شادی تو تم نے ویسے بھی دوسری کرنی ہی تھی۔ آف کورس تمہارے باپ کی روایت جو ٹھہری کہ یہ......'' وہ ایک دم نہ صرف چپ ہوئی بلکہ بری طرح لڑکھڑا کر پوری قوت سے دیوار سے جا کر اس کا سر لگا تھا۔ اس کی

وجہ عبدالعلی کا اس پر اٹھا ہوا ہاتھ تھا۔ جو بھرپور طمانچے کی صورت اس کے چہرے پر نشان ثبت کر چکا تھا۔

''اُف ...... اگر مزید ایک لفظ بھی بابا جان کی شان میں گستاخی کا بولا تو بغیر لحاظ کے زبان کھینچ لوں گا تمہاری۔ تم اس حد تک بے لحاظ ہو گی مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا۔ عورت پر ہاتھ اٹھانا میرے خاندان کے مردوں کے نزدیک بزدلی کی انتہا ہے۔ میں اس وجہ سے تمہاری ہر بیہودگی برداشت کرتا رہا۔ مگر آج انتہا ہوئی ہے۔ چلی جاؤ یہاں سے اس سے پہلے کہ میں جان لے لوں تمہاری۔''

اتنا طیش ...... اس قدر غیض و غضب اور اشتعال۔ قدر کو جیسے سب بھول گیا۔ یہاں تک کہ تھپڑ بھی۔ وہ گنگ بلکہ شاکڈ کھڑی عبدالعلی کے قہر بھرے روپ کو ساکن نظروں سے دیکھتی رہی۔ جو پلٹ کر اسی قہرساماں انداز میں وہاں سے جا چکا تھا۔ وہ پوری طرح سنبھلی تھی۔ نہ حواسوں میں آ سکی تھی کہ اتباع متوحش سی بھاگتی وہاں آئی تھی اور سراسیمہ سی اُسے تکنے لگی۔ خاص کر اس کے داہنے گال پر اس کی نظریں ساکن ہو گئی تھیں۔ جہاں عبدالعلی کی انگلیاں نشان کی صورت دہک رہی تھیں۔

''قدر ......'' وہ بولی تو اس کی آواز میں ہراسگی کا غلبہ تھا۔ خدشات کی یلغار تھی۔ قدر نے لمحہ بھر کو آنسوؤں سے چھلکتی نظریں اٹھائی تھیں۔ جنہیں دوبارہ جھکاتے اس نے ہونٹ بے دردی سے کاٹے۔ وہ اس پل خود کو زمین میں گھڑتا۔ ریزہ ریزہ ہو کر فضاؤں میں بکھرتا محسوس کر رہی تھی۔ ذلت کیا ہوسکتی ہے۔ توہین ہتک کا احساس کیسے سلگتے جسم و جاں کو بھنبھوڑتے رگیدتے ہوئے ہیں یہ اس نے صحیح معنوں میں اب جانا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کوئی اسے کانٹوں بھری جھاڑی پر بے دردی سے گھسیٹے جا رہا ہو۔ روح شدید تپش کے حصار میں ہے اور ہر لمحہ جھلس رہی ہے۔

''اندر چلو قدر ......!'' اتباع نے خود کو سنبھالا تھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ قدر نے مزاحمت نہیں کی، البتہ تب سے آنکھوں کی سطح پر پھیلی نمی ضرور پلکوں کی دہلیز پھلانگتی گالوں سے ہوتی بے قدری کا احساس لیے اس کے پیروں میں رلتی رہی۔

''اماں سمیت سب اندر کمرے میں نماز پڑھ رہی ہیں بوجان بھی، میں باہر برآمدے میں تھی۔ میں نے تمہاری اور بھائی جان کی آواز سنی تھی۔ بہت غصے میں تھے بھائی جان! پھر امن بھی یہاں سے روتے ہوئے گئی تھی۔ قدر مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔'' کمرے میں لا کر اسے صوفے پر بٹھانے کے بعد اتباع نے پہلے پانی کا گلاس بھر کے اس کے منہ سے لگانا چاہا۔ جسے قدر نے بے حد خفگی بھرے انداز میں دور ہٹا دیا تھا۔ اتباع کے اندر جھینپ کی بے بسی انتہا درجے کا دکھ اترنے لگا۔ اس کے آنسو پونچھتے وہ کتنی دلگیری سے کہہ رہی تھی۔

''میں نے جو کچھ کہا ...... اس پر مجھے ہرگز شرمندگی نہیں ہے۔ بی کوز سچ پر کیسی شرمندگی۔ بس اتنا جان لو کہ ...... تمہارے بھائی جان نے مارا ہے مجھے، وہ بھی اس امن کی خاطر ...... میں دوبارہ انہیں کبھی اپنی صورت نہیں دکھاؤں گی۔ اچھا ہوا یہ سب کچھ شادی سے پہلے ہو گیا۔''

ہچکیوں، سسکیوں کے درمیان اتنی سی بات وہ بامشکل مکمل کر پائی تھی۔ اتباع سناٹے میں گھر گئی کچھ کہنا چاہا پھر قدر کی ذہنی حالت کے پیش نظر ارادہ بدل دیا تھا۔ عجیب سا دکھ اس کے اندر اترنے لگا تھا۔

”ایسا مت کہو قدر! پلیز ریلیکس‘ اللہ بہتر کرے گا۔ تم بھائی جان اور امن کے متعلق غلط فہمی......“

”مجھے جھوٹی تسلیاں اور غلط وضاحتیں نہ دو۔“ وہ حلق کے بل چیخی۔ اتباع خائف ہونے لگی۔

”او کے......تم آرام کرو، ریلیکس......“ اس نے قدر کا گال تھپکا اور خود پلٹ کر باہر نکل گئی۔ ابھی اس کی نماز پوری نہیں ہوئی تھی۔

اتباع کی ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بات دب گئی تھی۔ بڑوں تک نہیں پہنچی۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ یہ محض قدر کی جلد بازی اور جذباتیت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ امن اسی رات اپنی فیملی کے ساتھ واپس چلی گئی تھی۔ جبکہ اگلے دن علیزے اور عبدالہادی کی بھی واپسی تھی۔ لاریب اصرار کر رہی تھیں۔ کم از کم قدر اور علیزے رک جائیں اکٹھے شادی کی تیاریاں اور شاپنگ کر لیں گے۔

”قدر آپ بولو نا بیٹے!“ انہوں نے پیار سے اس کا گال سہلایا۔ جس کا چہرہ ہنوز ستا ہوا تھا۔ آنکھوں میں سرخی تھی۔ جس کا بہانہ وہ پہلے ہی یہ بنا چکی تھی کہ رات نیند نہیں آئی۔ طبیعت ٹھیک نہیں۔

”نہیں ممانی جان! میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ اتباع کی نظروں کی التجا کو رد نہ کرتے ہوئے اس نے کوئی سخت اور بے تکی بات نہیں کی تھی۔ اتباع کی سانس بحال ہوئی اور نظروں سے ممنونیت و تشکر چھلکنے لگا۔

”مگر بیٹے! میں چاہتی تھی بری کی خریداری آپ کی پسند کے مطابق ہو۔“ لاریب کے کہنے پر اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی اتباع بول پڑی تھی۔

”آنٹس او کے اماں! میں چلی جایا کروں گی آپ کے ساتھ...... بھائی جان بھی ہوں گے۔“

اس نے نرمی سے ٹوکا تھا۔ قدر نے خفا نظروں سے اتباع کو دیکھا تھا اور اُٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ اتباع پیچھے بھاگی آئی تھی۔

”پلیز تم کچھ نہیں کہو گی، ہرگز معاملہ نہیں بگاڑو گی۔“ وہ جیسے منت کر رہی تھی۔ بیچ راستے میں اُسے روک کر قدر نے انتہائی تلخی بھرے انداز میں اسے پیچھے کی جانب دھکا دیا۔

”تم مجھے فورس مت کرو۔ تمہارا بھائی اس قابل نہیں کہ میں اب شادی کروں اس سے۔ سمجھیں۔“ آنکھیں نکال کر غرانے کے انداز میں کہتی وہ یہ نہیں دیکھ سکی کہ عبدالعلی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آتا اس کی یہ بات پوری جزئیات سے سن چکا ہے۔

”تمہیں کس نے یہ خوش فہمی دی ہے کہ میں بھی اس امر کے لیے مجبور ہوں۔“ چند قدم بڑھا کر اس کے سامنے آتا وہ اس سے بڑھ کر سرد مہری تلخی اور نخوت سے جتلا رہا تھا۔ اتباع کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

”پلیز بھائی جان! کم از کم آپ تو ایسا رویہ نہ رکھیں۔“ اتباع رونے کو تیار تھی۔ عبدالعلی نے سرخ نظروں سے قدر کو گھورنا موقوف کیا اور پلٹ کر ایک جھٹکے سے وہاں سے چلا گیا۔

”میں چلی جاؤں گی اپنے بھائی سے کہنا امن سے شادی کر کے اپنے دل کی حسرتیں پوری کر لیں باتیں کرنے کی۔“ وہ جواب تک سکتہ زدہ سی کھڑی تھی۔ روتی ہوئی کہہ کر کمرے میں بھاگ گئی۔ اتباع سر تھام کر سرد آہ بھر کر گئی۔

☆......☆......☆

اسے یہاں آئے بھی بہت دن ہو گئے تھے۔ یہ فیصلے جو وہ کر آئی تھی۔ کرنے جتنے آسان تھے۔ نبھانے اسی قدر مشکل اس کا ہر لمحہ کانٹوں پر بسر

ہوتا تھا۔ زوح آبلوں سے بھرتی جا رہی تھی۔ گھر میں شادی کی تیاریاں تھیں اور وہ ہر لمحہ خود سے بچھڑتی جا رہی تھی۔ کیسا احساس تھا زیاں کا جو جاں بلب کرتا تھا۔ کیسا جاں گسل خیال تھا۔ اس قیمتی شخص کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے کا۔ وہ جسے دعاؤں سے منتوں سے مانگا تھا۔ اک طرف انا تھی ایک طرف دل...... وہ درمیان میں لمحہ لمحہ خود کو کھو رہی تھی۔ تکلیف کا احساس تھا بے کراں۔

اس پر ستم زدگی کی انتہا کہ اسے تھپڑ دے مارے۔ اس لڑکی کے سامنے اسے ذلیل کیا۔ جس سے قدر کو نفرت ہو چکی تھی۔ جس نے اس کا سب سے بڑا نقصان کیا تھا۔ کیا وہ پھر بھی نفرت نہ کرتی اس سے...... '' وہ پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔

'' میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی امن! تم نے ہمیشہ کے لیے مجھے برباد کر دیا ہے۔'' امن کی کال ڈسکنکٹ کرتے ہوئے اس نے تنفر سے سوچا تھا۔ جب سے وہ آئی تھی یہ امن کی دوسری کال تھی۔ جو اس نے سنے بغیر کاٹ دی تھی۔ اور خود اُٹھ کر باہر نکل آئی۔ سفید کہرے میں چھپے راستوں پر قدم رکھتی وہ کسی بھاری اونی لباس سے بے نیاز تھی۔ اس کا دوپٹہ ہمیشہ کی طرح اس کے قدموں کو چھو رہا تھا۔ اندر کا اضطراب اسے کہیں ٹکنے نہیں دیتا تھا۔

ہوا بہت سرد تھی اور جب بلند قامت درختوں کو چھیڑ کر گزرتی تو کئی قسم کی آوازیں پیدا کرتی تھی۔ صبح اس کی آنکھ قدرے تاخیر سے کھلی تھی۔ سورج بہرحال ابھی بھی نہیں نکلا تھا۔ گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد وہ بھی علیزے کے اصرار پر کرنے کے بعد وہ کافی کا مگ لیے ٹیرس پر آ گئی تھی۔ دور قریب کا ہر منظر دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ درخت ساکت وسامت تھے۔

اور دبیز دھند کے باعث ان کی پوری قامت بھی واضح نہیں ہو رہی تھی۔ چوکیدار گیٹ کے پار کھڑا تھا اور اپنے منہ سے بھاپ نکال کر فون پر کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

نیم تاریک کمرے کے پردے گرائے ہاتھ میں کافی کا مگ پکڑے اس کی آنکھوں کی نمی ہر لمحہ گہری ہوئی جا رہی تھی۔ نارسائی کا زہریلا احساس اس کی رگ رگ کو رگید رہا تھا۔

محبت جب کینسر بن کر اس کے وجود میں دوڑنے لگی تھی تب اسے جدائی کے موڑ پر لا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ کتنا بے حس تھا وہ شخص...... کوئی فرق ہی نہ تھا جسے۔ اس کا دل کٹ کٹ کر پورے وجود میں بکھرنے لگا۔ سیل فون کی گنگناہٹ پر اس نے چونک کے گردن موڑی تھی۔ کوئی آس تھی نہ امید...... مگر دل پھر بھی خوش فہمی پالتا تھا۔ اب بھی اسکرین پر اتباع کا نمبر دیکھ کر اسے عجیب سی یاسیت نے آن لیا۔ متاسفانہ سانس بھرتے اس نے بالآخر کال ریسیو کر لی تھی۔

'' السلام علیکم! کیسی ہو قدر......!'' اتباع کے انداز میں فکرمندی بھی تھی۔ گریز بھی اپنائیت بھی تھی، حساس مندی بھی، وہ ہونٹ کاٹتی رہی۔

'' بات نہیں کرو گی مجھ سے......؟'' اسے لگا اتباع روہانسی ہو رہی ہے۔ جبھی سرد آہ بھری۔

'' کیا بات کروں......؟ کہنے کو باقی رہ ہی کیا گیا ہے؟'' اس کے دل سے ہوک اٹھی تھی۔ اتباع نے بے اختیار ٹوکا۔

'' مایوسی کی باتیں مت کرو قدر!''

'' تمہارا بھائی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ اسے میری ضرورت بھی نہیں۔ یہ بات تو طے ہو گئی ہے۔'' وہ پھر رونے لگی۔ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر، دوسری جانب اتباع جتنی بھی بے قرار

ہوئی مگر بہر حال اسے چپ کرانے سے قاصر تھی۔
''طے ہوا سارا نقصان میرا ہوا ہے اتباع! کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں مرجاؤں گی اس طرح گھٹ گھٹ کے اس کے رونے میں شدت آئی تھی۔
''تم بہت زیادہ بدگمان ہو قدر! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ عاجز ہوئی قدر کا شکوہ بڑھا۔
''کیسے یقین کروں؟ انہیں پرواہ تک نہیں۔ کوئی ایک وضاحت بھی نہیں۔''
''بھائی جان کو بہت غصہ ہے تم پر قدر!'' اتباع دھیمی ہوئی بے بسی سے کہہ گئی۔ قدر سناٹے میں گھر گئی۔ کچھ کہے بغیر فون بند کیا بلکہ سوئچ آف کر دیا۔ اس کے اندر سناٹے اتر رہے تھے۔
وہ کمرے سے کیا گھر سے بھی نکل آئی۔ اندر وحشت سرسراتی تھی۔ اور آنکھوں میں نمی کا احساس مناظر کو دھندلا رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اونچے نیچے راستوں پر بھاگنے لگی۔ آسمان گہرے بادلوں سے ڈھکا تھا اور وادی پر جھکا آ رہا تھا۔ اس کا جنون بڑھنے لگا۔ آسمان برسا ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی...... لمحوں میں ہر شے جل تھل ہوگئی تھی۔ وہ یونہی دیوانہ وار بھاگی جس سے ٹکرائی وہ عبدالہادی تھے۔ جو اسے گھر سے باہر اس حالت میں پا کر حیران پریشان نظر آ رہے تھے۔
''قدر...... بیٹے کیا ہوا......؟'' انہوں نے سرخ بجری کی روش پر جمع ہوئے بارش کے پانی میں چھپاک چھپاک بھاگی قدر کو شانوں سے تھام کر کتنی حیرانی سے استفسار کیا تھا۔ اس کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ کچھ کہنے کے بجائے وہ اس کے کشادہ سینے میں منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔ بانہوں میں بکھرنے لگی۔ اس کے اک اک انداز سے بے چینی اضطراب اور وحشت ہویدا تھی۔
''عبدالعلی......! پاپا جانی عبدالعلی ایسا کیوں ہے؟ وہ اتنا بے حس اتنا سیلفش کیوں ہے؟'' وہ بری طرح کانپتی سسکتی سوال کر رہی تھی۔ عبدالہادی چکرانے سے لگے۔ کچھ کہے بنا اس کا سر تھپکا، ماتھا چوما اور بازو کے حصار میں لیے گھر کے اندر چلے آئے۔
''قدر کا لباس نکالیں بیٹے چینج کرو۔ مجھے ڈر ہے سردی نہ لگ جائے آپ کو۔'' اس کے کمرے میں لا کر پہلے ملازمہ پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے وہ فکرمندی سے بولے تھے۔ اور خود پلٹ کر باہر چلے گئے۔ دس منٹ بعد خود کوفی بنا کر لائے تھے وہ گیلے کھلے بالوں کے ساتھ سفید سوتی مگر خوبصورت لباس میں شال لپیٹے آتش دان کے قریب بیٹھی گم صم نظر آئی تھی۔ آنکھوں میں ابھی بھی آنسو تھے۔ چہرہ حزن ملال کی تصویر، انہوں نے کرسی کھینچی اور اس کے پاس آ بیٹھے۔ اسے متوجہ کرنے کو ذرا سا کھنکارے اور کوفی کا مگ اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ نظریں چرا گئی تھی۔ کوفی کا مگ سائیڈ پر لے کر رکھ دیا۔
''پی لو بیٹے! سردی کم ہوگی۔'' وہ نرمی سے ٹوک کر بولے تھے۔ قدر نے بے بسی، لاچاری سے سر کو نفی میں جنبش دی۔
''دل نہیں کر رہا۔'' وہ ٹوٹ رہی تھی۔ بکھر رہی تھی۔ خود کو سنبھالنے میں بری طرح ناکام تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں دبائیں۔
''دل کیا کر رہا ہے؟'' انہوں نے شفقت سے مسکرا کر سوال کیا۔ قدر چونک گئی تھی۔ جواب میں آنکھیں پھر لبالب بھر گئیں۔ کچھ کہے بغیر اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''پاپا جانی کو بھی نہیں بتاؤ گی پاپا کی جان......؟'' انہوں نے اس کا گال سہلایا تھا۔ اس کے آنسو گالوں پر اتر آئے۔ ہزار ضبط کے باوجود سسکیاں مچلنے لگیں۔ اس نے سر اٹھا کر وحشت انگیز نظروں سے انہیں دیکھا۔

''عبدالعلی سے کیا شکایت ہے؟ جھگڑا ہوا ہے؟'' ان کے انداز میں کتنی توجہ کتنی نرمی کتنی محبت تھی۔ قدر کا دل چاہا۔ ہر بات بتادے، مگر اس نے زبان نہیں کھولی۔ اس کی آنکھوں میں ریت سی چبھنے لگی۔

''نہیں پاپا! اب کبھی جھگڑا نہیں ہوگا۔'' اس نے غم زدہ آواز میں جواب دیا تھا۔

''گڈ......! یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ کی ماما پریشان ہیں۔ آپ کمرے سے نہیں نکلتیں۔ شادی کی تیاریوں میں دلچسپی نہیں لیتی ہو، وائے بیٹے!'' وہ استفسار بھی بہت نرمی سے رسان سے کر رہے تھے۔

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ ماما نے شکایت کی آپ سے......؟'' عادت کے مطابق وہ فوراً بدگمان ہوئی۔ عبدالہادی رسان سے مسکرا کر سر کو نفی میں جنبش دینے لگے۔

''نہیں بیٹے! شکایت کیوں کریں گی۔ پریشان ہو رہی تھیں۔''

''سوری پاپا جانی!'' وہ سر جھکا کر شرمندہ ہوئی۔ عبدالہادی نے سر تھپکا تھا۔

''اٹس آل رائٹ بیٹے! آپ کوئی ٹیبلیٹ لے لو۔ نہیں تو میں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔ اوکے......؟''

''جی پاپا جانی!'' وہ یونہی جھکے سر سے ہونٹ کچلتی رہی اور عبدالہادی کے اشارے پر کافی کا مگ اٹھا لیا تھا۔

☆......☆......☆

مجھے یہ آرزو بھی نہیں کہ میں اللہ والا بن جاؤں۔ یا بزرگی مل جائے۔ یا مست ہو جاؤں، مجھے مراتب کی طلب نہیں، میری دانست میں عام انسان بذاتِ خود ایک عظیم مرتبہ ہے۔ مجھے صرف ایک آرزو ہے کہ میرا رخ مثبت رہے۔ میرا رخ مثبت رہے۔ انسانوں کی طرف اللہ کی طرف۔

جو تیرے خیال میں گم ہوں تو تمام وسوسے مٹ گئے
نہ جنوں کی جامہ داری رہی نہ جنوں کی داد سری رہی

وہ کتاب میں گم تھا جب دستک دے کر اتباع نے اندر قدم رکھا تھا۔ عبدالعلی نے محض ایک نظر سے اسے نوازا اور پھر سے کتاب پر جما دیں۔

بخیل انسان اپنے مال سے کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ وہ ایسا سورج ہے جس میں روشنی نہیں۔ ایسا دریا ہے جس میں پانی نہیں۔

''بھائی جان!'' اتباع نے ہی اسے پکارا تھا۔ عبدالعلی نے بھنوؤں کو سوالیہ انداز میں جنبش دیتے کتاب بند کر دی تھی۔

''بیٹھو......کھڑی کیوں ہو۔'' اب وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا۔ اتباع گہرا سانس بھرتی کرسی پر ٹک گئی۔

''بھائی وہ......''

''اگر محترمہ کی سفارش لے کر آئی ہو تو بات مت کرنا پلیز!'' عبدالعلی کا انداز ایسا تھا کہ اتباع دکھ بھری نظروں سے کچھ دیر اسے دیکھتی رہ گئی۔

''اس کا مطلب آپ نے ابھی تک معاف نہیں کیا اُسے؟'' اتباع نے ملامت بھرے انداز کو اختیار کیا۔ عبدالعلی نے دانستہ خاموشی اختیار کی تھی۔

''بھائی جان وہ بے وقوف ہے آپ تو اعلیٰ ظرف بھی ہیں سمجھدار بھی، سو پلیز!''

''تم جانتی نہیں ہو اتباع اس نے کیا بکواس کی تھی اس دن۔'' عبدالعلی کتاب کب ریک میں رکھ رہا تھا۔ پلٹ کر کسی قدر برہمی سے بولا تو اتباع نے گہرا متاسفانہ سانس بھرا تھا۔

''میں جانتی ہوں سب...... بھائی جان آپ جانتے ہیں نا کہ معافی کا مطلب اگر سمجھنا چاہیں تو ایک ایسے شخص کو معاف کر کے دیکھیں۔ جس نے آپ کی کردار کشی کی ہو۔ پھر آپ جان جائیں گے معافی کا اتنا زیادہ اجر کیوں ہے؟'' عبدالعلی مصلحتاً خاموش رہا۔ اتباع کچھ دیر اس کے جواب کی منتظر رہی تھی۔ پھر اسی افسردگی اور یاست میں مبتلا ہو کر بولنے لگی۔

''آپ جانتے ہیں وہ یہاں شادی سے انکار کر کے گئی تھی۔ آپ نے بھی یہی بات کہی۔ بھائی جان شادی کی تاریخ طے اور تیاریاں تقریباً مکمل ہیں۔ کیا ہوگا آپ نے سوچا اگر اس نے مزید حماقت کی تو......'' وہ فکر مند تھی۔ مضطرب تھی۔ عبدالعلی نے اب کے قدرے طنزیہ ہنکارا بھرا تھا۔

''اس وقت کے انکار اور شادی کے وقت انکار میں بہت فرق ہے۔ وہ ایسا نہیں کرے گی۔ اتنا تو میں بھی جانتا ہوں۔ سو ریلیکس مائی سس!'' اس کا لہجہ بھی طنزیہ تھا اکتایا ہوا کوفت زدہ بے زار...... اتباع مزید دکھ کا شکار ہوئی۔

''مگر بھائی جان......''

''پلیز اتباع! تم پریشان نہ ہو۔ جاؤ اپنے کمرے میں، مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔'' اب کے وہ بے حد رکھائی سے بولا۔ اس طرح کہ اتباع کے لیے مزید کچھ کہنا ممکن نہ رہا۔ وہ شاکی ہوتی اٹھی تھی۔

''ہمارا فعل ہمارے احساس کی پیروی کرتا ہے میں جانتا ہوں اتباع! لیکن حقیقت یہ ہے کہ فعل اور احساس دونوں ساتھ چلتے ہیں۔ اگر ہم فیل کی اصلاح کرلیں کیونکہ یہ ہمارے قوتِ ارادی کا زیادہ ماتحت ہوتا ہے تو ہم بلواسطہ اپنے احساس کو بدل سکتے ہیں۔ میں بھی ایسا کرنے کی شعوری کوشش کرتا ہوں۔ مگر کبھی سختی کو اس لیے بھی اپنایا جاتا ہے کہ سامنے والے کی اصلاح ضروری ہوا کرتی ہے۔ اس میں صرف ہمارا فائدہ ہی کارفرما نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے حق میں بھی یہ بہتر رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئی ہوگی، سو ریلیکس......!'' وہ نرم نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اتباع نے پلٹ کر اسے نم نظروں سے دیکھا اور محض سر ہلایا تھا۔

''خیال رکھیے گا بھائی جان! کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ کمرے سے نکلنے سے قبل گزارش کر رہی تھی۔ عبدالعلی محض مسکرایا تھا۔ اتباع بھاری دل بھاری قدموں کے ساتھ واپس کمرے میں آئی تو اس کا سیل فون مسلسل نیم اندھیرے میں وائبریٹ کر رہا تھا۔ اس نے بے دھیانی میں آگے بڑھ کر فون اٹھایا تھا۔

یہ نہ پوچھ کہ شکایتیں کتنی ہیں تجھ سے
تو یہ بتا کہ تیرا کوئی اور ستم بھی باقی ہے

رابطہ بحال ہوتے ہی عبداللہ کا احتجاجی شاکی لہجہ سماعتوں میں اتر آیا۔ وہ محض گہرا سانس بھر سکی۔

ہیں دلیلیں تیرے خلاف مگر
سوچتا ہوں تیری حمایت میں

اس کی خاموشی پر وہ پھر خفگی سے جتلا رہا تھا۔ اتباع نے ہونٹ بھینچ لیے

وہ میری دسترس میں ہے لیکن
مسئلہ دسترس کا تھوڑی ہے

پھر آہ بھر کے کہا گیا۔ مقصد جانے کیا تھا۔ البتہ وہ ضرور بے زار ہوئی تھی۔ معاً عبداللہ کو اس کی خاموشی کا احساس ہوا تو یکدم خود بھی چپ کر گیا۔ کچھ دیر کو ان کے درمیان خاموشی بولتی رہی۔ وہ اس کی سانسوں کی آواز سنتا رہا تھا۔ پھر آہستگی سے کھنکھارا۔

''اتباع...... ! خفا ہیں مجھ سے......؟'' اس کا انداز بے حد محتاط تھا۔ کسی حد تک کترایا ہوا بھی۔ شرمندگی کا احساس لیے۔ اتباع کی آنکھوں کی سطح پر نمی پھیلنے لگی۔

''نہیں، کیوں ہوں گی بھلا......؟'' ضبط کے باوجود اس کی آواز بھیگ گئی۔

''اُس دن میں نے مس بی ہیو......''

''اٹس اوکے...... مجھے بھی بہر حال اتنی سختی نہیں برتنی چاہیے تھی۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میری ضد ہی آپ کو شدت پر اکساتی ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ عبداللہ کی خفت کا انت نہیں رہا۔

کرنے گئے تھے ان سے تغافل کا گلہ ہم
ان کی نگاہ سے بس خاک ہو گئے

وہ گھمبیر تر لہجے میں گویا اپنا قصور اپنی غلطی مان رہا تھا۔ اتباع اس مقام پر کیا کہتی۔ بس ہونٹ بھینچے رہی۔

''مجھے اپنی زیادتی کا احساس تھا۔ میں تمہیں منانا چاہتا ہوں اتباع! شرمندہ نہ کرو مزید......''

اتباع زخمی انداز میں مسکرائی۔ خاموشی ایک بار پھر ان کے درمیان آن کے ٹھہر گئی۔ جسے عبداللہ نے توڑا۔

''برائیڈل ڈریس میں تمہارے ساتھ لانا چاہتا تھا۔ یہ میری خواہش تھی اتباع! مگر میں نے تمہاری نیچر کو سمجھتے سمجھوتہ کر لیا۔ تمہاری خاطر میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی تمہیں خوش کرنے کی خاطر......'' وہ واقعی اس کے لیے حساس ہو رہا تھا۔ اسے منانے کے جتن میں مصروف...... اتباع کے ہونٹوں پر بھولی بھٹکی مسکان اتری۔

''اس تعاون کے لیے آپ کا شکریہ۔'' اس کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی جتلاتا ہوا جسے محسوس کرتا عبداللہ گہرا سانس بھر کے کچھ ثانیوں کو خاموش ہوا تھا۔

بے رخی تیری عنایت تیری
زخم دیتی ہے دوا کرتی ہے
تیری آہٹ میری تنہائی کا
راستہ روک لیا کرتی ہے
روشن تیرا حوالہ ٹھہرے
میری ہر سانس دعا کرتی ہے

اس کا لہجہ متبسم تھا۔ اتباع پھر بھی خاموش رہی۔ عبداللہ کچھ دیر اس کے بولنے کا منتظر رہ کر پھر اس سے ہار گیا۔

''ہماری شادی میں کتنے دن رہ گئے ہیں؟'' وہ بظاہر بھلے سنجیدہ تھا۔ مگر سوال معنی خیز تھا۔ جو اتباع کو شپٹا کے رکھ گیا۔

''جی......!''

''یار تب ہی اب تو دیکھ سکتا ہوں تمہیں۔ ظالم سماج نے پابندیاں لگائی ہوئی ہیں۔ بقول شاعر......

بہت دن ہو گئے شاید
تیرا چہرہ نہیں دیکھا
تمہارے بن سبھی منظر
ادھورے ہیں میرے دل کے
میری آنکھوں نے مدت سے

''عبداللہ!'' وہ منمنائی تھی۔ اسے واقعی اس پل عبداللہ سے ٹوٹ کر شرم آنے لگی تھی۔

''جی جان! حکم، ارشاد، نوازش......'' وہ جیسے اس کی کیفیت کو سمجھ کر محظوظ ہوا تھا۔ اس کے لہجے کے اُتار چڑھاؤ ہر کیفیت کو پہچانتا تھا وہ۔

''بولو نہ یار......'' وہ بلا کا مشتاق تھا۔ اتباع کو اور بھی شرم محسوس ہوئی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ جھینپی، عبداللہ ہنسنے لگا۔

''کاش اس وقت سامنے ہوتیں تم میرے۔ کاش میں دیکھ پاتا۔ تم شرماتی کتنی حسین لگ رہی ہو۔'' اس کا گھمبیر لہجہ مزید گھمبیر ہونے لگا۔ اتباع سٹپٹا کر رہ گئی۔

''میں فون بند کر رہی ہوں۔'' وہ گھبرا کر کہہ گئی تھی۔ عبداللہ کا قہقہہ بلند ہوا۔

''ارے نہیں بس اک بات اور پلیز اتباع!'' ہنسی روکتا وہ گڑبڑا سا گیا تھا۔ اتباع کی خاموشی گویا منتظر تھی۔ عبداللہ محسوس کرتا ہوا کھنکارا۔

''تم خفا تو نہیں ہونا مجھ سے اب؟'' دراصل یار اپنی گولڈن نائٹ کو میں لڑائی جھگڑے یا پھر صلح کے وضاحتوں کے فضول پریڈ میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اک اک لمحہ بہت قیمتی اور انمول ہوگا میرے لیے۔'' وضاحت ہوئی تھی۔ اور اتباع کا چہرہ بے تحاشا سرخ پڑ گیا۔ کچھ کہے بغیر اس نے بے اختیار فون بند کیا۔

اس کے چہرے سے جیسے بھاپ نکل رہی تھی۔ حجاب کا دلفریب تاثر اس کے خوش رو چہرے کو مزید حسن بنا تا تھا۔

☆......☆......☆

وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ جب اس نے عبدالاحد کو اندرونی حصے سے نکل کر گیٹ کی جانب جاتے دیکھا۔ کچھ دیر کھڑی رہی پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچتی تیزی سے کمرے سے نکل کر اس کے پیچھے بھاگی آئی تھی۔

''عبدالاحد......! عبدالاحد......!'' اس کی پکاروں پر ہی عبدالاحد نے چونکتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ پورٹیکو میں پہنچ چکا تھا۔ گہرا سانس بھرتا ہاتھ میں موجود شاپر اپنی بائیک کے ہینڈل سے لٹکانے لگا۔

''تم خفا ہو مجھ سے......؟'' بلیک دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے وہ زرد رو لڑکی جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ جیسے گھلتی جا رہی تھی۔ شرمسار خفت زدہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''نہیں......'' جواب مختصر تھا۔ مگر نرمی ورسان کا متقاضی تھا۔ وہ گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

''میں نے اگر انکار کیا تو اس میں کہیں بھی تمہاری رنجشن کا خیال پیش نظر نہیں تھا عبدالاحد! نہ تم میں کوئی خامی یا کمی تھی۔ مگر بات یہ ہے کہ......''

''اٹس او کے امن! مجھے ہرگز بھی آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ میں نے خود کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ مگر جب اماں نے ایسی بات کہی تو میں نے اسے خدا کی مرضی سمجھتے قبول کیا تھا۔ انکار ہونے پر بھی اللہ کی رضا سمجھتے ہوئے اس بات کو قبول کیا۔ آپ کیوں ٹینشن لیتی ہیں امن! ورنہ میں سمجھتا ہوں...... جن پیمانوں پر ہمارے والدین نے ہماری پرورش اور تربیت کی ہے۔ اللہ نے جتنی ہدایت سے ہمیں نوازا ہے۔ اس کے بعد گنجائش نہیں نکلتی کہ ہم شاکی ہوں۔ یا دل برداشتہ......'' وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بہت کھلی کھلی اور شفاف تھی۔ امن اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر بھاری دل سے مسکرائی تھی خود بھی۔

"تم بہت اچھے ہو عبدالاحد! اللہ پاک تمہارا نصیب روشن کرے۔" اس کی آواز بوجھل تھی۔

"آمین، آپ بھی وہ پائیں جو آپ چاہتی ہیں۔" اس کی مسکراہٹ ہنوز نرم تھی۔ امن کی آنکھوں میں نمی گھلنے لگی۔ عبدالاحد کے جانے کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی واپس اندر آ گئی۔ بریرہ بری کے جوڑوں کو تہہ کر کے سوٹ کیس میں بند کر رہی تھیں۔ وہ ان کی مدد کراتی رہی۔ اس کے بعد سب کے سامنے کھانا کھایا تھا۔ عبداللہ حسب معمول خوب چہک رہا تھا۔ جبکہ وہ گم صم تھی۔ چونکہ اس وقت جب عبداللہ نے اس کے سر پر چپت لگائی تھی۔

"کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں؟ کوئی پرابلم ہے تو کہو...... پریشان لگتی ہو۔" بریرہ اور ہارون بھی متوجہ تھے۔ امن گڑبڑا سی گئی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے بھائی! فائنل ایگزیم ہیں تو بس یہی ٹینشن ہے۔"

"تو نہ لو ٹینشن...... اچھی خاصی لائق فائق نہیں ہو۔" وہ مسکرایا۔ امن کو جبراً سہی اس کا ساتھ دینا پڑا تھا۔

"نماز کے بعد چائے بنا کر میرے کمرے میں لے آنا۔ باتیں کریں گے۔" عبداللہ کرسی دھکیل کر اٹھتا ہوا بولا تھا۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

"بات سنو بیٹے!" وہ ملازمہ کے ہمراہ ٹیبل سے برتن اٹھا رہی تھی جب بریرہ نے اسے پکارا۔ وہ چونک کر بلکہ خائف ہو کر انہیں تکنے لگی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اور اپنے ہمراہ ٹی وی لاؤنج میں آ گئیں۔

"بیٹھ جاؤ۔" خود نشست سنبھالتے ہوئے انہوں نے اس کی جانب دیکھا۔ امن متحیر سی ان کے ساتھ ٹک گئی۔

"تمہارے انکار کی وجہ نہیں پوچھی میں نے بیٹے! جانتی تھی اس کا سبب، تمہیں سنبھلنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھو انتظار وہاں ہونا چاہیے۔ جہاں امید کی شمع روشن ہو۔ اندھیرے راستوں پر آنکھیں بند کیے انجام کی پروا کیے بغیر اندھا دھند بھاگے جانا سوائے حماقت کے کچھ نہیں۔"

ان کا انداز ناصحانہ تھا۔ دکھ کی آمیزش لیے ہوئے...... امن نے تڑپ کر آنسو بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔ انداز میں اتنا دکھ تھا کہ خود بریرہ کا دل کٹنے لگا۔

"میں یہ نہیں کہتی کہ محبت کر کے تم نے غلط کیا۔ ہاں یہ غلطی ضرور کی کہ جو بھی بات کی خود کی۔ بیٹے اللہ پر بھروسا کیا ہوتا معاملہ شاید اتنا نہ بگڑتا۔" امن کے پاس جیسے الفاظ ختم ہو گئے۔ ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپے وہ رونے لگی تھی۔

"اس کا ایک ہی حل ہے...... میں جا کے ارسل سے گزارش کروں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ مجھے......"

"ماما پلیز! فار گاڈ سیک! آپ ایسا کبھی نہیں کریں گی۔ میں مر جاؤں گی مگر یہ ذلت نہیں سہہ سکتی۔" وہ جیسے پھپھک کر بولی تھی۔ بریرہ نے اسے تھام کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ اور پیار سے تھپکا۔

"پھر خود کو سنبھال لو بیٹے! حالات سے سمجھوتے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمہارا دکھ میرا دل دکھا رہا ہے۔ اسے دلوں کا روگ بننے سے روک لو۔ دیکھو آج عبداللہ کو شک ہوا ہے۔ کل تمہارے بابا جان بھی سوال کریں گے۔ ایسے معاملات گھر کے مردوں کی غیرت کے معاملے ہوا کرتے ہیں۔"

"میں سمجھتی ہوں ماما! میں خود کو سنبھال لوں

گی۔ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔ اگر وہ میرے نصیب میں ہوتے تو یہ سب نہیں ہوتا۔'' اس کا انداز شاکی تھا۔ جسے بریرہ نے محسوس کیا تھا اور محبت سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

''ایسا نہیں کہتے ہیں بیٹے! یہ تو گھما پھرا کے اللہ سے شکوہ ہو گیا۔ اور یاد رکھو اللہ کی آزمائش بھی انعام ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ وہ نیکیاں دیکھ کر نہیں دیتا۔ محبت اور نعمتیں تو وہ ان کو بھی دیتا ہے۔ جو اُس کا نام تک نہیں لیتے۔ اور ایسوں کو بھی دیتا ہے جو ساری عمر کسی کا بھلا نہیں سوچتے۔ وہ اگر نیکیوں کے حساب سے تول کر دینے لگ پڑتا تو کسی کو بھی کچھ نہ ملتا۔ مخلوق بھلا خالق کو کیسے کچھ لوٹا سکتی ہے۔ اُس نے ہاتھ پاؤں جسم کے سارے عضو دیے ہیں۔ یہ کوئی ہماری نیکیوں کا اجر نہیں ہے۔ دن میں کتنی بار سانسیں لیتے ہیں ہم۔ اگر ایک نیکی کے بدلے ایک سانس ہو تو بتاؤ کیسے پورے اتریں ہم......'' امن نے محبت سے عقیدت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ آنسو بھری نظروں سے کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی۔ پھر ان کے ہاتھوں پر جھک کر عقیدت بھرا بوسہ ثبت کیا تھا۔

''آپ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں ماما! میرا بے قرار دل سنبھلنے لگا ہے۔''

الحمد اللہ! اللہ کی عطا ہے۔ اللہ کے لیے ہی ہیں ساری تعریفیں۔'' انہوں نے عاجزی و انکساری سے جواب دیا تھا۔ کچھ توقف کیا پھر مزید گویا ہوئی تھیں۔

''ہمیشہ یاد رکھو بیٹے! اللہ ہر طرح سے اپنوں کو آزماتا ہے۔ کبھی دے کر...... کبھی نہ دے کر کامیاب وہی ہیں۔ جو ہر حال میں اللہ کی رضا کو مقدم رکھتے ہیں۔ یہ زندگی بس ایک امتحان ہے ایک اور بڑے پیش آنے والے امتحان کی پیشگی ٹیسٹ...... جب معاملہ اس طرح کا ہو تو پھر ہر دلچسپی کو چھوڑ کر امتحان میں کامیابی کی کوشش میں ہی لگ جاتا ہے۔ آپ سمجھ رہی ہو میں کیا کہہ رہی ہوں بیٹے!'' انہوں نے تھم کر اسے دیکھا۔ امن آہستگی سے مسکرا دی اور سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ انہوں نے اس کی مسکراہٹ سے دل میں اترتی ٹھنڈک کو محسوس کیا تھا۔

''جی ماما! میں جانتی ہوں...... کہ اگر چیزیں ہماری مرضی کے مطابق ہو رہی ہیں تو ہم اچھی قسمت والے ہیں۔ لیکن اگر نہیں ہو رہی ہیں تو تب بہت خوش قسمت ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہو رہی ہیں۔'' وہ مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ بہت تدبر آمیز تھی۔ بریرہ نے بڑے والہانہ انداز میں اسے پیار کیا تھا۔ نثار ہوتی نظروں سے اس کی تاکید کی تھی۔

''تو بس بیٹے! یقین رکھو، خوش رہو کہ تم اللہ کی نظروں میں ہو۔ اور اللہ تو وہ ہے جو بدصورتوں کے عاشق اور خوبصورتی کے دشمن پیدا کر سکتا ہے۔'' اتباع وہاں سے اٹھی تو بہت ہلکی پھلکی ہو رہی تھی۔ کمرے میں آنے کے بعد اس نے وضو کیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر ایک بار پھر نماز پڑھنے سے قبل قدر کا نمبر ٹرائی کیا۔ بیل جا رہی تھی۔ کال ریسو نہیں ہوئی۔ اس نے عاجز ہو کر ایک میسج ٹائپ کیا تھا۔

''تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں قدر! تم نے ہمیشہ مجھے غلط سمجھا۔ اس کے باوجود میں نے کبھی تمہارا برا نہیں چاہا۔ عبدالعلی اور اتباع سے بندھنے والا میرا تعلق اتنا گہرا تھا کہ مجھے کبھی احساس ہی نہ ہو سکا تم میری اس سے انڈر اسٹینڈنگ کو غلط رخ پر بھی سوچ سکتی ہو۔ غلطی میری ہی تھی۔ ورنہ عبدالعلی تو میرے لیے ہمیشہ

بڑے بھائی کی طرح عزیز رہے ہیں۔ اللہ گواہ ہے عبدالعلی کے دل میں بھی ایسی کوئی بات نہیں کہ تم بدگمان ہوسکو۔ تم نئی زندگی کا آغاز کرنے چلی ہو تو میں نہیں چاہتی تمہارے دل پر کوئی بوجھ رہے۔ تم سمجھتی تھیں میں انوالو ہوں کسی میں...... ہاں ہوں۔ مگر وہ عبدالعلی نہیں۔ ارسل احمد ہیں۔ وہ مجھے ریجیکٹ کرچکے تھے تو میں کسی طور نہیں سنبھال پارہی تھی خودکو...... عبدالعلی تو بس مجھے سمجھا رہے تھے۔ پیاری لڑکی اللہ کے واسطے بھروسہ کرو مجھ پر۔ پھر بھی یقین نہ آئے تو تم ماما سے پوچھ لو۔ عبدالعلی سے تصدیق چاہ لو۔ یا پھر ارسل احمد سے پوچھ لو۔ یہ ایسا سچ تھا۔ جو دل کا روگ روح کی شرمندگی بنا ہوا ہے۔ جس کا اعتراف کانٹوں پر برہنہ پا چلنا ہے۔ مگر میں دل توڑنے کے جرم سے ڈرتی ہوں۔ خدارا یقین کرلو۔'' اس نے ٹیکسٹ سینڈ کیا تھا اور جائے نماز بچھا کر نیت باندھ لی تھی۔ اس نے باقی معاملات کی طرح اس معاملے کو بھی اللہ کے سپرد کردیا تھا۔

☆......☆......☆

سورج ابھی پوری طرح نہیں نکلا تھا۔ کہر وادی سے ذرا اوپر سر اٹھائے ٹھہر گئی تھی۔ چڑیوں کے غول کے غول درختوں سے اڑتے اور ان کی چہکاریں فضا میں شور پیدا کرجاتیں۔ روئی کے گالوں سی نرم پھوار کی صورت برف باری کل رات ہوتی رہی تھی۔ سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر اس کا برا حال ہوگیا تھا مگر نہ اندر گئی نہ کوئی گرم کپڑا اوڑھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے۔ امن کا میسج پڑھ کے اس کی بدگمانی ڈھلی تھی۔ گویا آنکھوں کے آگے چھایا اندھیرا اچھٹ گیا۔ دل جو پہلے ہی درد کے سمندر کی طغیانی میں دلاسے کا کوئی تنکہ جیسا سہارا ڈھونڈتا تھا اس پیدار کے آسرے کنارے آن لگا۔ مردہ دل لمحوں میں زندہ ہوا تھا۔ یہ احساس ہی کم خوشگواریت لیے نہیں تھا کہ وہ اس بے حد انمول خاص اور قیمتی شخص کو کھونے سے بچ گئی ہے۔ وہ اس کا تھا۔ پورے کا پورا، بلا شرکت غیرے، یہ احساس ہی بہت دلربا تھا۔ بدگمانی دور ہوئی تو اسے عبدالعلی کا اس وقت کا غصہ ہرگز برا نہیں لگا۔ وہ اسے حق بجانب لگا تھا بلکہ اس کی ناراضگی پر بھی پیار آنے لگا۔ جبھی تو اس کی جانب پیش رفت میں دیر نہیں کی تھی۔ لیکن آگے سے عبدالعلی نے رسپانس نہ دے کر پھر سے اسے درد کے اس لامتناہی دریا کے بیچ پھینک دیا تھا۔ اس کے مسلسل لڑائی کرنے پر عبدالعلی نے نمبر ہی بند کردیا تھا۔ وہ اس کی ناراضگی کے احساس اور کسی بھی انتہائی فیصلے کے خدشات کے زیر اثر خائف ہونے لگی تھی۔

محبت میں کتنے وسوسے سمیٹ لایا کرتا ہے۔ بس یہی صورت حال تھی اس جانب بھی۔ علیزے ڈھیروں ملازماؤں کے ہمراہ تیاریوں میں محو تھیں۔ عبدالہادی کو بھی شاپنگ کے لیے ساتھ گھسیٹے پھرتیں۔ اسے اپنے غموں اور تفکرات سے فرصت نہیں تھی۔

اس وقت بھی وہ لان میں جھولے پر بیٹھی زرد نارنجی اور سرخ پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو اپنی لمبی ٹہنیوں کے ساتھ جھومتے فضا میں رنگ بکھیر رہے تھے۔ اس نے نم آلود گھاس پر پیر رکھے تو کھلی چپلوں کے باعث اس کے پاؤں ٹھنڈک آلود نمی سے بھیگنے لگے......

''قدر......!!'' علیزے اسے آوازیں دے رہی تھیں۔ اس نے گردن موڑی۔ وہ اسے سفید سنگ مرمر کے برآمدے میں کھڑی اپنی جانب خفگی سے دیکھتی نظر آئی۔

''اندر آؤ۔ باہر بہت سردی ہے۔'' انہوں نے شال اوڑھ رکھی تھی۔ پھر بھی ہاتھوں کو آپس میں رگڑ رہی تھیں۔ قدر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر آگئی۔

''چند دن ہیں شادی میں...... اور آپ نے اپنا خیال تو کیا رکھنا ہے الٹا ایسے کام کر رہی ہو کہ بیمار پڑ جاؤ۔'' اس کے ہمراہ چلتیں کچھ اور خفا نظر آنے لگیں۔ وہ چپ چاپ آکر آتش دان کے قریب بیٹھ گئی۔ آتش دان میں آگ تڑاتڑ جل رہی تھی۔ علیزے نے خشک میوہ جات کی پلیٹ بھر کے اس کے سامنے رکھی۔ ساتھ ہی ملازمہ کا لایا جھاگ سے لبریز بھاپ اڑاتا گرم چائے کا مگ بھی۔ اس نے دونوں چیزیں توجہ سے نواز دیں۔ ورنہ علیزے کی ڈانٹ یقینی تھی۔ چائے کا سپ لے کر اس نے گلاس وال کے پار دیکھا۔ جسے وادی کی سرد بوجھل نم آلود ہوائیں ہر لمحہ مزید دھندلا کر رہی تھیں۔ پہاڑوں کے اس پار سے آنے والے بادل صنوبر اور چیڑ کے درختوں کو پیچھے چھوڑتے گھروں کی بالکونی میں گھومتے اور کھڑکیوں سے بند کمرے کے اندر جھانکتے تھے۔ اس وقت بھی جب یہ سرد ہوائیں اس کے گالوں کو کچھ اور گلابی بنا رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں پھر نمی گہری ہونے لگی۔

''عبدالعلی سے پھر کوئی اختلاف ہو گیا ہے تمہارا......؟'' علیزے جو بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ استفسار کیا تو قدر اپنی جگہ پر ہل کر رہ گئی تھی۔ خائف مضطرب گریزاں بے چین، کتنے تاثر ایک ساتھ اس کے چہرے پر اترے تھے۔

''یقیناً پھر دوپٹہ نہ لینے پر ڈانٹا ہوگا۔'' اس کا نظریں چرانا خاموش رہنا گویا بذاتِ خود ایک اعتراف جرم تھا۔ جبھی وہ نتیجہ اخذ کر کے گویا ہوئی

تھیں۔ قدر نے تصدیق نہیں کی نہ تردید۔

''اب تمہاری شادی ہو رہی ہے قدر! میری بات بہتر ہے کہ اچھی طرح سے ذہن نشین کر لو۔ عورت وہ ہوتی ہے جسے دیکھ کر ماں، بہن، بیٹی جیسے پر تقدس احساسات خود بخود جنم لیتے ہیں۔ جن کی طرف اٹھنے والی نگاہوں میں عزت و احترام ہوتا ہے۔ جن کی حیا شفق سورج کی کرنوں میں چمکتی ہے۔ جن کی معصومیت پھولوں میں نظر آتی ہے۔ جنہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ وہ عورت ہے۔ اس کی عزت کی جائے۔ عبدالعلی کا مزاج بہت اچھا ہے۔ بیٹے اس کی خواہشات ناجائز نہیں ہیں۔ بہتر ہوگا تم خود کو اس کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ میں چاہتی ہوں بیٹے کہ تم عقل استعمال کرو۔ ورنہ پھر وقت خود سمجھا دیا کرتا ہے۔ مگر وقت کے سمجھانے کا طریقہ سخت کربناک ہوتا ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ وقت کی سمجھائی بات حتمی ہوتی ہے اور ساری زندگی کے لیے سمجھ آجاتی ہے۔ عبدالعلی ہرگز کھلے ذہن کا مالک نہیں ہے۔ روایات، اصول سے بڑھ کر مذہب کو اہمیت دینے والا، بڑا پیارا بچہ...... کوئی کام وقت سے پہلے نہیں کرتا۔ تمہیں جو بھی اس سے شکایتیں ہیں۔ وہ ان کو دور کرے گا۔ میری بیٹی کا نصیب مجھے اللہ پر پورا بھروسہ ہے، بہت روشن بہت تابناک ہوگا۔ انشاء اللہ، اس کا ایک ثبوت عبدالعلی کا ہمسفر کے طور پر تمہارے لیے منتخب ہونا ہے۔'' وہ مسکرا رہی تھیں۔ قدر نے سر اثبات میں ہلا کر ان کا مسکراہٹ میں ساتھ دیا۔

''گڈ گرل! بیٹے ایک بات کبھی نہ بھولنا کہ...... اپنے حال پر افسوس کرنا...... اپنے آپ پر ترس کھانا اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے قابلِ رحم ثابت کرنا اللہ کی ناشکری ہے۔ اللہ کسی انسان پر

اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ بیمار اور لاغر روحیں ہمیشہ گلہ کرتی ہیں اور صحت مند ارواح شکر...... زندگی پر تنقید خالق پر تنقید ہے۔ اور یہ ایمان سے محروم کر دیتی ہے سو اس سے ہمیشہ بچو۔

''آپ فکر نہ کریں ماما! انشاء اللہ! میں وہی کروں گی۔ جو اللہ کو پسند ہے۔ بس آپ میری نیک ہدایت کے لیے دعائیں کرتی رہیے گا۔'' اس نے ان کے گلے میں بازو حمائل کر دیے تھے۔علیزے نے نہال ہوتے اس کی صبیح پیشانی چومی۔

''میری دعائیں ہر لمحہ ہر پل تمہارے ساتھ ہیں میری جان۔'' یہ وہ دن تھا۔ اسے اس نے خوابوں میں خیالوں میں سینکڑوں مرتبہ بہت خوشی سے سوچا تھا۔ محسوس کیا تھا۔ زندگی اس کے خیال میں آج مکمل تھی۔ وہ مکمل تھی۔ حسن مکمل تھا۔ اسے منانے کی فکر چھوڑ کر اس نے بہت دل سے اس دن کا اہتمام کیا تھا۔ پور پور سجائی تھی۔ مہندی کا کوئی فنکشن نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آج ہی تیار ہوئی تھی۔ بارات وادی پہنچی تو موسم بہت دلفریب تھا۔ ہر طرف خوشی تھی۔ البتہ عبدالعلی کے چہرے پر جب بھی اس کی نگاہ گئی وہ اسے ہمیشہ سے زیادہ سنجیدہ نظر آیا تھا۔ دل ڈوبا تھا۔ لرزا تھا۔ خائف بھی ہوا۔ مگر وہ ہر بار خود کو سنبھال لیتی تھی۔ مختلف رسمیں اور پھر جلد رخصتی...... وہ واپس جس وقت گھر پہنچے۔ رات پوری طرح ڈھل رہی تھی۔

''باقی رسمیں کل کرلیں گے۔ اتباع! امن بیٹے! قدر کو کمرے میں چھوڑ کر آؤ۔ طویل سفر سے بہت تھک گئی ہوگی بچی۔'' عبیر کے کہنے پر دونوں مستعدی سے آگے بڑھ آئی تھیں۔

''تم نے مجھے معاف کر دیا......؟'' اسے سہارا دے کر اٹھاتے امن نے سرگوشی کی تھی۔ قدر خفت سے بھرنے لگی۔

''غلط میں تھی، تو معافی مجھے مانگنی چاہیے تھی امن اور......''

''اٹس اوکے...... تمہاری غلط فہمی دور ہوگئی۔ یہی کافی ہے میرے لیے۔'' امن نے اس کا گال سہلایا تھا۔ قدر ممنونیت وتشکر کے ساتھ خفت زدہ اسے تکتی رہ گئی۔

''تمہارے بھائی بہت غصے میں لگ رہے ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے ان سے۔'' اتباع نے اسے بیڈ پر بٹھایا تھا۔ واپس پلٹنے لگی تو قدر نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ اتباع گہرا سانس بھر کے رہ گئی تھی۔ اور بے چارگی سے اسے دیکھا۔

''موڈ تو ان کا واقعی بہت سرد ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کل جب ہم ان سے ملیں گے تو ایسے نہیں ہوں گے وہ۔ تم منالو گی انہیں۔'' اتباع کا آخری فقرہ سراسر شرارت کا مظہر تھا۔ قدر اتنی فکر مند تھی کہ جھینپ بھی نہ سکی۔

''اگر وہ نہ مانے...... پھر مجھے مارا تو......''

''خیر اب ایسا بھی نہیں۔ اتنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر آئی ہو۔ کوئی نہ کوئی جادو چل ہی جائے گا۔'' اتباع نے اس کا دلکش ترین روپ دیکھا۔ جس میں جھلملاہٹیں تھیں۔ وہ واقعی آج حواس چھین لینے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔ قدر بے ساختہ بلش ہوئی تھی۔

''چلی ہوں۔ تب ہی بھائی جان اندر آئیں گے۔ بیسٹ آف لک......'' وہ مسکرا کر اس کا گال تھپتھپاتی اُٹھ کر چلی گئی۔ قدر کو اپنے دل کی دھک دھک بہت آسانی سے سنائی دینے لگی۔ پھر کتنا وقت بیت گیا۔ اسے انتظار کرتے...... وہ آ کر نہیں دیتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے ایسا لگنے لگا وہ

کمرے میں آئے گا ہی نہیں۔ یہ خیال اتنا توہین آمیز اور دکھ دینے والا تھا کہ اس کی آنکھیں بھیگتی چلی گئی تھیں۔ اور جب وہ پوری طرح مایوس ہوئی اسی وقت عبدالعلی نے دروازے سے اندر قدم رکھا تھا۔ شعوری یا لاشعوری نگاہ اس پر اٹھی تھی۔ قدر تو متوجہ ہی تھی۔ نگاہوں کا یہ تصادم اس کے دل پر جو بھی قیامت بپا کر گیا ہو۔ عبدالعلی نے ناگواریت سے لمحے کے ہزارویں حصے نگاہ کا زاویہ بدلا تھا۔ قدر آہستگی سے مسکرائی۔ دل میں اسے روبرو پا کے ہی عجیب سا سکون اتر آیا۔ شیروانی میں اس کا لانبا قد اور غضب کی اسمارٹنس لیے مضبوط کرتی وجود کتنا جچ رہا تھا۔ وہ دھڑکوں کی سرتال میں اسے مگن ہو کر دیکھے گئی۔ اس کی محض ایک نگاہ قدر کے اندر بجھتی امید کے چراغ کی لو پھر سے تیز کر گئی تھی۔ اک نظر عنایت اور سب گلے شکوے رنج مٹی کا ڈھیر...... نظر کا ایسا طلسم جس کے آگے باقی سب کچھ ہیچ ہو جائے۔ وہ آگے بڑھا تھا۔ اور وارڈروب کھول کر اپنے لیے لباس منتخب کرنے لگا۔ قدر تیزی سے اٹھی۔ چوڑی کی کھنک نے اس کی جنبش کی گواہی دی تھی۔ اگلے لمحے وہ اس کے مقابل تھی۔

''عبدالعلی......!'' اس نے اپنا نازک حنائی ہاتھ عبدالعلی کے کاندھے پر رکھا۔ عبدالعلی اس زاویے پر ساکن رہ گیا۔ اگلے لمحے نہ صرف اس نے ہاتھ جھٹکا بلکہ خود بھی فاصلے پر ہوا تھا۔

''تمہیں تو یہ شادی بھی نہیں کرنی تھی۔ پھر اس مفاہمت کی وجہ......؟'' اس کے سرد لہجے میں اجنبیت کا سارا زہر امنڈ آیا تھا۔ قدر نے سہم کر اس کی شکل دیکھی۔ عبدالعلی کے چہرے پر ازلی سرد مہری کا تاثر تھا۔

''وہ میری غلطی تھی...... میں نے مان لیا اور......''

''تمہاری ذرا سی غلطی کسی کو معلوب ومعتوب کر دے۔ تمہیں کیا فرق پڑے گا۔'' وہ اسے گھورتا ہوا غرایا۔ اس کی جادو اثر آنکھیں خفگی کا غصے کا تاثر لیے قدر پر جمی تھیں۔ جو اعتماد زائل کرنے میں ماہر تھیں۔ وہ بھی اعتماد کھونے لگی۔

''میں نے امن سے بھی معافی مانگی ہے......'' وہ سسکی۔

''کسی کا دل بے دردی سے توڑ دینا بعد میں دو لفظ سوری کے کہہ دینا۔ کیا اس تکلیف اس دکھ کا ازالہ ممکن ہے؟'' عبدالعلی کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھی۔ چہرے کے تاثرات اتنے کبیدہ اور نافہم تھے کہ وہ خوفزدہ ہو رہی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھے نظریں جھکائے وہ آنسو بہانے میں مصروف تھی۔ دل جتنا بھی دگرگوں تھا۔ جان جتنی بھی مشکل سے دوچار تھی۔ مگر وہ پھر بھی ہر صورت اسے منالینا چاہتی تھی۔

''معافی مانگ رہی ہوں نا آپ سے...... آئندہ ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا۔'' عبدالعلی زور سے وارڈروب کا دروازہ بند کر کے بیڈ پر آ کر بیٹھا تو وہ بھی ساتھ ہی آ گئی تھی۔ عبدالعلی نے جھلا کر اسے دیکھا۔ جس کی مدھر سسکیاں ماحول میں دکھ دینے والا احساس بکھیر رہی تھیں۔ کوفت کی لہر برف بن کر اس کے وجود میں دوڑنے لگی۔ بڑی زہریلی تھیں اس کی نظریں کہ قدر کے ہوش ربا حسن کا اثر بھی بے کار رہا۔

''زندگی میرے نزدیک اتنی فضول اور بے کار نہیں ہے کہ اسے تجربات کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ میں تمہیں ایک سے زائد مواقع دے چکا۔ تم کرتی وہ ہو جو تمہارا دل کرتا ہے۔ میں زندگی میں مزید مشکلات نہیں لانا چاہتا ہوں۔ فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ یا تو ویسی بن جاؤ جو میں

چاہتا ہوں۔ ورنہ ہم ایک نہیں ہو سکتے۔''
عبدالعلی کا لہجہ دوٹوک بھی تھا۔ قطعی بھی اور بے نیاز بھی...... قدر اسے دیکھتی رہ گئی۔ بلیک شیروانی کے ساتھ سفید شلوار پہنے فریش شیو کی نیلاہٹوں سے دمکتا بے انتہا خوبرو چہرہ وہ اتنا جاذبِ نظر اور شاندار تھا کہ کسی کے بھی ہوش آسانی سے اڑا سکتا تھا۔ اس کے وجود سے اٹھتی مہک اسے آنچ کی طرح محسوس ہونے لگی۔ اس کی نگاہ کی گرمی سے قدر کا وجود سلگ پڑا تھا۔ افسردگی بارش کی طرح اس کے تن من پر برسنے لگی۔ روح کی کثافت اور بوجھ بڑھتا محسوس ہوا۔ شاید وہ اس کے معاملے میں جتنا اپنا دل کشادہ اور سخی پاتی تھی عبدالعلی کے ساتھ معاملہ ایسا نہیں تھا۔ وہ کمال کی مقناطیسیت رکھنے والا مرد جسے عورت کے حواسوں پر چھانے کے لیے ذرا سی بھی محنت نہ کرنی پڑتی ہو۔ جس کے نرم لہجے اور خوشگوار نظر کو خوش بختی کا پیمانہ سمجھا جائے۔ اس کی جانب سے ایسی بے رغبتی بھی جاں سولی پر ٹانگ سکتی ہے۔ وہ بھی سولی پر محسوس کرنے لگی خود کو۔ کتنا بے حس تھا وہ...... جو بار بار ٹھیس پہنچاتا تھا۔ جسے مان رکھنا آتا تھا...... نہ دل...... اس کے آنسو تواتر سے بہنے لگے۔ عبدالعلی کو اور غصہ آنے لگا۔

''صرف پچھتاوا احساسِ گناہ کو کم نہیں کرسکتا ہے۔ محترمہ! دائرے میں گھومتی ہوئی زندگی کبھی نہ کبھی آپ کو اس مقام پر ضرور لے آتی ہے۔ جہاں سود سمیت ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔ یہ توازن کے لیے بہت ضروری ہے۔'' اس کا انداز صاف جتلاتا ہوا تھا۔ قدر کے آنسو اور روانی سے بہنے لگے۔ آنکھوں میں جاتی ہوئی رہی سہی آس پر بھی تیزی سے مایوسی کی دھند پھیلی۔ اسے لگا وہ عبدالعلی کو نہیں منا سکے گی۔

''آپ معاف نہیں کریں گے؟'' اس کی مایوسی نظروں کے بعد اس کے لہجے میں بھی اتری۔

''تم اگر نہیں سدھرو گی تو نہیں کروں گا۔ سمجھایا تھا کہ عورت کا ایک ہی روپ بھاتا ہے۔ اس کا دنیا میں پہلا روپ ہی رحمت ہے۔ بیٹی بن کر خاندان کے دلوں پر راج کرتی ہوئی۔ بہن بن کر بھائی کی سچی اور مخلص دوست اور ماں کا بازو بن جاتی ہے۔ جب بیوی بنے تو اک پختہ ہمیشہ ساتھ نبھالی والی دکھ کی ساتھی بن جائے۔ مگر تم نے ہر روپ میں مجھے مایوس کیا۔ ہر طرح......'' وہ تاسف سے سر ہلا رہا تھا۔ قدر خاموش رہی۔ اس کی ناراضگی خفگی کو وہ بڑے دل سے سہہ رہی تھی۔ وہ اسے حق بجانب مانتی تھی۔ جب وہ دل کی بھڑاس نکال کر خاموش ہوا قدر آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی معاملہ اگر اتنا بگاڑا اس نے خود تھا تو سدھارنا بھی اسے تھا۔ پیش رفت بھی اسے کرنا تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ عبدالعلی کے پہلو میں آن بیٹھی۔

''ہو گیا آپ کا غصہ ختم...... تو اب معاف کردیں مجھے۔'' عبدالعلی ایک لمحے کے لیے سہی مگر اس کی جرأت اس کے اعتماد کے سامنے ششدر ہوا تھا۔ پھر خود کو سنبھالا تو اسے ڈانٹے بغیر نہ رہ سکا۔

''اٹھو یہاں سے...... اپنی جگہ پر جاؤ۔'' اس کا لہجہ قطعی کوئی گنجائش نہیں رکھتا تھا۔ نہ اس نے درشتی چھپانے کی کوئی کوشش کی۔ قدر کا رنگ متغیر ہوا ضرور تھا۔ مگر اس نے خود کو کمپوز کرلیا تھا۔ زندگی کے اس اہم مقام پر وہ ہرگز ہارنا نہیں چاہتی تھی۔

(لفظ لفظ مہکتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہِ فروری میں ملاحظہ فرمائیے)

مصنفہ کی پہلی تحریر دوشیزہ کے قارئین کے لیے

رومانہ بیٹا ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے جواد صاحب نے اپنی بیٹی کو آواز دی جو کچن میں رات کا کھانا بنانے جا رہی تھی۔

''جی ابو بس میں ذرا سالن بنالوں پھر آرام سے آکر آپ کے پاس بیٹھتی ہوں۔ رومانہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو جواد صاحب نے چشمہ اتار کر سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔''بیٹا سب کام بعد میں کر لینا میں نے ضروری بات کرنی ہے تم یہاں آ ؤ۔

''اچھا ابو۔'' رومانہ نے گیلے ہاتھ دوپٹے سے خشک کرتے ہوئے کہا اور ابو کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔

''وہ بیٹا بات دراصل یہ ہے کہ میرا دوست ہارون جو ہے ناں وہ اپنے بیٹے دانیال کے لیے تمہارا ہاتھ مانگ رہا ہے۔ بہت اچھا، سلجھا ہوا بچہ ہے تم اس بارے میں غور کرنا' انہوں نے ہچکچاتے ہوئے بیٹی سے کہا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

''ابو میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔'' اس نے خفگی سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔'' دیکھو بیٹا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، میں آج ہوں کل نہیں میں چاہتا ہوں کہ تم میری زندگی میں ہی اپنے گھر کی ہو جاؤ۔'' انہوں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

ابو میرے بعد آپ کا کیا ہوگا۔ آپ کو کھانا کون بنا کر دے گا۔ آپ کے باقی کام کون کرے گا آپ کا خیال کون رکھے گا۔ رومانہ کی آواز بھرا گئی۔

''ارے بیٹا! اس میں بھلا اتنا جذباتی ہونے کی کیا بات ہے۔''

انہوں نے پیار سے اسے گلے لگاتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے۔ رومانہ میں جلد از جلد تمہاری فکر سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ میرا سکون اسی میں پوشیدہ ہے میری بچی تم سمجھنے کی کوشش کرو۔''

ان کے لہجے میں چھپی بے چارگی رومانہ نے اچھی طرح محسوس کی تھی۔ اس نے آنسو بھری نگاہوں سے باپ کو دیکھا۔'' اچھا ابو میں سوچ کر

بتاؤں گی۔
چکن بھونتے ابو کی باتیں ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ خیالوں میں ایسی گم تھی کہ دو دفعہ چکن لگتے لگتے رہ گئی۔ پھر اچانک کچھ خیال آنے پر چونک سی گئی اور آنچ دھیمی کر کے موبائل کی تلاش میں کمرے کی طرف گئی۔

ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے ہوئے موبائل کو اٹھایا اور جلدی سے رخسانہ بجو کا نمبر ملایا دوسری ہی بیل پر فون اٹھالیا گیا۔

''ہیلو بجو کیسی ہیں آپ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' بہن کی آواز سنتے ہی وہ بے تابی سے بولی۔ ہاں، ہاں رومی بولو کیا بات ہے پر جلدی کہنا میں صفدر کے ساتھ باہر جا رہی ہوں، اچھا ایسا کرو تم شام کو کال کر لینا ہم لیٹ ہو جائیں گے او کے اللہ حافظ۔'' رخسانہ نے بہن کی پریشانی محسوس کیے بغیر جلدی سے فون بند کر دیا کیونکہ صفدر کار میں بیٹھ چکے تھے۔ بہت ضروری بات کرنی ہے ایک منٹ دیں مجھے، کہتی رہ گئی اور بند فون کو پکڑے کھڑی کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

بجو آپ خود تو اپنی زندگی میں مزے کر رہی ہیں۔ ایک پیار کرنے والا شوہر، پیارا سا بیٹا ہے

آپ کے پاس، آپ کو میری پرواہ ہی نہیں ہے۔ میں کب تک آپ کی باتوں کے مطابق زندگی گزاروں گی، اب میں تھک گئی ہوں، میں بھی چاہتی ہوں کہ میرا بھی اپنا گھر ہو، پیار کرنے والا شوہر ہو۔ پر آپ کو کیا پرواہ میں کیا چاہتی ہوں، آپ کی تو اپنی ہی ایک رٹ ہے اس نے آنسو پونچھتے ہوئے موبائل رکھا گویا کسی نتیجے پر پہنچ گئی ہو۔

☆......☆......☆

جواد صاحب کے دو ہی بچے تھے۔ بڑی رخسانہ اور چھوٹی رومانہ، بڑی بیٹی اپنی خالہ کے گھر بیاہی ہوئی تھی اس کا شوہر ایک کمپنی میں جاب کرتا تھا، گزر اوقات اچھی ہو رہی تھی پر شادی سے پہلے ماں باپ کے گھر میں دولت کی ریل پیل دیکھتی رہی تھی۔ اس لیے اب اس کو کچھ کمی سے لگتی حالانکہ شوہر بہت اچھا تھا محنتی تھا اور محبت کرنے والا۔ ان دونوں کی ماں کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ چھوٹی رومانہ کے رشتے تو بہت آ رہے تھے لیکن رخسانہ نہیں چاہتی تھی کہ رومانہ کی شادی ہو۔ اس کے دل میں خوف بیٹھ چکا تھا کہ اگر چھوٹی بہن کی شادی ہو گئی تو باپ دوسری شادی نہ کرے اور پتہ نہیں آنے والی ان کے باپ کو ان سے چھین نہ لے۔ اور جیسے اب وہ اپنی مرضی سے اپنے باپ کے گھر جا کے رہتی ہے ابو کی شادی کے بعد میکے کا مان نہ چھن جائے اور ابو جو ہر مہینے معقول رقم رخسانہ کی طرف بھیجتے ہیں کہیں بعد میں ان پیسوں سے ہاتھ دھونا نہ پڑ جائے۔

اور دوسری وجہ یہ تھی کہ رخسانہ کو اس بات کا ڈر تھا کہ اس کی پھوپھیاں جو سب اپنے گھروں میں خوشحال زندگی بسر کر رہی تھیں وہ اور تایا سب مل کر اس کے باپ کے گھر پر قبضہ نہ جما لیں اور ان دونوں بہنوں کو گھر سے بے دخل نہ کروا دیں۔ جب اس نے اپنی یہ سوچ رومانہ کو بتائی تو اسے دوسری وجہ پر ہنسی بھی آ گئی۔

''بجو ہماری پھوپھیاں کیسے ہمارے ابو کے گھر پر قبضہ جما سکتیں ہے یہ گھر تو ابو نے اپنی محنت سے بنایا ہے۔'' اس نے مذاق مذاق میں رخسانہ کی پریشانی دور کرنی چاہی۔

ارے تمہیں کیا پتا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ بس تم مجھ سے وعدہ کرو کہ جب تک میں نہیں کہوں گی تم شادی کے لیے راضی نہیں ہو گی۔ چاہے ابو تم پر کتنی زبردستی کیوں نہ کریں، رخسانہ نے بے حسی کی انتہا کرتے ہوئے کہا۔

دروازے کی آواز پر زیبی نے برتن دھونا بند کر کے ہاتھ دوپٹے سے پوچھتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے جواد انکل کو دیکھ کر سلام کرتے ہوئے راستہ چھوڑا۔

''وعلیکم السلام، کیسی ہے ہماری بیٹی، انہوں نے شفقت سے زیبی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں اور رومی کیسی ہے میں کب سے آپ کو یاد کر رہی تھی شکر ہے کہ آج آپ کو ہماری یاد آ گئی۔ زیبی نے خوش دلی سے کہا۔

بالکل ہماری بیٹی ہمیں یاد کرے اور ہم نہ آئیں ایسا کیسا ہو سکتا ہے۔ جواد صاحب نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور اندر صحن میں بیٹھی رقیہ آپا کے پاس بیٹھتے ہوئے سلام کیا۔

کیسے ہو جواد بیٹا! اچھا ہوا جو تم آ گئے میں کب سے تمہاری طرف چکر لگانے کا سوچ رہی تھی۔ ساتھ رومی بیٹا کو بھی لے آتے، انہوں نے پیار سے کہا۔ رقیہ آپا، جواد صاحب کی خالہ زاد

بہن لگتی تھیں اور ان کے گھر سے 3,4 گلیاں چھوڑ کر ہی ان کا گھر تھا اور وہ اپنی ہر پریشانی اور غم ان ہی سے شیئر کرتے تھے کیونکہ ان میں جواد صاحب کو اپنی ماں کی تشبیہ نظر آتی تھی۔

''جی آپا اس کو پھر کبھی لے آؤں گا آج تو مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے انہوں نے رومانہ کے نہ آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

اتنے میں زیبی چائے اور دیگر لوازمات لے آئی، باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی پہلے آپ چائے پی لیں۔ اس نے چائے کے کپ امی اور جواد صاحب کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''ارے بیٹا اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے ٹرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

انکل اس کو تکلف نہیں پیار کہتے ہیں تو وہ بھی مسکرا دیے چائے پینے کے دوران ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہیں اور پھر جب زیبی چائے کے برتن اٹھا کر کچن کی طرف گئی تو رقیہ آپا نے تجسس سے انہیں دیکھا۔ ہاں اب بولو کیا بات ہے۔

آپا میں چاہتا ہوں کہ آپ آج میرے ساتھ آئیں اور رومانہ کو سمجھائیں کہ روز روز اچھے رشتے نہیں ملتے۔'' پھر انہوں نے دانیال کے آئے رشتے اور رومانہ کے انکار کی ساری بات ان کو بتائی۔

آپا 4 سال سے اتنے رشتے آرہے ہیں اس کے، لیکن وہ مان ہی نہیں رہی آپ سمجھائیں، اس کی ماں تو ہے نہیں جو اسے اچھے اور برے کی تمیز بتائے میں تو اسے سمجھا سمجھا کے تھک گیا ہوں۔''

انہوں نے ساری بات بتا کر آپا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولیں۔ ''ٹھیک ہے جواد تم جاؤ میں کل شام میں چکر لگاؤں گی اگر تمہارے ساتھ گئی تو رومانہ کو برا نہ لگے کہ تم نے مجھے بلایا ہے اسے سمجھانے کے لیے۔ میں بہانے سے اسے سمجھاؤں گی تاکہ اسے برا بھی نہ لگے۔

''اوکے آپا ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔ انہوں نے اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو آپا بولیں ارے تم بیٹھو تو سہی کھانا کھا کر چلے جانا۔

نہیں آپا رومی گھر میں اکیلی ہے میں اب چلتا ہوں۔ انہوں نے اصل وجہ بیان کی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆......☆......☆

''ہاں اب بولو کیا بات کرنی ہے تم کیا کہہ رہی تھیں اس وقت، وہ اصل میں صفدر مجھے اور ایان کو گھمانے لے کر جارہے تھے۔ رخسانہ نے رات دس بجے فون کر کے بہن سے معذرت کرتے کہا۔

''کچھ نہیں بجو رہنے دو اب۔'' رومانہ نے بے رخی سے بھیگے گال رگڑتے ہوئے کہا تو دوسری طرف رخسانہ کے دل میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

''کیا پھر کوئی رشتہ آیا ہوا ہے، آخر اس نے بات پکڑ ہی لی۔'' بتاؤ ناں رومی مجھے ساری بات بتاؤ، اس نے بے چینی سے کہا۔

''ہاں دانیال کا رشتہ آیا ہوا ہے اور بجو اس بار میں تمہاری باتوں میں نہیں آنے والی، میں ابو کو ہاں کر دوں گی۔'' اس نے بے دلی سے کہا۔

نہیں رومی تم ایسا نہیں کرو گی بھی تم، تم کیوں نہیں سمجھتی کہ میں تمہیں شادی سے کیوں روکتی ہوں۔'' رخسانہ نے پریشانی سے کہا۔

بجو پچھلے چار پانچ سالوں سے میں تمہاری باتوں کے مطابق عمل کر رہی ہوں لیکن اب اور نہیں، تم خود تو اپنی زندگی میں خوش اور مطمئن ہو تمہیں میری کیا پرواہ، کبھی سوچا ہے کہ میں یہاں

کتنا اکیلی ہوتی ہوں سارا سارا دن پاگلوں کی طرح ایک کمرے سے دوسرے کمرے کے چکر لگاتی رہتی ہوں، کوئی احساس ہے تمہیں میرا کہ ابو گھر نہیں ہوتے تو کتنا ڈر لگتا ہے اس بڑے سارے گھر میں، پر تمہیں کیا پرواہ، بجو سب کچھ پیسہ، دولت، گاڑی ہی تو نہیں ہوتا ناں۔ کچھ اہمیت تو سکون اور مطمئن زندگی کی بھی ہے اور میں بچی تھوڑی ہوں ناں کہ تمہاری باتوں کو نہیں سمجھوں گی۔32 سال عمر ہوگئی ہے میری اور اس عمر میں تو تمہاری گود میں ایان کو آئے ہوئے بھی 2 سال ہو گئے تھے۔'' اس نے سوچ لیا تھا کہ آج بجو کے سامنے اپنا مقدمہ جیتنا ہی ہے۔

دیکھو رومی شادی کے بعد پتا نہیں تمہاری زندگی کیسی ہو جائے مطلب تم کھلے پیسے کی عادی ہو ہر مہینے ابو تمہارے ہاتھ پر ایک بڑی رقم رکھتے ہیں لیکن ضروری تو نہیں ناں کہ شادی کے بعد بھی ایسا ہی ہو، کیا پتا شادی کے بعد تمہارا شوہر تمہیں جیب خرچ میں بہت تھوڑے پیسے دے تو تم کیا کروگی کیسے گزارا کروگی اگر سسرال میں کھلا کھانا پینا نہ ہوا جیسے میرے سسرال میں، میں زندگی گزار رہی ہوں ایسی زندگی تمہیں گزارنی پڑے گی تو تم کیا کروگی۔ رخسانہ نے انتہائی نامعقول وجہ پیش کی تو رومانہ چڑ ہی گئی۔

بجو اتنی بھی ناشکری مت کرو۔ اتنا اچھا شوہر اور سسرال ملا ہے تمہیں ان کی ناقدری مت کرو۔ جہاں تک بات پیسے، دولت کی ہے تو انسان کم دولت میں تو اچھی زندگی گزار سکتا ہے لیکن تنہائی اور بے سکونی میں کیسے اچھی زندگی گزارے گا؟ اس لیے تم اس بات کی فکر مت کرو اور پلیز مجھے اس ٹاپک پر اور کوئی بات نہیں کرنی میں نے فیصلہ کرلیا ہے میں دانیال سے شادی پر تیار ہوں اور اُمید کرتی ہوں کہ تم بھی میری مخلص بہن بن کر میرا ساتھ دوگی۔ رومانہ نے اس کو بہن ہونے کا احساس دلاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

مجھے بھی تحفظ چاہیے کوئی ایسا بندہ چاہیے جسے میں اپنا کہہ کر اپنے سارے دکھ درد اس سے بانٹ سکوں مجھے بھی اچھی زندگی گزارنے کے لیے اچھے شوہر کی ضرورت ہے تم کیوں نہیں سمجھتی بجو۔ آخر تمہیں کب احساس ہوگا کہ میری عمر نکلتی جا رہی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ بہت دیر ہو جائے نہیں میں دیر نہیں ہونے دوں گی۔ وہ ابھی اپنے خیالات میں الجھی خود سے خود ہی سوال جواب کر رہی تھی کہ جواد صاحب کی آواز پر چونک گئی۔

رومی کیا سوچا بیٹا تم نے، انہوں نے لاڈ سے بازو اس کے گرد حمائل کرکے نرمی سے پوچھا۔

ابو ابھی میں نے استخارہ نہیں کیا، اس نے الجھے الجھے انداز میں کہا۔ بیٹا جلدی کرلو استخارہ، تمہارے انکل بہت جلدی مچا رہے ہیں کہ دانیال اور تمہاری شادی کے لیے جواد صاحب نے پیار سے اس کے گال تھپتھپاتے کہا۔ ابھی وہ جواب کے لیے منہ کھولنے ہی والی تھی کہ دروازے کی آواز پر جواد صاحب اٹھ کر دروازہ کھولنے چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ابو کے ساتھ رقیہ آپا کو آتا دیکھ کر اٹھی اور احترام سے سلام کیا۔

کیسی ہو رومی بچے، آج تمہاری بہت یاد آرہی تھی تو سوچا تمہیں مل ہی آؤں تیار تو زیبی بھی تھی پر اچانک ہی اسے کوئی ٹیسٹ یاد آ گیا جس کی تیاری کے لیے رک گئی، تمہیں پتا تو ہے ناں کہ اس کے سارے کام یوں ہی اچانک ہوتے ہیں، رقیہ آپا نے پیار سے اسے گلے لگاتے ہی

ساری تفصیل بتادی جسے سن کر وہ ہنس دی۔
آپا آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے بریانی لاتی ہوں، ہم نے ابھی ابھی کھائی ہے بہت مزے کی بنی ہے آپ بھی کھا کر بتائیں کیسی ہے رومی نے کہتے ہی کچن کی طرف قدم بڑھا لیے۔
ارے بیٹا تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ مجھے آپا مت کہا کرو، آپا تو میں تمہارے باپ کی ہوں تمہاری تو پھپھی لگتی ہوں رشتے میں، آپا نے اسے ٹوکا تو وہ ہنس کر کہنے لگی۔ آپا مجھے آپا کہنے دیجیے مجھے اچھا لگتا ہے آپ کو آپا کہنا، پلیز کہنے دیا کریں ناں، اس نے اتنے لاڈ سے کہا کہ رقیہ آپا نے اچھا کہہ کر جیسے اسے اجازت دے دی۔
''آپا آج آپ رومانہ کو سمجھا کے دانیال کے ساتھ شادی کے لیے تیار کرلیں بڑی مہربانی ہوگی آپ کی، جواد صاحب نے پریشانی سے کہا تو رقیہ آپا کے دل کو جیسے کچھ ہوا۔'' ارے بیٹا تم ایسے مت بولو، میں انشاء اللہ پوری کوشش کروں گی۔
ابھی وہ مزید بھی کچھ کہنے والی تھیں کہ رومانہ بریانی کی گرما گرم خوشبودار پلیٹ ٹرے میں سجائے لے آئی۔ آپا سب باتیں بعد میں پہلے میرے ہاتھ کی مزیدار بریانی کھا کر مزے اڑائیں۔ اس نے فخریہ کہا تو آپا پلیٹ کی طرف متوجہ ہوگئیں اور جواد صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے۔
رقیہ آپا نے جیسے ہی بریانی کی خالی پلیٹ واپس ٹرے میں رکھی رومانہ ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف جانے لگی تب آپا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا، رومی بیٹا میرے پاس بیٹھو تھوڑی دیر۔ انہوں نے اپنے پاس جگہ بناتے کہا تو وہ بیٹھ گئی۔
''جی آپا کیا ہوا کوئی بات کرنی ہے کیا۔ کہہ کر وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔'' ہاں بچے دیکھو تمہاری ماں تو نہیں ہوں لیکن بیٹا مجھے بھی تمہاری فکر بالکل زیبی کی طرح ہے انہوں نے تمہید باندھی۔ کیا بات ہے آپ ایسے کیوں بول رہی ہیں۔
''بیٹا دراصل بات یہ ہے کہ تمہارا باپ تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہے وہ اپنے منہ سے کہتا کچھ نہیں لیکن اس کی آنکھیں سب بتا دیتی ہیں، بیٹا تم سمجھنے کی کوشش کرو دیکھو اس معاشرے میں تنہا عورت کی کوئی عزت کوئی مقام نہیں لوگ اکیلی عورت کو غلط نگاہوں سے بھی دیکھتے ہیں۔ بیٹا بوڑھا باپ بھی کب تک اولاد کو تحفظ دے سکتا ہے اصل تحفظ تو شوہر ہی فراہم کرسکتا ہے۔ دیکھو بچے تم مجھے غلط مت سمجھنا میں تمہیں اس دنیا کی حقیقت بتا رہی ہو دیکھو بچے اگر تمہاری ماں زندہ ہوتی تو وہ بھی تم سے یہ ہی باتیں کرتی جو میں کہہ رہی ہوں بیٹا، ابھی تمہارے پاس وقت ہے اگر ایک بار یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو سمجھو کہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ یہ وقت بھی ایسے ہے جیسے مٹھی سے ریت پھسل رہی ہو۔ تیزی سے جلدی سے بس نکلتی چلی گئی۔ تم سمجھ رہی ہوں ناں۔ انہوں نے بات کے اختتام پر رومانہ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں کی نمی اس کی پریشانی آپا کی نظروں سے چھپ نہ سکی۔
اچھا تو اب ابو نے خود کو اتنا بے بس محسوس کیا کہ گھر کے معاملے میں انہیں آپا کی مدد کی ضرورت محسوس ہوئی یہ سب میری وجہ سے ہوا آخر 5,6 سال سے وہ مجھ سے کہہ کہہ کر مایوس ہوگئے ہوں گے تو انہیں اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ ملا ہوگا۔ اُف میرے اللہ میرے ابو نے خود کو کتنا بے بس اور لاچار سمجھا اور محسوس کیا ہوگا۔ سب میری غلطی ہے لیکن اب میں اپنی غلطی کو

سدھاروں گی۔ ابھی وہ اپنے خیالوں میں ہی مگن تھی کہ رقیہ آپا کی آواز سے چونک گئی جو کہہ رہی تھیں۔

"کیا ہوا بیٹا کیا سوچ رہی ہو۔ میری کوئی بات بری لگی ہے۔ دیکھو بیٹا مجھے غلط مت سمجھنا ابھی وہ اور کچھ کہنا چاہ رہی تھیں کہ رومانہ نے بے اختیار ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"نہیں آپا مجھے آپ کی کوئی بات بھی بری نہیں لگی، آپ سب تو میرے اپنے ہیں میرے بھلائی کے لیے پریشان ہیں پر میں ہی ناسمجھ تھی جو اچھے اور برے کے فرق کو محسوس نہ کر سکی۔ آپ ابو سے کہہ دیں کہ انہیں میرے لیے جو ٹھیک لگے وہی کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "جیتی رہو بیٹی اللہ تمہیں بے شمار خوشیاں دے۔ تمہیں اچھا شوہر اور پیار کرنے والا سسرال ملے۔" رقیہ آپا نے محبت سے کہتے ہوئے اسے گلے لگایا۔ پاس ہی رکھے موبائل پر آنے والے فون کی بیل سے دونوں چونک گئیں۔ کس کا فون ہے بیٹا اٹھا لو ناں، کٹ جائے گا۔ کافی دیر سے بجتے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپا نے کہا۔

"نہیں آپا رہنے دیں ایسے ہی کوئی پریشان کر رہا ہے۔" اس نے بجو کا فون کاٹتے ہوئے کہا۔ اچھا تم بیٹھو میں تمہارے باپ کو یہ خوشخبری سنا کر آتی ہوں کہتے ہوئے آپا کمرے سے نکل گئیں تو چھم سے اس کی آنکھوں کے سامنے دانیال کا عکس جھلملانے لگا۔ خوبصورت، پڑھا لکھا، خوش اخلاق، ملنسار اور سب سے بڑھ کر اس کے ابو کی پسند تھا۔ وہ اچانک ہی بہت مطمئن ہو گئی۔

ویران بہت ہوں

وصال سے تشکیل کر مجھے
تُو پیار کر مجھے...... ذرا تبدیل کر مجھے
صحرا کی تپتی ریت سے
آ کر مجھے بچا
تو ٹھنڈے میٹھے پانی کی
اِک جھیل کر مجھے
ہو جائیں نہ خراب کہیں میری عادتیں
ہر حکم پر نہ اس طرح تعمیل کر مجھے
اب اس طرح سے مجھ کو ادھورا نہ چھوڑ تُو
میں ہوں تیرا وعدہ تو اب تکمیل کر مجھے
چھوڑ کر میرا وجود تجلی سی بخش دے
میں اِک اندھیری رات ہوں قندیل کر مجھے

اس کی ویران آنکھوں میں روشنی کی بھر گئی کہ اچانک دوبارہ سوچتے ہوئے اس کا فون بج اٹھا، اسکرین پر رخسانہ کا نام دیکھ کر اس نے پھر سے کاٹ دیا۔

"سوری بجو، میں اب مزید تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گی۔ میری زندگی پر میرا بھی حق ہے اب میں اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزرنا چاہتی ہوں۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ مجھ سے پیار کرنے والا شوہر ہو جس سے میں اپنے دل کی ہر بات کہہ سکوں اور جہاں تک روپے پیسے کی بات ہے تو میرے نصیب میں جتنا بھی پیسا ہو گا مجھے مل کر رہے گا اور اگر مجھے کم پر بھی گزارا کرنا پڑے تو میں صبر و شکر سے کر لوں گی بس اللہ سے یہی دعا ہے کہ مجھے پیار اور عزت دینے والا شوہر ملے، اس نے آسودگی سے سوچتے ہوئے موبائل آف کر دیا اور مطمئن سی ہو کر اپنا مستقبل اللہ کے سپرد کر کے کچن میں چلی آئی۔ آخر کو ابو اور آپا کے لیے اچھی سی چائے بھی تو بنانی تھی۔

☆☆......☆☆

میرا افسانہ بس اک تُو

قسط 2

''آخر کیا سوچ کر آپ نے ذوئی کو گاؤں جانے کی اجازت دی ہے؟ وہ بھی اکیلی کو......؟ مونٹی بوبی اور پپی کو بھی ساتھ بھیجیں ورنہ کوئی ضرورت نہیں ہے ذوئی کو وہاں بھیجنے کی۔''
ٹھنڈے دماغ سے سوچیے ہم نے اپنی پیاری بیٹی سے وعدہ کرلیا ہے اسے گاؤں......

''کیا بات ہے تمہیں نیند نہیں آرہی؟'' دلاور خان کب وہاں آیا تھا اس کی خود کلامی سن چکا تھا اس سے پوچھا تو وہ ڈر کے اچھلا۔

''اوہ آپ ہیں۔'' بوبی نے اسے دیکھا تو دل تھام کے بولا۔

''نہیں مجھے اتنی جلدی سونے کی عادت نہیں ہے۔''

''تو اچھی عادت ڈالنی چاہیے نا۔'' دلاور خان نے اچھی پر خاصا زور دے کر کہا تھا۔ بوبی کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر کے مسکرا دیا۔

''جی۔''

''اوکے گڈ نائٹ۔'' دلاور خان نے سنجیدگی سے کہا اور اس پر ایک سرد نگاہ ڈال کر وہاں سے چلا گیا۔

''خاک گڈ نائٹ۔ بیڈ نائٹ ہے یہ تو۔ میں نہیں رکنے کا یہاں بس میں کل ہی واپس جاؤں گا۔'' بوبی نے منہ بسورتے ہوئے خود سے فیصلہ کرلیا۔

☆......☆......☆

نینداور خواب کا رشتہ تو بہت گہرا ہے
پر تیرا عکس ہی آنکھوں میں میری ٹھہرا ہے

زویا کروٹیں بدل بدل کے تھک گئی تھی مگر نیند نہیں آرہی تھی۔ آنکھوں میں دلاور خان کی صورت سمائی ہوئی تھی۔ یہ احساس بہت ہی عجیب سا تھا کہ اس کے ستمگر کے گھر میں موجود تھی۔ وہ خود بھی وہاں موجود تھا اور اب وہ اپنے ہی گھر میں تو اسے نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکلی تو راہداری میں چلتے ہوئے اس کی نظر جنت بی بی کے کمرے پر پڑی جس کے ادھ کھلے دروازے سے روشنی باہر نکل رہی تھی۔ زویا نے دروازہ ہاتھ سے پیچھے دھکیلا تو جنت بی بی کو جائے نماز سے اٹھتے دیکھا۔ وہ تہجد پڑھ کے فارغ ہوئی تھیں۔

''میں اندر آجاؤں......؟'' زویا نے دروازے میں کھڑے کھڑے ہی اجازت چاہی۔

''آجاؤ۔'' جنت بی بی نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''شکریہ۔'' وہ اندر چلی گئی۔
''تم سوئی نہیں ابھی تک۔''
''نیند نہیں آرہی، شاید نئی جگہ ہے اس لیے۔''
''میرے لیے تو یہ جگہ نئی نہیں ہے پھر بھی مجھے نیند کیوں نہیں آتی؟''
جنت بی بی کا انداز خود کلامی سا تھا مگر زویا ان کی بات سن چکی تھی۔
''آپ کون ہیں؟ بختاور انکل کی۔''
''بہو ہوں۔''
''زوار خان کی بیوہ۔'' وہ کہتے کہتے ہچکچا گئی۔
''بیوہ تھی کبھی، اب نہیں ہوں۔'' وہ گہرا سانس لبوں سے خارج کرتے ہوئے بستر پہ بیٹھ گئی۔ ''مگر مجھ میں اور بیوہ عورت میں کوئی فرق بھی نہیں ہے۔ میں تو بس نام کی سہاگن ہوں۔''
''آپ کے شوہر۔'' اچانک زویا کی نظر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی ایک فریم شدہ تصویر پر جا پڑی جس میں جنت بی بی دلہن کا لال جوڑا پہنے ہوئے تھیں اور ان کے برابر میں دلاور خان دولہا بنا بیٹھا تھا۔
اب ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ زویا کے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا تھا۔ وہ تصویر دیکھ کر...... وہ جیسے دل ہی دل میں اپنا ہم سفر مانتی تھی۔ جس کے سنگ جیون بنانے کے خواب آنکھوں میں سجائے

پھرتی تھی وہ پہلے ہی کسی اور کا جیون ساتھی بن چکا تھا۔ یہ احساس زویا کو پل بھر میں بے جان کر گیا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، اسے لگا کے وہ گر جائے گی جب ہی وہ ایک دم سے بیڈ کے کنارے پر ڈھے گئی۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

اس کی حالت اس کھلاڑی ایسی ہو رہی تھی جو بہت لمبا راستہ دوڑ کر طے کرتا ہوا وہاں تک پہنچے اور وہاں پہنچ کر اسے پتا چلے کے یہ منزل تو اس کی تھی ہی نہیں وہ تو سراب کے پیچھے دوڑتا رہا اب تک۔ خواب تعبیر سے پہلے چکنا چور ہو گئے تھے۔ جن کی کرچیاں زویا کی آنکھوں میں چبھ رہی تھیں۔ جنت بی بی تسبیح پڑھتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھیں۔ کچھ سوچ رہی تھیں۔

غلطی ہم سے نجانے کہاں ہوگئی؟

عشق آنکھوں سے ہوا اور زندگی ہاتھوں سے گئی۔

''دلاور خان آپ کے شوہر ہیں اب۔'' زویا نے خود کو سنبھالتے ہوئے نارمل انداز میں پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بچے ہیں۔''

''نہیں، بچے ہوتے تو شاید بیوہ ہوتی۔ دلاور خان سے شادی نہ کرتی، جنت بی بی نے دکھ بھرا سانس لیا۔

''حیرت ہے بچے نہیں ہوئے پھر بھی بختاور انکل نے آپ کو اپنے چھوٹے بیٹے سے بیاہ دیا۔ زویا نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''زوار خان کے مرنے کے بعد میں یہاں رہ کے کیا کرتی اولاد تو تھی نہیں۔ میرے میکے والے مجھے میکے لے جانا چاہتے تھے۔ جو کے میرے ساس سسر کو منظور نہیں تھا۔ میرے سسر کو ڈر تھا کہ اگر میں میکے چلی گئی تو زوار خان کی بیوہ کی حیثیت سے اس کے حصے کی جائیداد بھی میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی اور...... میرے میکے والوں نے جو تین مربعے مجھے بیاہ کے وقت دیے تھے وہ بھی ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اس لیے بابا سائیں نے مجھے میکے بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اور میرے میکے والوں نے اس شرط پہ مجھے یہاں رہنے کی اجازت دی کے بابا سائیں دلاور خان سے میری شادی کر دیں۔ دلاور خان کی بہن مومنہ میرے بھائی کی بیوی ہے، چار بچے ہیں اس کے دو بیٹے، دو بیٹیاں۔ اگر یہ ان کی بات نہ مانتے جو جھگڑا ہوتا، بدمزگی ہوتی۔ دلاور کی بہن اور میں وٹے سٹے کی شادی میں بندھے تھے۔ جب ہی زوار خان اولاد کے لیے دوسری شادی نہیں کر سکا تھا کہ کہیں اس کے ایسا کرنے سے میرا بھائی اس کی بہن کو طلاق نہ دے دے۔''

جنت بی بی خود بخود اپنی کہانی سناتی چلی گئی۔ زویا نے محسوس کیا کے وہ بہت عرصے سے اپنے اندر کی آواز کو دبائے بیٹھی ہیں، بات کرنے کو ترس رہی ہیں۔ جب ہی اسے بلا جھجک اور بے دھڑک سب کہہ رہی تھیں اور زویا بہت توجہ سے سن رہی تھی۔

''تو اب میرا مطلب ہے دلاور خان آپ سے شادی کے لیے خوشی خوشی راضی ہو گیا تھا کیا؟'' زویا نے سوال کیا۔

''نہیں اسے تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھا ہمیشہ اور اولاد سمجھ کر پالا تھا۔ وہ مجھے ماں کا درجہ دیتا تھا، پھر بھلا وہ مجھ سے شادی کے لیے خوشی خوشی کیسے راضی ہو جاتا...... پر ہونا پڑا، بابا سائیں کے سامنے انکار کی جرأت کسی کو نہیں ہوتی۔ انہوں نے دلاور کو اپنی جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی تھی تو وہ چپ کر گیا۔ بے جی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے منت، سماجت کی تو وہ مان گیا۔ میں نے بھی بہت انکار کیا پر میری بھی کسی نے نہیں سنی۔ پھر میں بھی یہ سوچ کے چپ ہو گئی کہ میکے جا کے کون سی

تبدیلی آجاتی ہے میری زندگی میں...... میرے باپ، بھائی بھی تو اپنے فائدے کے لیے مجھے واپس لے جانے کی بات کر رہے ہیں، بس پھر کرلی شادی میرے میکے والے آگئے اور حویلی والے شریک ہوگئے۔ چار سال ہوگئے ہیں اس بیاہ کو...... میں نے نکاح کے وقت دلاور خان کو دوسری شادی کی اجازت دے دی تھی۔ زبانی بھی اور تحریری بھی میرے باپ، بھائی نے اعتراض کیا تھا پر زیادہ بول نہیں سکے تھے۔ کیونکہ میں تو بانجھ ہوں...... حویلی کا وارث پیدا نہیں کرسکتی۔ جب ہی میں نے دلاور خان کو دوسری شادی کی اجازت دے دی تھی۔

''وہ تو مرد ہے تین شادیاں اور بھی کرسکتا ہے۔''

جنت بی بی بولتے بولتے خاموش ہوگئیں جیسے تھک گئی ہوں۔

''یہ تو بہت ظلم ہے، زیادتی ہوئی ہے آپ کے ساتھ۔''

زویا نے مترحم آمیز نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو دستور ہے یہاں کا، دلاور نے ہمیشہ مجھے ماں والا احترام دیا ہے۔ پندرہ سال چھوٹا ہے وہ مجھ سے اس کے کام میں ایسے بھاگ بھاگ کے کرتی جیسے ماں اپنے بچے کے کام کرتی ہو۔ اس نے بھی میرا بہت خیال رکھا ہمیشہ اپنا ہر دکھ، سکھ وہ مجھے آ کے بتاتا۔ کیا پتا تھا تقدیر ہمارے ساتھ یہ کھیل کھیلے گی۔ وہ مجھے اور میں اسے میاں بیوی کے رشتے میں قبول ہی نہیں کرپائے آج تک۔ اور نہ کبھی کرپائیں گے۔

''جنت بی بی نے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا، بولتے بولتے گلا سوکھ گیا تھا ان کا۔''

''آپ پڑھی لکھی لگتی ہیں لب ولہجے سے باتوں سے۔''

زویا نے ہمدردانہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو مسکرا کے بولی۔

''ہاں زویا بی بی، یہ ٹی وی نے سب سکھا دیا ہے، پڑھی لکھی ہوں بس دسویں جماعت پاس کی تھی شادی ہوگئی۔ یہاں جتنا بھی پڑھ لکھ جاؤ سب بے کار ہے ہم ان فرسودہ رسموں، رواجوں سے جان نہیں چھڑوا سکتے۔''

''دلاور تو باہر رہتا ہے زیادہ تر، شہر میں پڑھا لکھا ہے۔ اس کی سوچ بھی ایسی ہی ہے؟'' زویا نے درد سے پھٹے سر کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے پوچھا۔

''شہر میں پڑھنے یا رہنے سے انسان اپنی اصل تھوڑی بھول جاتا ہے۔ شہروں میں بھی تو یہی ہوتا ہے طاقتور، کمزور کو غلام بنا کے خوش ہوتا ہے، بڑا چھوٹے پہ حکومت کرتا ہے امیر غریب کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ تو بھلا دلاور خان خود کو کیسے بچا سکتا ہے۔ حکم چلانا، حکم دینا تو مرد کی فطرت ہے۔ اور یہاں گاؤں، پنڈوں، دیہاتوں میں بھی بڑے زمیندار، جاگیردار اور وڈیرے اپنے کمیوں، مزارعوں اور ہاریوں کو اپنا غلام بنا کے رکھتے ہیں۔ وہ اپنی سرشت کیسے بدل سکتے ہیں۔ اپنی رعایا پہ حکم چلا کے، اپنی حکومت چلاتے ہیں وہ...... نیا کیا ہے اس میں؟ بادشاہی کا شوق کسے نہیں ہوتا؟ تخت و تاج کسے برا لگتا ہے؟ لوگ آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہوں۔ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں آپ کے تلوے چاٹیں۔ بھلا کون ایسا نہیں چاہے گا۔ یہاں تو سب راج کرنا چاہتے ہیں۔ چاہے اس کے لیے کسی کو تاراج ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔''

جنت بی بی اپنے اندر کی بھڑاس نکالتے ہوئے بستر پر نیم دراز ہوگئیں۔

''آپ خوش ہیں اپنی زندگی سے؟'' زویا کو خود ہی اپنا سوال بے معنی محسوس ہوا تھا۔

”زندگی سے کیا گلہ؟“ وہ کھوئے کھوئے اداس لہجے میں بولیں۔

”زندگی کا تو کوئی قصور نہیں ہے اس سب میں۔ یہ تو لوگوں کے رویے، برتاؤ سوچ، حالات اور ماحول طے کرتے ہیں نا کہ ہماری زندگی کس رستے پہ چلے گی، کیسے گزرے گی؟

زندگی تو رب سوہنے کی بہت بڑی نعمت ہے اور ہم اس نعمت کا نہ تو شکر ادا کرتے ہیں نہ اس زندگی کا حق ادا کرتے ہیں بس اسے ضائع کر کے قبر میں جا سوتے ہیں۔“

”آپ نے ان رسموں، رواجوں سے کبھی بغاوت کیوں نہیں کی؟ کیا بغاوت کا کوئی خیال نہیں آیا آپ کے دل میں۔“

زویا نے ان کے تھکے تھکے گندمی رنگت والے خوش شکل چہرے کو دیکھا۔

”خیال تو بہت دفعہ آیا، لیکن خیال کو عمل کا پیرہن دینا آسان نہیں ہوتا۔ اور صدیوں سے فرسودہ رسموں کی جہالت آمیز عملداری کرنے والے جابر اور شاطر جاگیرداروں کے بیچ مجھ جیسی کمزور عورت کیا کر سکتی ہے بھلا؟ نقار خانے میں طوطی کی آواز کوئی نہیں سنتا زویا بی بی۔“

”دلاور کا رویہ کیسا ہے آپ کے ساتھ؟“ زویا نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے خیال رکھتا ہے جیسے پہلے رکھتا تھا مگر وہ خود بجھ سا گیا ہے اس رشتے میں جڑنے کے بعد سے۔ شرمندہ شرمندہ سا، نظریں چراتا، دور دور رہتا ہے۔ بہت مشکل ہے نا اس کے لیے اس رشتے کو قبول کرنا، اپنانا۔“

جنت بی بی نے ایمانداری سے بتایا تو وہ سلگ کر بولی۔

”اگر اسے یہ رشتہ قبول کرنا اتنا ہی مشکل لگ رہا تھا، شرمندگی کا احساس ستاتا رہتا ہے اسے تو وہ اس وقت اسٹینڈ لیتا ڈٹ جاتا، انکار کر دیتا آپ سے شادی کرنے سے مگر کیسے کرتا انکار۔ اسے بھی تو دولت چاہیے تھی نا۔“

”دولت کسے نہیں چاہیے؟“ جنت بی بی مسکرائیں۔

”پھر بھی رشتہ تو جوڑا ہے نا اس نے آپ سے۔ نکاح کوئی مذاق تو نہیں ہوتا۔ کیا ہے تو اب نبھائے بھی اس رشتے کا حق بھی ادا کرے۔“ زویا کو ساری حقیقت جاننے کے بعد دلاور خان پر غصہ آ رہا تھا بلکہ حویلی کے سب مردوں کو وہ خود غرض اور لالچی مرد ہونے کا خطاب دل ہی دل میں دے بھی چکی تھی۔

”میں خود بھی نہیں چاہتی کہ وہ اس رشتے کا حق ادا کرے۔ یہ ہم دونوں کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ پندرہ سال کا فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہوتا زویا بی بی۔“

جنت بی بی کے لفظوں اور لہجے میں زندگی کی رمق باقی نہیں تھی۔ وہ جو ہے جیسے ہے کی بنیاد پر حالات سے سمجھوتہ کر چکی تھیں۔ کوئی، خوشی، کوئی امید ان کے اندر نہیں رہی تھی۔ وہ ہر طرح سے تھک کر ہتھیار ڈال چکی تھیں۔ انہیں زندگی سے اب کوئی خوشی، کوئی رنگ نہیں چاہیے تھا۔ وہ تو بس اپنے دن پورے کر رہی تھیں۔

”ارے ایسے کیسے ناممکن ہے؟“ زویا پرجوش لہجے میں بولی۔

”ہمارے نبی پاک حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہؓ، آپ ﷺ سے پندرہ برس بڑی تھیں عمر میں۔ آپ دونوں کی شادی ہوئی اور کتنی کامیاب ہوئی کیا ہم نہیں جانتے۔“

”ٹھیک کہتی ہو تم لیکن بیٹی ہم نبی ولی تھوڑی ہیں عام انسان ہیں۔ ہمارے لیے یہ سب اتنا آسان

نہیں ہے۔ہم بڑے کمزور ہیں عمل کے معاملے میں۔اور جب ایک لڑکے کو ایک عورت نے ماں کی طرح پالا ہو اس کا خیال رکھا ہو تو بہت ہی مشکل ہے یہ سب۔"

جنت بی بی نے اسے صورتحال کی نزاکت سمجھائی۔

"ہم آپ مسلمان ہیں ناں، پھر بھلا اپنے نبی پاک ﷺ کی سنت پر عمل کرنے میں جھجک کیسی؟"

"تم بھی اپنی جگہ ٹھیک ہو، پر دل اس رشتے اور تعلق کو نہیں مانتا۔جس رشتے کو دل قبول نہ کرے اسے عمل کا لباس پہنانا تو منافقت ہے اس رشتے کی تذلیل ہے۔"

جنت بی بی نے سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا تو زویا بس انہیں دیکھ کر رہ گئی۔فجر کی اذان شروع ہو گئی تھی۔وہ ان کو سلام کر کے اپنے کمرے میں چلی آئی۔وضو کر کے نماز ادا کی اور سونے کے لیے بستر پر آ گئی۔

اس کا دماغ سلگ رہا تھا دل الجھ گیا تھا۔روح پاگلوں کی طرح جسم کے زندان میں سر پٹخ رہی تھی......محبت یک طرفہ ہو تو اسی طرح سر پٹخا کرتی ہے۔رونے پر کوئی آنسو پونچھنے والا نہیں ملتا نہ درد بانٹنے والا۔اپنا درد آپ ہی سہنا پڑتا ہے اپنے آنسو اپنے ہی دامن میں سمونے پڑتے ہیں وہ بھی کسی کی ہمدردی پائے بغیر۔

"زویا، وہ کبھی تمہارا تھا ہی نہیں، اس نے کبھی تم سے نرمی سے پیار سے بات تک نہیں کی ہمیشہ تمہاری Insult ہی کی ہے اور اس کا یہ گھر یہ ماحول، اور سب سے بڑھ کر اس کی بیوی موجود ہے۔وہ شوہر ہے ایک بے بس عورت کا۔وہ ایک بٹا ہوا مرد ہے ایک خود سر اور مغرور آدمی، اور تم اس کے ساتھ کی تمنا کر کے خود کو فریب دے رہی تھیں۔اپنے لیے مشکل راستہ چن رہی تھیں وہ راستہ جس کی کوئی منزل ہی نہیں ہے، وہ راستہ جو سراب کی طرف جاتا ہے تم دلاور خان کی حویلی میں اور زندگی میں کہیں Exist نہیں کرتیں، نہ کہیں ایڈجسٹ کر سکتی ہو۔یہاں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔کوئی بڑا فریب کھانے سے پہلے ہی سنبھل جاؤ۔تمہارا یہاں آنا شاید تقدیر کی طرف سے تمہیں خبردار کرنے اور سمجھانے کے لیے راستہ دکھانے اور درست سمت سفر کرنے کے لیے ایک موقع تھا اور تمہیں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔دلاور خان تمہیں کچھ نہیں سمجھتا سوائے ایک بدتمیز اور بے باک لڑکی کے۔تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور اپنا راستہ الگ کرو۔تم جس راستے پر چل رہی تھیں وہ تمہارے ہمقدم کبھی بھی نہیں تھا۔"

زویا کو اس کے دل و دماغ نے سمجھایا تو اس نے بھی کھلے دل سے حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

☆......☆......☆

دل ساڈا شا کر شیشے دا
افسوس! لوہار دے ہتھ آ گیا

صبح ساڑھے آٹھ بجے اسے کریماں نے بڑے زور و شور سے جگایا تھا وہ بمشکل ایک گھنٹہ سوئی تھی آنکھیں کھل نہیں رہی تھیں۔بڑی مشکل سے وہ آنکھیں مسلتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

"بی بی سائیں! ناشتہ تیار ہے۔"

"سب نے کر لیا ناشتہ۔زویا نے بستر سے اترتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بی بی، سب فارغ تھی گئے ہن۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ میں تیار ہو کے آتی ہوں۔"

زویا اپنے سوٹ کیس میں سے کپڑے نکالنے لگی۔کریماں واپس چلی گئی۔

"السلام وعلیکم!" وہ نہا کر تیار ہو کے بے جی کے پاس آئی تو رضیہ اور دلاور نے بھی اسے بہت حیرانگی سے دیکھا تھا۔ سفید ٹراؤزر پر لمبا سا اسٹائلش فراک پہنے، گیلے بالوں کو کھلا چھوڑ کر وہ سر پہ گلابی آنچل اوڑھے اس شاکنگ پنک فراک میں اور بھی زیادہ کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ میک اپ کی ضرورت ہی نہیں تھی اسے ہر طرح کا میک اپ حسن و دلکشی قدرت نے اسے عطا کر دیا تھا۔ اس کی تو سادگی بھی کمال تھی۔ دلاور خان اس کے اپنی جانب دیکھنے پر نگاہ چرا گیا۔

وعلیکم سلام، جیوندی رہ دھیے، آ بیٹھ، کیا کھائے گی میری دھی؟"

بے جی نے اسے دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے بہت محبت سے اپنے پاس بٹھا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں بے جی، صرف ایک گلاس دودھ یا جوس۔"

زویا نے مسکراتے ہوئے کہا اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں کی سوجن اور سرخی اس کے رت جگے کی غمازی کر رہی تھیں۔ دلاور خان کو عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی آنکھیں کوئی کہانی سنا رہی ہوں۔

"کریماں، جوس لا اور باقی ناشتہ ذرا ٹھہر کے لائیں۔"

بے جی نے کریماں کو حکم دیا اور اُس نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

"لگتا ہے تم رات بھر سو نہیں سکیں۔" دلاور خان نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اکھیاں لال ہو رہی تھیں یہ کریماں بھی کملی ہے کہا تھا اگر بی بی جاگ رہی ہو تو ناشتے کا بولنا پر اس نے تو تجھے جگا ای دیا۔ صبح میں نے دیکھا تو تو فجر پڑھ رہی تھی ماشاء اللہ۔

یہ تو چنگی گال (بات) ہے۔" بے جی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا وہ خاموشی سے جوس پیتی رہی۔ اس کے دماغ میں جنت بی بی سے رات کے وقت ہوئے والی گفتگو گردش کر رہی تھی۔

"ہاں لوگوں کو امپریس کرنے کے لیے دکھاوے کی نمازیں بھی ایک آرٹ ہے ان جیسوں کا۔" دلاور نے تلخی سے کہا۔

"بے نمازی سے دکھاوے کی نماز کہیں بہتر ہے کہ اسے دیکھ کر کسی بے نمازی کو نماز ادا کرنے کی ترغیب تو مل ہی سکتی ہے اور ویسے بھی میں اپنے کمرے میں نماز ادا کر رہی تھی وہاں مجھے کوئی دیکھ نہیں رہا تھا سوائے میرے اللہ کے۔ بے جی نے کب دیکھا مجھے معلوم نہیں۔" زویا نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"دلاور پتر، اس طرح نہیں کہتے۔" بے جی نے دلاور خان کو ٹھوکا دیا۔

"مجھے بوبی کے ساتھ باہر جانا ہے کہاں ہے وہ؟"

وہ جوس ختم کر کے کھڑی ہوگئی۔

"باہر بیٹھک میں ہے۔" دلاور خان نے جواب دیا اسی وقت بختاور خان چلے آئے۔ بے جی اور رضیہ ایک دم سمٹ سی گئیں۔ دوپٹے سروں پہ ٹھیک سے اوڑھ لیے۔ نظریں جھکا کر کھڑی ہوگئیں۔

زویا ان کو بغور دیکھ رہی تھی ان کے تاثرات نوٹ کر رہی تھی۔ بختاور خان کو سلام کیا تو انہوں نے بہت شفقت سے جواب دیا۔

"وعلیکم السلام، کیا حال ہے پتری؟ نیند تو ٹھیک سے آئی نا یہاں؟"

"جی میں ٹھیک ہوں، پر نیند نہیں آ سکی، نئی جگہ ہے نا شاید اس لیے۔"

"ہاں ہاں یہی وجہ ہوگی اور آج کیا پروگرام

ہے۔؟''

''بھائی کے ساتھ گاؤں کی سیر کروں گی، اپنی زمینوں کا چکر بھی لگاؤں گی۔ زویا نے انہیں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''ہوں، ٹھیک ہے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے دھڑک بتانا، شرمانا نہیں اسے اپنا ہی گھر سمجھو اور دلاور خان۔'' وہ زویا سے بات کرتے کرتے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''جی بابا سائیں!'' وہ مؤدب ہو کر بولا۔

''ہماری دھی رانی کو گاؤں کی سیر کراؤ اور اپنی زمینیں بھی دکھاؤ اور خوب خاطر داری کرو ہمارے مہمانوں کی، کوئی کمی نہیں رہنی چاہیے ان کی مہمان داری میں۔ سن رہی ہو علیشاں بی بی۔''

''جی سائیں، آپ فکر نہ کریں۔''

بے جی نے ہلکا سا مسکرا کے جواب دیا۔ یہ حکم بیوی اور بیٹے دونوں کے لیے تھا۔ زویا نے دیکھا دلاور خان اس حکم سے کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ گویا اسے زویا کا وہاں آنا بہت ناگوار گزر رہا تھا۔

یہ احساس زویا کے لیے بہت شرمندگی کا باعث تھا۔

''میں شہر جا رہا ہوں چار پانچ دن لگ جائیں گے مجھے۔ تب تک دلاور خان تم ادھر کا کام دیکھو گے۔''

''ٹھیک ہے بابا سائیں۔'' دلاور خان نے فرمانبرداری سے کہا اور ان کے شہر روانہ ہوتے ہی زویا نے بھی اپنے شولڈر بیگ میں اپنا ڈیجیٹل کیمرہ، آڈیو ریکارڈر، پیپر پین موبائل وغیرہ رکھے۔ اور اپنے کمرے سے باہر آ رہی تھی کہ دلاور خان سے راہداری میں سامنا ہو گیا۔ وہ گزر جانا چاہتی تھی لیکن اس نے راستہ روک لیا۔

''کیا ثابت کرنے آئی ہوں یہاں؟'' وہ اس کے چاند چہرے کو گھور رہا تھا۔

''نیک پروین بن کے سب کا دل جیت کے اپنے لیے اس حویلی میں راہ ہموار کرنا چاہتی ہو۔ شادی کرنا چاہتی ہو مجھ سے؟''

''میرے متعلق اپنی ہر غلط فہمی اور خوش فہمی ختم کر لو کیونکہ مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔'' زویا نے بڑے ضبط سے جواب دیا وہ مسلسل اس کی بے عزتی کر رہا تھا۔

''کیوں تم تو مجھے بہت پسند کرتی تھیں، بہت چاہتی تھیں ناں؟ وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''جواب تو تم نے خود ہی دے دیا ہے ''تھیں'' کہہ کر اور ویسے بھی مجھے بزدل مرد ہرگز پسند نہیں ہیں۔ ایک بیوی کے حقوق تو تم ادا نہیں کر سکتے دوسری کا شوق چرایا ہے۔''

''شٹ اپ۔'' دلاور خان کا ہاتھ اٹھ گیا تھا اس کے گلابی گال پر اپنے نشان چھوڑ گیا تھا۔ رضیہ ادھر آ رہی تھی یہ منظر دیکھ کر گھبرا کر بے جی کو بلانے دوڑی۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئے مجھ سے یہ بکواس کرنے کی؟ کبھی اپنے آپ پہ نظر ڈالی ہے آوارہ بے حیا، ہر وقت مردوں کے بیچ رہتی ہو۔ یہاں بھی لے آئیں نا ان چھچھوروں کو۔''

''تمہیں میری اور میرے دوستوں کی انسلٹ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے مسٹر، تم اور تمہارے گاؤں کے، حویلی کے مرد تو جیسے بہت نیک، پارسا اور شرم و حیا والے ہیں ناں۔ ایک ایک مرد نے تین تین شادیاں کر رکھی ہیں اور نجانے محبت کے نام پہ کتنی لڑکیوں کی زندگی برباد کی ہوں گی۔ اپنی راتیں رنگین اور شامیں خوشگوار بنانے کے لیے تم مردوں نے کتنی لڑکیوں کو تباہ کیا ہوگا؟ میرے کردار پر انگلی اٹھانے

سے پہلے اپنے گریبان میں تو جھانک لو۔ آئینے میں پہلے اپنا چہرہ تو دیکھ لو جو بے بسی کی گرد سے اٹا پڑا ہے۔''

''شٹ اپ۔'' دلاور خان کا خون کھول اٹھا۔ اسے خود پہ قابو نہ رہا اور پھر سے اس کے رخسار پہ طمانچہ رسید کر دیا۔

''دلاور پتر رُک جا کیا کر رہا ہے؟'' بے جی کی آواز ان دونوں کو سنائی دی۔ زویا کے تو دو تھپڑوں سے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لیے دیوار کا سہارا لیا۔

''تم نے مجھ پہ ہاتھ اٹھایا۔ جنگلی، جاہل، اجڈ، گنوار، بدتمیز۔ زویا غصیلے لہجے میں بولی۔

''تم تو جیسے بہت تمیزدار ہو نا، بھولی بھالی اور معصوم ہو۔''

''ہاں ہوں میں معصوم...... معصوم نہ ہوتی تو تم جیسے بے حس اور جنگلی آدمی سے۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''دلاور یہ کیا کر رہا ہے تو؟ پاگل ہوا ہے یہ مہمان ہے ہماری۔

بے جی اور جنت بی بی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ بے جی نے دلاور کو بازو سے پکڑ کے لتاڑا۔

''یہ اپنی مہمان نوازی اور اپنی اصلیت ہی تو دکھا رہا ہے میں تو اس کی نظر میں بہت بے باک اور بدتمیز ہوں۔ یہ کون سا تمیزدار ہے۔ یہ اس کی روایت، تمیز تہذیب اور اخلاقیات ہیں کے ایک مہمان لڑکی پہ ہاتھ اٹھائے۔ اسے تشدد کا نشانہ بنائے۔ اس کی بے عزتی کرے۔ یہ کیا حق میزبانی ادا کرے گا۔ بے چارہ۔''

زویا غصے سے دلاور خان کو دیکھتی ہوئی تلخ اور تیز لہجے میں بولی اور تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

''دلاور، یہ کیا کیا تو نے؟'' جنت بی بی کی آنکھوں ہی نہیں ان کے لہجے میں بھی حیرت اور افسوس چھلک رہا تھا۔

''بھلا ہوا ہے کیا؟ وہ شہر کی لڑکی ہے۔ بے جی غصے سے بولیں۔

''شہری نہیں ہے، شیرنی ہے شیرنی۔'' دلاور خان سر جھٹک کر بولا۔ ''تو تُو کیوں جھگڑ رہا تھا اس شیرنی سے۔ تیرے علاقے پہ قبضہ تو نہیں کر رہی تھی وہ...... یا قبضہ کر چکی ہے؟''

جنت بی بی کا لہجہ اور جملہ معنی خیز تھا۔ دلاور خان نے چونک کر انہیں دیکھا اس کے پاس ان کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔

''تُو نے اس پہ ہاتھ اٹھا کے اچھا نہیں کیا پتر۔ وہ کیا سوچ رہی ہوگی کے یہ ہے ہماری میزبانی۔ ہم اپنے مہمان کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔ تیرے بابا سائیں کو پتا چلا تو اس حویلی میں قیامت آ جائے گی۔ چل اس سے معافی مانگ اس سے پہلے کے وہ اپنے گھر والوں کو بتا دے۔ معافی مانگ لے ورنہ ہم سب کی کھال کھینچ دیں گے سائیں جی۔''

بے جی نے اسے نرمی سے خوف و خدشوں سے پر لہجے میں اسے صورتحال کی متوقع سنگینی سے آگاہ کرتے ہوئے سمجھایا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چل میرے ساتھ۔'' بے جی اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے زویا کے کمرے میں لے آئیں۔ جنت بی بی بھی ان کے ساتھ تھیں۔

☆......☆......☆

زویا بیڈ کے کنارے پہ بیٹھی رو رہی تھی۔ دلاور خان نے اسے روتے دیکھا تو شرمندگی سے نظریں جھکا کر ہونٹ کاٹنے لگا۔

''زویا دھی، اسے معاف کر دے، غلطی ہو گئی ہے اس سے۔
بے جی نے اس کے پاس آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر خجالت سے کہا۔
''غلطی...... اس سے نہیں ہوئی بے جی، اس نے تو وہی کیا ہے جو اسنے سیکھا ہے اور دیکھا ہے، جو یہ سوچتا ہے۔
غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے جو میں اس کو جانتے ہوئے بھی حویلی میں چلی آئی۔ مجھے آج تک میرے ماں باپ نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں مارا، اور اس جنگلی نے مجھے دو تھپڑ مارے۔ کیا سوچ کے ہاتھ اٹھایا مجھ پر......؟ میں کوئی لا وارث ہوں؟ گری پڑی لڑکی ہوں کیا سمجھا ہے تم نے مجھے......؟ عورت کی عزت کرنا نہیں سکھایا تمہیں کسی نے؟ زویا بولتے بولتے اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ بے جی اور جنت بی بی کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے اس صورتحال کو دیکھ کر۔
''میں یہاں ایک ہفتے کے لیے آئی تھی...... تم سے تو ایک دن بھی برداشت نہیں ہوا میرا یہاں رہنا۔ اتنی ہی نفرت کرتے ہو مجھ سے تو منع کر دیتے میرے پاپا کو کہ وہ مجھے یہاں نہ بھیجتے۔ اور تم کون ہوتے ہو میرے کردار و گفتار پہ رائے دینے والے؟ تم کو کس نے یہ حق دیا کہ تم میرے دوستوں کی بے عزتی کرو؟ تم ہوتے کون ہو یہ فیصلہ کرنے والے کہ مجھے کس سے ملنا چاہیے؟ کس سے نہیں ملنا چاہیے؟ کس سے دوستی کرنی چاہیے کس سے دوری اختیار کرنی چاہیے؟ کس ناطے تم مجھ پہ برسے ہو، طنز و تنقید کے نشتر چلاتے ہو؟ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟ بولو؟ عزت دی تھی تمہیں جو شاید تمہیں راس نہیں آ رہی۔''
زویا کو زندگی میں پہلی بار اتنا شدید غصہ آیا تھا۔
دلاور خان کو بھی توقع نہیں تھی کے وہ اس طرح بھی پھنکار سکتی ہے اسے اس طرح کٹہرے میں کھڑا کر کے اس سے جواب طلبی کر سکتی ہے وہ شرمندہ تھا اپنے رویے پر اور اس کے کسی سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے اس کے چہرے پر غصے اور اپنے مارے ہوئے تھپڑوں کی آگ کو دہکتے ہوئے دیکھا اور بس شرمندگی سے اتنا ہی کہا۔
''آئی ایم سوری۔''
''ہنہ، سوری، اتنا کچھ مجھے سنا دیا اور دو تھپڑ بھی مارے تم نے مجھے، اور تمہیں لگتا ہے کے تمہاری سوری کہہ دینے سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہارا سلوک بھول جاؤں گی۔ ابھی اگر میں نے اپنے بھائی کو جا کے بتا دیا نا تو وہ تمہارے ان تھپڑوں کا ایسا جواب دے گا کہ تم ساری زندگی یاد رکھو گے۔''
زویا غصے سے پھنکاری۔ بے جی اور جنت بی بی خوف اور پریشانی سے لرز رہی تھیں۔
'بات کیوں بڑھا رہی ہو کہا نہ سوری۔'' وہ تپ کر بولا۔
''مجھے تمہاری 'سوری' قبول نہیں کرنی۔''
''تو تھپڑ مار کر بدلا لے لو۔ دلاور خان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
تو جنت بی بی نے حیرت اور خوف سے نکلتی چیخ کو منہ پہ ہاتھ رکھ کے روکا تھا۔ بے جی دل تھامے بھیگتی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔
''ہاں ہونا تو یہی چاہیے تھا تمہارے ساتھ۔ لیکن میں تمہیں تھپڑ نہیں ماروں گی کیونکہ تم میں اور مجھ میں جو فرق ہے اسے باقی رہنا ہی چاہیے مسٹر دلاور۔''
زویا نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا اور اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی دلاور خان شرمندہ سا اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔

''لڑکی تو سچ مچ شیرنی ہے شیرنی۔''
جنت بی بی نے مسکراتے ہوئے کہا اور دلاور خان کو تاسف دیکھتی وہاں سے چلی گئیں۔

☆......☆......☆

''یہ کیا مذاق ہے ذوئی؟ میں صبح سے تمہارا ویٹ کر رہا ہوں اور تم اب آ رہی ہو۔ ساڑھے دس بج رہے ہیں۔''
بوبی نے اسے دیکھتے ہی روٹھے روٹھے لہجے میں کہا تو وہ ہنس دی۔
''سوری برادر، میں رات سو نہیں سکی۔ اور صبح اٹھی تو چنگیز خان جنگ لڑنے آ گیا۔'' زویا نے اس کے ساتھ حویلی سے باہر نکلتے ہوئے بتایا۔ بوبی نے اس کے چہرے پر انگلیوں کے نشان دیکھے تو ٹھٹھک کے رک گیا۔
''اس بدتمیز آدمی نے تم پہ ہاتھ اٹھا ہے، تم روئی ہو ذوئی؟''
''ارے نہیں، وہ تو جنت بی بی کی کہانی سن کے رونا آ گیا۔ ہاتھ کا نشان میرا اپنا ہے میں اپنا ہاتھ گال کے نیچے رکھ کر ہی لیٹی رہی تھی نا ان کی کہانی سنتی رہی تو نشان پڑ گیا۔''
زویا نے فوراً بات بنا دی۔
''سچ بتاؤ ذوئی، تم جھوٹ تو نہیں بول رہیں۔ اس دلاور خان نے تو تمہارے منہ پر تھپڑ نہیں مارا نا۔ بتاؤ میں اس کا منہ توڑ دوں گا اس کی ہمت کیسے ہوئی میری بہن پر ہاتھ اٹھانے کی ہاتھ توڑ دوں گا میں اس کے سمجھتا کیا ہے وہ خود کو۔''
بوبی نے بہت غصے سے پر جوش لہجے میں کہا اس کے انداز میں بھائی کا پیار اور احساس محسوس کر کے زویا خوشدلی سے مسکرا دی۔
''بوبی، ریلیکس، ایسا کچھ نہیں ہے وہ مجھے کچھ کہے گا تو کیا میں اسے ایسے ہی چھوڑ دوں گی؟'' زویا نے اس کا بازو پکڑ اکر اسے نرمی سے کہا۔
''سچ کہہ رہی ہو نا۔'' بوبی اس کے رخسار کو سہلانے لگا جس پر دلاور خان کی انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔
''ہاں۔'' وہ مسکرا دی۔
''تھینک گاڈ!'' بوبی نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ حویلی کے گیٹ سے باہر نکلتے دلاور خان نے یہ منظر دیکھ کر قہر آلود نظر ڈالی تھی زویا پر۔ وہ دونوں اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔
''اور یہ جنت بی بی کون ہیں؟'' بوبی نے گاڑی کے پاس رک کر پوچھا۔
''دلاور خان کی بیوی۔''
''واٹ؟'' بوبی نے حیرانگی سے اس کا چہرہ دیکھا۔
''ہاں وہ اس کے بھائی کی بے اولاد بیوہ تھی بختاور انکل نے دلاور سے اس کی شادی کروا دی تاکہ جائیداد گھر سے باہر نہ جا سکے۔ جنت بی بی دلاور خان سے پندرہ برس بڑی ہیں۔'' زویا نے اسے تفصیل سے بتایا۔
''اوہ ویری اسٹرینج نا۔''
''ہوں۔'' زویا نے لمبا سانس لیا۔
''ذوئی تم ٹھیک ہو نا۔'' بوبی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی نظریں اس کے چہرے میں درد کو کھوج رہی تھیں کیونکہ وہ جانتا تھا کہ زویا دلاور خان کو پسند کرتی ہے اسے ڈر تھا کہ دلاور خان کی شادی کی خبر نے اسے ہرٹ نہ کیا؟ جب ہی وہ فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔
''بس آئی ایم پرفیکٹلی آل رائٹ، اچھا ہوا نا یہاں آ کر حقیقت معلوم ہو گئی بچت ہو گئی۔ سراب اور خواب واضح ہو گئے۔

اب نو ٹینشن، رستہ صاف ہے صحیح منزل کا تعین کرنے میں مشکل نہیں ہوگی۔'' وہ ہنس کر نارمل لہجے میں بولی۔
''انشاء اللہ!'' بوبی نے مطمئن ہو کر مسکراتے ہوئے کہا اور دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

☆......☆......☆

ٹوٹ کر بھی دھڑکتا رہتا ہے
دل سا کوئی وفادار نہیں

زویا اپنے دل کے لہو ہونے کا ذکر بھی کسی سے نہیں کر سکتی تھی۔ صبر سے سہہ رہی تھی دلدار کے دیے زخموں کو۔

مجھ کو اس جہان میں صرف تجھی سے پیار ہے
یا میرا امتحان لے، یا میرا اعتبار کر

دل تھا کے اب بھی دلاور کے تصور میں اسی سے مخاطب تھا۔
ذوئی میں تو شام تک واپس چلا جاؤں گا بہت بور ہوا ہوں میں رات بھر۔'' بوبی نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔
''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔''
''تمہیں کوئی پرابلم تو نہیں ہوگی نا۔'' بوبی اس کو بغور دیکھ رہا تھا۔
''ارے نہیں تم بے فکر ہو کے جاؤ، یہاں ہمارے بیسوں مزارعے ہیں کوئی کام ہوا تو ان سے بھی کہہ سکتی ہوں۔''
''او کے گڈ۔'' وہ مطمئن ہوگیا۔
''گاؤں تو میری تصور کے برعکس ہے یہاں تو پکی سڑکیں ہیں بجلی ہے گیس ہے صرف چند گھروں میں ہے حویلی سمیت۔
زویا نے چلتی گاڑی سے باہر کھیتوں میں کام کرتے مزدوروں کو دیکھتے ہوئے کہا تو بوبی مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''اگر گاؤں بھی شہر جیسا ہوگیا تو ہم شہر والوں کا گزارہ کیسے ہوگا؟ کھیتی باڑی کون کرے گا اگر سب گاؤں چھوڑ چھوڑ کے شہروں میں جا بسے؟ اور بڑے زمینداروں، وڈیروں کی خدمت اور چاکری کون کرے گا؟ اسی اسی خیال سے تو یہ لوگ یہاں، دیہات میں ترقی نہیں ہونے دیتے۔''
''ادا قاسم اسکول کے پاس گاڑی روک دینا۔'' بوبی نے ڈرائیور سے کہا۔
''ٹھیک ہے صاحب!'' ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔
''بوبی تم فوٹو گرافس لینا میں اسکول کے ٹیچرز اور بچوں سے بات کروں گی۔''
زویا نے کیمرہ اسے دیتے ہوئے ہدایت کی۔
''او کے ڈیئر۔'' وہ کیمرہ لے کر مسکراتا ہوا گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ زویا نے بھی اس کی پیروی کی۔ اسکول کے بچے انہیں حیران و پریشان نظروں سے دیکھنے لگے۔
دو کمروں کا ٹوٹا پھوٹا اسکول تھا۔ جس کے ایک کمرے میں وڈیرے کے مویشی بندھے ہوئے تھے اور دوسرے کمرے میں گاؤں کے بچے پڑھ رہے تھے۔ کمرے کی حالت بھی خستہ تھی۔ بوبی کیمرے میں مووی بنانے لگا ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں بنا دروازے کا کمرہ جس کی چھت لکڑی اور سرکنڈوں، گھاس پھوس کی بنی ہوئی تھی۔ اور ایک طرف سے چھت کا گارڈر نیچے جھکا ہوا تھا۔ چند کرسیاں سلامت تھیں اور باقی ٹوٹی ہوئی الٹی پلٹی پڑی تھیں۔
''او مائی گاڈ! یہ اسکول ہے یا موت کا کنواں؟ خدانخواستہ اگر چھت گر گئی تو بچے اس کے نیچے دب کے مارے جائیں گے۔''
زویا نے بہت افسوس سے کہا اسکول کا جائزہ لینے کے بعد اسے گاؤں کے بچوں کی حالت پر رحم

آنے لگا۔
''یہ زمیندار اور وڈیرے ووٹ لینے کے لیے گاؤں کا رُخ تو کرتے ہیں اور الیکشن جیتنے کے بعد شہروں میں محل کھڑے کر کے ان میں بادشاہ بن کے رہتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے، سوچتے کہ ہمارے گاؤں، دیہات کی کیا حالت ہے ان کی بہتری کے لیے ترقی کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ بے چارے Poor People''۔
بوبی نے پورے اسکول کی فلم بنانے کے بعد زویا کو دیکھتے ہوئے تاسف زدہ لہجے میں کہا۔
''سنو، بچے، یہ گائے، بھینس کس کی ہیں......؟''
زویا نے کلاس کے ایک بچے سے پوچھا۔
وڈیرا سائیں کی ہیں۔'' بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔
''اُف!'' زویا نے بے کل ہو کر کہا۔
''بیٹا آپ کا نام کیا ہے؟''
''ارشد۔'' وہ بچہ بولا۔
'تو ارشد پڑھ لکھ کر کیا بننا چاہتا ہے......؟''
''اچھا انسان۔''
''وری گڈ، شاباش کس نے کہا آپ کو آپ کے اچھا انسان بننا ہے؟'' زویا نے ارشد کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''ماسٹر جی نے، اور مجھے بھی پتا ہے کہ میں کچھ اور تو بن نہیں سکتا اس پنڈ میں رہ کے، پر اچھا انسان تو بن سکتا ہوں ناں۔'' ارشد نے اداس مگر مثبت انداز میں کہا۔
''ہاں بالکل آپ اچھے انسان بنیں گے اور آپ جو بننا چاہتے ہو وہ بھی بنو گے۔'' زویا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''میں ساتویں جماعت میں ہوں باجی اور یہ اسکول آٹھویں تک ہے۔ آگے کون پڑھائے گا؟ زمیندار کے بچے تو شہر میں پڑھتے ہیں پر ہم غریب بچے۔ پنڈ کے اسکول میں بھی ٹھیک سے نہیں پڑھ سکتے۔ یہاں چوہدریوں کے جانور رہتے ہیں۔
ارشد نے افسردگی سے کہا اسی وقت اسکول کی چھٹی کی گھنٹی بج گئی۔ ارشد خدا حافظ کہتا اپنا بستہ سنبھال کر دوسرے بچوں کے ساتھ باہر بھاگ گیا۔
''ماسٹر جی، آپ اکیلے پڑھاتے ہیں یہاں......؟''
زویا نے اسکول کے ماسٹر رفیق کے پاس کرسی کھسکا کے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ بوبی اب تسلی سے اسکول کی ویڈیو دوبارہ بنا رہا تھا۔
''جی مس جی، میرے علاوہ دو اور ماسٹر ہیں یہاں پر وہ صرف حاضری کے رجسٹر میں اپنی حاضری لگوانے آتے ہیں اور یا پھر مہینے کی پانچ یا چھ تاریخ تک تنخواہ لینے آ جاتے ہیں اور شہر میں اپنی دکانداری کرتے ہیں۔''
ماسٹر جی نے سنجیدگی سے انکشاف کیا۔
''یہ تو سراسر بے ایمانی ہے ماسٹر جی، آپ نے اعلیٰ حکام سے ان کی شکایت نہیں کی......؟''
''شکایت کی تھی۔'' وہ مجروع انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔
''انہیں تو کچھ نہیں کہا کسی نے الٹا مجھے ہی نوٹس بھجوا دیا گیا کہ خاموشی سے اپنی نوکری کرو ورنہ گھر بھیج دیے جاؤ گے یا پھر سرکار کو دھوکا دینے کے الزام میں اندر کر دیے جاؤ گے۔ سو میں بھی چپ ہو گیا۔ شکایت کر کے اپنا ہی نقصان کرنا تھا۔''
''اور یہ جو مویشی یہاں اسکول میں بندھے ہیں؟''
''مس جی، ہم بھی تو مویشی ہی ہیں ناں، وڈیرے اور زمیندار اپنے کمیوں کو، مزارعوں کو بھی

ڈھور ڈنگر ہی تو سمجھتے ہیں جب ہی تو انہوں نے اپنے ڈھور ڈنگر اسکول میں باندھ دیے۔ ان کی نظر میں جانور اور انسان میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔''
ماسٹر جی نے سنجیدگی سے کہا۔
''اللہ اکبر، اللہ اکبر۔'' اذان ظہر کی صدا بلند ہوئی تو زویا نے سر پہ دوپٹہ اوڑھ لیا اور خاموشی سے اذان سننے لگی۔
''اچھا ماسٹر جی، آپ کو تنخواہ کتنی ملتی ہے۔''
اذان ختم ہوتے ہی زویا نے سوال کیا۔
''جتنی پہ دستخط کرواتے ہیں اس سے آدھی دیتے ہیں اور آدھی خود کھا جاتے ہیں۔ اسکول پہ ایک پیسہ نہیں لگاتے بچے گرمی سردی میں برآمدے میں یا صحن میں بیٹھتے ہیں۔ پر مس جی آپ میرا نام لے کر کسی کو کچھ مت بتا دینا ورنہ یہ زمیندار لوگ میری بوٹی بوٹی کر دیں گے۔'' ماسٹر جی نے دکھ سے بتایا۔
''آپ بے فکر رہیں آپ کا نام کہیں نہیں آئے گا۔'' زویا نے یقین دلایا۔
زوئی میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں یہ کیمرہ سنبھالو۔''
بوبی نے اس کے پاس آ کر کہا اور کیمرہ زویا کو دے دیا تو اس نے اپنے شولڈر بیگ میں رکھ لیا۔
''او کے، زویا نے اسے دیکھا وہ چلا گیا مسجد قریب ہی تھی۔
''ماسٹر جی، آپ نماز نہیں پڑھیں گے؟''
''ہم کیا نماز پڑھیں گے زیا بی بی، نماز تو کربلا والے پڑھ گئے۔ ہم تو بس کبھی کبھار عادتاً مولوی صاحب کے پیچھے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو جاتے ہیں عادت پوری کرتے ہیں۔ عبادت تھوڑی کرتے ہیں عادت اور عبادت میں بہت فرق ہوتا ہے۔
مس جی نماز میں مولوی صاحب کے پیچھے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہوتے ہیں اور ویسے وڈیروں، زمینداروں کے آگے ہاتھ جوڑے سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں۔ ہمیں یہ سمجھ اور احساس ہی نہیں ہے کے ہاتھ کس کے سامنے جوڑنے چاہیں۔ سر کس کے آگے جھکانا ضروری ہے دل کس کو بڑا اور حاکم مانے؟ ہم تو خوف اور ضرورت کے مارے لوگ ہیں وڈیروں سے ڈرنے والے ...... اور وہ جو سب کا سائیں ہے سب سے بڑا ہے اس کے سامنے کھڑے ہو کے بھی سوچوں اور خیالوں میں وڈیرا سائیں سے خوف کھا رہے ہوتے ہیں۔''
ماسٹر جی نے بہت عقل کی اور حقیقت پر مبنی باتیں کہیں، زویا متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکی۔
''تو ماسٹر جی، آپ کے نزدیک اللہ کے سامنے کیوں جھکنا چاہیے؟ عبادت کیوں کرنی چاہیے......؟''
''کیونکہ اللہ عبادت کے لائق ہے جنت کے لالچ یا جہنم کے خوف سے عبادت کرنا تو عبادت نہیں ہے وہ اس پوری کائنات کا خالق و مالک ہے، سب سے بڑا ہے وہ تو جو سب سے بڑا ہو۔ حکم تو اسی کا ماننا چاہیے ناں۔''
ماسٹر جی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''بالکل ٹھیک کہا آپ نے ماسٹر جی، مجھے بہت اچھا لگا آپ سے باتیں کر کے۔'' زویا نے ایمانداری سے کہا۔
''مہربانی اب میں اجازت چاہوں گا مس جی، وڈیرے کے کسی آدمی نے مجھے آپ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا...... اپنا خیال رکھیے گا مس جی۔''
ماسٹر جی نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی کھڑی ہو گئی۔
''شکریہ ماسٹر جی آپ کھانا کھانے نہیں جائیں گے۔''

’’پہلے ان ڈھور ڈنگروں کو پانی پلا دوں پھر گھر ہی جانا ہے۔‘‘
گائے بھینس بول رہی تھیں، شاید یہ ان کے بھی کھانے پینے کا وقت تھا۔ ماسٹر جی نے کمرے میں جا کر پانی کی بالٹی اٹھاتے ہوئے کہا تو زویا نے حیرانگی اور بے بسی سے انہیں دیکھا۔
’’ماسٹر جی، جانوروں کو آپ پانی پلائیں گے؟‘‘
’’جی مِس جی، یہ میری ذمہ داری ہے، میں ماسٹر ہوں نا اس اسکول کا۔‘‘ وہ تلخی اور بے بسی سے بولے۔
’’یہ تو بہت زیادتی ہے ماسٹر جی، آپ کو اس کام کی الگ تنخواہ بھی ملتی ہے کیا۔‘‘
’’نہیں مِس جی، ہم تو نوکر ہیں، نوکر کی تے نخرہ کی۔‘‘ غلام ہیں اور غلام صرف غلامی کرتے ہیں، چاکری کرتے ہیں خدمت کا معاوضہ طلب نہیں کرتے۔ اپنا حق نہیں مانگتے۔‘‘
’’اُف! کیسے لوگ ہیں یہ ظالم، جابر اور بے حس۔‘‘
زویا دکھ اور غصے سے بڑبڑاتی اسکول کے احاطے سے باہر نکلی تو بوبی بھی نماز پڑھ کر آ گیا تھا۔
’’بوبی، بھوک لگی ہے میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ چلو کسی چھپر ہوٹل میں بیٹھ کے لنچ کرتے ہیں۔‘‘
’’چلو مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔‘‘ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے اور ڈرائیور کے ساتھ ایک تندور والی کے پاس آ گئے۔ اور تینوں نے اپنے لیے کھانا منگوایا۔ مٹر قیمہ، ماش کی دال، لچھے دار پیاز اور پودینے کی چٹنی والا رائتہ، تندوری روٹیوں کی خوشبو سے ہی ان تینوں کی بھوک چمک اٹھی۔
’’توساں شہروں آئے ہو؟‘‘ تندور والی عورت نے ان تینوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’جی اماں، ہماری زمینیں ہیں یہاں احتشام الحق ہمارے والد صاحب ہیں۔‘‘ بوبی نے اس چالیس سالہ عورت کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ تو اس نے سر ہلایا۔
’’اماں کہہ دیا اسے کہیں برا ہی منا جائے۔‘‘ زویا ہنسی۔
’’بے چاری تندور کے پاس بیٹھ کر ایسی کالی بھدی ہو گئی ہے۔ ورنہ دو چار سال پہلے تو یہ اچھی خاصی صاف رنگت والی تھی۔ میں بڑے صاحب کے ساتھ کئی بار آیا ہوں گاؤں۔ دیکھا ہے اسے پہلے بھی کئی دفعہ۔‘‘ ڈرائیور قاسم نے بتایا۔
’’ہوں، کیا زندگی ہے ان لوگوں کی بھی مشقت اور ذلت سے بھرپور۔‘‘
زویا نے تندور والی کو دیکھتے ہوئے کہا وہ جامنی رنگ کی قمیض اور مالٹے رنگ کی شلوار پہلے، سر پہ گلابی دوپٹہ لپیٹے کسی قسم کے تاثر سے بے نیاز چہرہ لیے تندور میں دھڑا دھڑ روٹیاں لگا رہی تھی۔
’’کھانا ٹھنڈا تھیندا پیا اے بسم اللہ کرو۔‘‘
تندور والی نے انہیں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے دیکھا تو تیزی سے کہا۔
’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔‘‘ زویا نے باآواز بلند بسم اللہ پڑھی۔ اور تینوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ اور کھانے کی دل کھول کے تعریف کی۔‘‘
’’کھانا بہت مزیدار تھا مہربانی۔‘‘ زویا نے تندور والی کو دیکھتے ہوئے دل سے تعریف کی تو وہ خوش ہو گئی۔
’’سو روپے کا بل بنا تھا۔ بوبی نے سو روپے اضافی دے دیے۔ کھانے کی لذت کی وجہ سے تندور والی خوش ہو رہی تھی۔
’’مہربانی، اللہ سائیں خوش رکھے وِل (پھر) ضرور آونا۔‘‘

تندور والی نے ہاتھ جوڑ کر ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دوبارہ وہاں آنے کی درخواست بھی کی۔

''انشاء اللہ ضرور آئیں گے۔'' زویا نے مسکراتی ہوئی بولی۔ اسی وقت اس کے موبائل پر دلاور خان کی کال آ گئی۔

''ہیلو۔'' زویا نے نا چاہتے ہوئے بھی کال اٹینڈ کر لی۔

''کھانا تیار ہے فوراً حویلی پہنچو، بے جی انتظار کر رہی ہیں۔'' دلاور خان کے حکمیہ انداز میں کہا تو وہ تپ گئی۔''

''ہم نے بہت مزیدار کھانا کھایا ہے ابھی آپ کے گھر کا کھانا نصیب ہوا تو انشا اللہ رات کو کھا لیں گے۔ ابھی وہ کھانا آپ لوگ کھا لیں۔ خدا حافظ۔''

زویا نے سپاٹ لہجے میں جواب دے کر کال ڈس کنکٹ کر دی۔

''کیا ہوا......؟'' جنت بی بی نے دلاور خان کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا تو اس نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

''وہ لوگ کھانا کھا چکے ہیں۔ آپ بھی کھا لیں۔''

''ہاہ۔'' جنت بی بی نے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ بے جی نے دلاور خان کو غصیلی نظروں سے دیکھا۔

''دلاورے، یہ تیری کرنی ہے، تو نے اس چھوکری (لڑکی) پہ ہاتھ اٹھایا تھا نا۔ تو وہ کیوں تیرے گھر کی روٹی کھائے گی اب؟

تیرے ہاتھ کی مار کھانے کے بعد وہ کس دل سے وہ تیرے گھر کا پانی بھا جی کھائے گی؟''

''مائی فٹ! بھاڑ میں جائے وہ۔'' دلاور خان غصے سے کہتا باہر نکل گیا۔ بے جی اور جنت بی بی سر پکڑ کے رہ گئیں۔

☆......☆......☆

زویا اور بوبی اپنے ڈرائیور کے ساتھ گاؤں میں مختلف جگہوں پہ رکتے ہوئے لوگوں سے ملتے باتیں کرتے مولوی رحمت اللہ کے گھر پہنچ گئے۔ جس طرح گاؤں کے سب لوگوں نے انہیں خوش دلی سے 'جی آیا نوں' کہا تھا چائے لسی پوچھی اور پلائی تھی۔ اسی طرح مولوی رحمت اللہ اور ان کی گھر والی بھی انہیں دیکھ کر خوش ہو گئے۔ احتشام الحق کے والد ضیاء الحق اور والدہ سکینہ بی بی گاؤں کے لوگوں کے لیے مہربان ہستیاں تھے جو ان کے دکھ، درد میں ان کے کام آتے۔ روپے پیسے سے ان کی مدد کرتے تھے۔ اسی لیے انہیں بھی سب عزت اور اپنائیت دے رہے تھے۔

''بسم اللہ، جی آیا نوں۔ ہمارے تو بھاگ جاگ گئے ہیں وڈے سائیں کے پوتا، پوتی ساڈے گھر آئے ہیں۔ تشریف رکھو۔''

مولوی رحمت اللہ نے مسکراتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہا ان کی بیوی اور بیٹا بوکھلا گئے تھے۔ پلنگ پر بچھی چادر درست کرتے ہاتھوں سے جھاڑے، موڑے اٹھا کر لاتے انہیں حیرانگی سے دیکھ رہے تھے۔

''شکریہ۔'' وہ دونوں پلنگ پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور باہر گاڑی میں بیٹھا ستا رہا تھا۔

''ہاجرہ، جلدی سے چائے لسی کا بندوبست کر۔'' مولوی رحمت اللہ نے بیوی کو حکم دیا۔

''نہیں مولوی صاحب، ہم چائے لسی پی کر آئے ہیں، بس آپ سے ملنے کچھ باتیں کرنے آئیں ہیں۔ چاچی آپ ہمارے پاس آ کر بیٹھیں۔ زویا نے نے جلدی سے کہا تو ہاجرہ نے اجازت طلب نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگے۔

''تو جا کے کھانے کا بندوست کر، مہماناں کوں

روٹی بھاجی کھلا کے رخصت کرنا ہے۔عظمت اللہ پتر، ایک ککڑ حلال کر کے ماں کو دے تاکہ اے پکا لے، شاباش جلدی کر۔''

مولوی رحمت اللہ نے بیوی اور بیٹے دونوں کو ہدایت جاری کیں۔

اور وہ دونوں فوراً عمل کے لیے سرگرم ہوگئے۔عظمت اللہ اٹھارہ انیس سال کا گبرو جوان تھا۔وہ مرغیوں کے ڈربے میں سے ایک مرغی نکال کر ذبح کرنے کے لیے گیا۔ہاجرہ بھی رسوئی میں جا کے کھانے کی تیاری میں جت گئی۔

''مولوی صاحب! کھانے کا تکلف نہ کریں پلیز۔''

زویا کو شرمندگی سی ہو رہی تھی کے ان کی وجہ سے ان کو اتنا خرچہ کرنا پڑ رہا ہے۔بوبی الگ خجل ہو رہا تھا۔

''ہاں مولوی صاحب! ہم تو آپ سے ملنے آئے تھے۔بوبی نے کہا۔

''ملاقات تو ہو رہی ہے نا سائیں۔روٹی پانی تو مہمان کا حق ہے، حصہ ہے مہمان تو رحمت ہوتا ہے، اور مولوی رحمت اللہ کے گھر سائیں نے رحمت بھیجی ہے تو۔مجھے اپنی خوشی کا اظہار تو کرنا چاہیے نا......اور کیندے ہن کے جس گھر سے مہمان رج کھائے پیے بغیر چلا جائے نا اور گھر نہیں ہے قبرستان ہے قبرستان۔تے مولوی رحمت اللہ ہالے (ابھی) جیوندا ہے۔''

مولوی رحمت اللہ نے مسکراتے ہوئے بہت نرم اور ایمان افروز لہجے میں کہا۔

''اللہ آپ کو سدا سلامت رکھے مولوی صاحب! اپنے بچوں کی خوشیاں دکھائے۔'' بوبی نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھتے ہوئے دعا کی۔

''آمین! اللہ سائیں تُو ساں کو وی ڈھیروں خوشیاں دے۔''

صحت، سکھ دے، لمبی حیاتی کرے دو واں (دونوں) دی۔''

''شکریہ مولوی صاحب! ان کی جوابی دعاؤں پر وہ تشکر سے بولا۔

☆......☆......☆

مولوی رحمت اللہ سانولے رنگ کے اونچے لمبے آدمی تھے۔عمر پچاس کے قریب تھی۔درمیانی داڑھی جو سرخ اور سفید بالوں سے رنگی تھی۔مہندی لگا کر بال سفید بالوں کو سرخ رنگ دیا گیا تھا۔

مولوی رحمت اللہ کا گھر بھی پکا بنا ہوا تھا۔تین مرلے کے اس گھر میں دو کمرے، ایک غسل خانہ، چھوٹا سا باورچی خانہ اور صحن تھا۔صحن میں تین پلنگ بچھے تھے سامنے رسوئی یعنی باورچی خانہ تھا۔اس کے ساتھ صحن کی جگہ۔جو دیوار کے ساتھ خالی تھی۔مرغیوں کا ڈربہ سا رکھا تھا۔جس میں چھ سات مرغیاں تھیں۔جو مسلسل کٹ کٹ کٹاک کر رہی تھیں۔مولوی صاحب نے اٹھ کر صحن میں لگا بلب جلا دیا۔جس کی نارنجی روشنی صحن میں پھیل گئی۔

رسوئی کا دروازہ نہیں تھا اس پر میلا سا پردہ لٹک رہا تھا۔اندر حاجرہ کھانا پکانے میں لگ گئی تھی۔برتنوں کے کھٹکھنے بجنے کی آواز باہر صحن تک آ رہی تھی۔مولوی صاحب کمرے میں سے پیڈسٹل فین اٹھا لائے اور صحن میں کھڑا کر کے چلا دیا۔

''بہناں، ہم نے تو انہیں مشکل میں ڈال دیا۔''

بوبی نے دھیمی آواز میں زویا سے کہا تو جواباً اس نے صرف ''ہوں'' کہا۔ہاجرہ بیالیس سال کی ایک صحت مند عورت تھی۔سانولی رنگت جو کبھی سفید ہوا کرتی تھی۔نین نقش بتا رہے تھے کہ وہ کتنی پُرکشش ہوگی جوانی میں ......صاف ستھرا لباس پہنے سر پہ دوپٹہ اوڑھے وہ ان کے لیے ٹینگ بنا کر لے آئی۔

''شکریہ۔'' دونوں نے ایک ایک گلاس اٹھالیا۔

''ٹینگ یہاں بھی پہنچ گیا۔ بوبی نے شربت کا ایک گھونٹ بھرا اور ذائقہ محسوس کر کے بولا ہاجرہ مسکراتی ہوئی واپس رسوئی میں چلی گئی۔

''ای تھاں وی ہن ہر شے ملدی اے۔''

''یہاں بھی اب ہر چیز ملتی ہے مولوی رحمت اللہ مسکرا کر کہا۔

''نہیں ملدی تے عزت نہیں ملدی، صحت نہیں ملدی، تحفظ نہیں ملدا۔''

''ٹھیک کہا آپ نے مولوی صاحب، اب تو پورے ملک میں بدامنی، انتشار اور عدم تحفظ کی فضا قائم ہو چکی ہے۔ کسی کی جان، آن محفوظ نہیں ہے اللہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے ہمارے پیارے پاکستان کو؟''

زویا نے سنجیدہ اور دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''اے نظر نہیں لگی میری دھی۔ دین سے دوری کی سزا ملی ہے۔

مولوی رحمت اللہ نے اسے دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''اللہ سائیں! نے تو اپنی کتاب قرآن پاک میں صاف صاف لکھا ہے کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے پوری انسانیت کا قتل..... مسلمانوں کا نہیں انسانوں کا۔ کیونکہ اسلام دین انسانیت ہے پوری دنیا کے انسانوں کے لیے ہے اور انسانیت کے قتل کا حکم یا اجازت اسلام تو کیا..... دنیا کا کوئی مذہب نہیں دیتا مذہب تو انسان کو محبت کا سبق دیتا ہے۔ انسان کو صبر، تحمل، برداشت اور بھائی چارہ سکھاتا ہے۔ اسلام سے اچھا دین کوئی نہیں ہے ہم اسلام کے ماننے والے تو ہیں پر بدقسمتی سے اسلام پہ عمل کرنے والے نہیں ہیں۔ اللہ سائیں کو تو ایک مانتے ہیں پر اللہ سائیں کی ایک نہیں مانتے۔ روز خبر آتی ہے کہ فلاں شہر میں بم دھماکہ ہوا، ٹارگٹ کلنگ ہوئی، فائرنگ ہوئی گولیاں چلیں اور مرنے والے سب مسلمان تھے اور مارنے والے کافر تھے۔ سمجھ نہیں آندی۔ جی ڑا ملک مسلماناں واسطے بنایا سی او تھے کافر کدوں آ گئے۔ غیر مسلمان کو بھی امن اور عزت سے رکھنے والے ملک میں یہ تعصب کس نے پھیلا دیا؟ کافر اور مسلمان کی تفریق کیسے ہو؟ کیسے پتا ہے کہ کون کافر ہے اور کون سچا مسلمان؟ یہ جو لوگوں کو قتل کر کے..... خوش ہیں مسلمان تو نہیں ہیں۔ رب جانے کس مذہب کے ماننے والے ہیں۔''

'' مولوی صاحب! یہ اپنے ہی لوگ کر رہے ہیں شاید دشمن کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں یا آپ کی بات درست ہے کہ اپنے دین سے دور ہو گئے ہیں......

''اللہ سائیں! نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ۔

''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو۔''

اللہ سائیں! ہمیں دین کو سمجھ اور عمل کرنے کی توفیق بخشے۔''

''آمین۔'' زویا اور بوبی نے دل سے یک زبان ہو کے کہا۔

'' مولوی صاحب! میں نے سنا ہے یہاں کاروکاری یا کالا کالی کی قبیح رسم میں رائج ہے جس میں معصوم لڑکی اور لڑکے کو موت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔'' بوبی نے کہا۔

''ہاں پتر جی! جب دین سے دوری ہو جاتی ہے تو نت نئے رسم رواج نمو پانے لگتے ہیں۔ یہ بھی انسان کے اپنے مفاد کے چکر ہیں سب۔ زور آور کا ذور سب پہ چلتا ہے اپنے گناہ کو چھپانے کے لیے بے گناہ اور معصوم لوگوں کو اس نامراد رسم کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ معصوم لڑکیوں کی عزت وڈیرے، زمیندار اور ان کے زرخرید ٹھولوٹتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

افسانہ

دانیہ آفرین

ہے بہار منتظر

جس طرح والدین اولاد کی تکلیف پر تڑپتے ہیں۔ اُسی طرح اولاد بھی والدین کا درد برداشت نہیں کر سکتی۔ بیٹیاں تو ویسے بھی نازک دل کی ہوتی ہیں۔ زندگی پر چھائے کالے بادل ان کے اندر حبس کا سا ماحول پیدا کر دیتے ہیں اور پھر اشکوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے جو......

اکثر صبر کی راہوں کے مسافر
بلند حوصلے والے
تھکنے لگتے ہیں
وقت کے تیز بھاؤ میں بہہ کر
سوچوں کی گتھیوں میں الجھ کر
بے بس ذہن لیے
اشکوں کے مخلص ساتھی بن کر
حساسیت میں پس جاتے ہیں

''بعض دفعہ ہم ایسے حالات سے گزرتے ہیں کہ زندگی کو بھی اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے، ہم مجبور ہوتے ہیں یا کمزور یہ جاننے سے قاصر ہوتے ہیں مگر بے سکون ضرور ہوتے ہیں۔''

جائشہ نے ایک گہری سانس خارج کر کے اپنا قلم روکا اور ڈائری کو بند کر دیا۔

ڈائری کے بے آواز صفحے ہمارا غم تو کم نہیں کر سکتے مگر ہمارے ساتھ غم گسار ضرور بن سکتے ہیں اور قلم اور صفحے انسانوں کی طرح بے حس نہیں ہوتے جو انہیں دوست سمجھ کر اپنی روداد سناتا ہے اسے وہ تاحیات اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔

جائشہ کی بھی غم گسار اس کی ڈائری تھی۔

☆......☆......☆

''مجھے معاف کر دو مریم۔ اس دن نجانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔'' شرمندگی سے اس نے کہا۔

جائشہ تم اس طرح سب کو کھو دو گی، آخر مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟'' مریم نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھا۔

''کچھ پرابلمز ہیں میری۔'' زمین کو تکتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''تمہاری پرابلمز نجانے کتنوں پر اثر انداز ہو رہی ہے۔''

یہ کہہ کر مریم آگے بڑھی۔

جائشہ مریم کو دور تک جاتے ہوتے تکتی رہی، مریم نے اس کی پریشانی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جائشہ بھی سوچوں کو جھٹک کر تھکے تھکے قدموں سے کلاس روم کی طرف بڑھی۔

☆.......☆.......☆

نیو ایئر کی رات تھی، فائر ورکس کی آوازیں گونج رہی تھیں، آسمان خوبصورت رنگوں میں نہایا ہوا تھا لوگ ایک دوسرے کو نئے سال کی آمد کی مبارک باد دے رہے تھے مگر وہ تنہا کمرے میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

جائشہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ شعور کے دور سے گزرتے ہوئے اس کے دل میں یہ بات شدت سے شور مچاتی تھی کہ کاش کوئی ہوتا جو اس کی تنہائی کا بانٹتا اس کے ماں باپ کا سہارا بنتا۔ اس کی آنکھ اپنی ماں کی آہوں اور کراہوں سے کھلتی تھی۔

باپ کا درد سے نکلنا اسے بے سکون کر دیتا تھا۔ رات کے 3 بجے وہ اپنی ماں کو ہسپتال نہیں لے کر جا سکتی تھی۔ اپنے ابو کی جگہ کام پر نہیں جا سکتی تھی، ماں کی دوائیں لینے شہر سے دور نہیں جا سکتی تھی، وہ لڑکا نہیں بن سکتی تھی، بس اپنی بے بسی پر رو سکتی تھی۔

جائشہ نے اپنے آنسو کو صاف کیا اور ایک نظر صحن میں لیٹے اپنے بیمار ماں باپ پر ڈالی اور پھر

آنکھیں موند کر لیٹ گی۔
جس طرح والدین اولاد کی تکلیف پر تڑپتے ہیں۔اُسی طرح اولاد بھی والدین کا درد برداشت نہیں کر سکتی۔
بیٹیاں تو ویسے بھی نازک دل کی ہوتی ہیں زندگی پر چھائے کالے بادل ان کے اندر حبس کا سا ماحول پیدا کر دیتے ہیں اور پھر اشکوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے جو ارد گرد تو ہلکا سا ارتعاش پیدا کرتی ہے مگر اشک بہانے والے کے اندر طوفان برپا کر دیتی ہے۔
اشک ہی تو ہوتے ہیں جن پر نازک معصوم کلیوں کا اختیار ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

''جائشہ جائشہ!!''
امی کی آواز پر اس نے چونک کر کتاب بند کی اور کمرے سے باہر نکلنے لگی۔اتنے میں امی وہیں چلی آئی۔
''جائشہ چائے بنا دو شاذ آیا ہے تمہارے ابو کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔'' امی نے ہانپتے ہوئے کہا دمہ کی وجہ سے چند قدم چلنے سے ہی ان کا سانس پھولنے لگتا تھا۔
''جی امی میں لاتی ہوں چائے۔'' جائشہ نے پُرسوچ انداز میں کہا اور کچن میں آ گئی۔
چائے اور بسکٹ ٹرے میں رکھ کر سر پر اچھی طرح دوپٹہ سیٹ کر کے وہ صحن میں آ گئی چائے کے کپ شاذ اور ابو کو دے کر وہ بھی وہیں کونے میں بیٹھ گئی۔
شاذ، محمد احمد (جائشہ کے والد) کا بھتیجا اور اس کا منگیتر تھا وہ آج چاچا سے کسی کام کے سلسلے میں ملنا آیا تھا۔
''اچھا چاچا اب میں چلتا ہوں۔'' چائے کا کپ ٹرے میں رکھ کر احمد صاحب سے اللہ حافظ کر کے وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
''سنیے یہ سارہ کو دے دیجیے گا۔'' جائشہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی اور ہاتھ میں پکڑا شاپر اس کی طرف بڑھا دیا۔
''وہ مجھے آپ سے بات کرنی ہے؟'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔
''خیریت؟'' شاذ چونکا۔
جی خیریت ہے مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔''
جائشہ نے نظریں جھکائے بغیر کی کہا۔
''ٹھیک ہے میں تمہیں رات میں کال کرلوں گا۔'' شاذ نے اس پر ایک سنجیدہ نگاہ ڈالی اور باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

''بولو کیا بات ہے؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''شاذ وہ۔'' کہتے کہتے وہ رک گئی۔
جائشہ کیا بات ہے بولو بھی۔'' شاذ نے جھنجھلا کر کہا۔
اس نے ہمت مجتمع کی اور تیز دھڑکتے دل کے ساتھ لبوں کو جنبش دی۔
''میں چاہتی ہوں ہمارا نکاح ہو جائے۔'' جائشہ نے ایک لمبی سانس لبوں سے خارج کی اپنی انا کو روندنا کسی بھی لڑکی کے لیے آسان نہیں ہوتا۔
''جب شادی ہوگی تو ظاہر ہے نکاح بھی ہونا ہی ہے۔'' شاذ نے لاپرواہی سے کہا۔
''میں چاہتی ہوں ہمارا نکاح پہلے ہو جائے۔'' جائشہ نے 'پہلے' پر زور دیتے ہوئے کہا۔
''کیوں۔'' شاذ اس کے اچانک نکاح کے

مطالبے پر ٹھٹکا تھا۔
''کیوں؟'' جائشہ نے اس کا دہرایا۔
شاذ مجھے اور میرے والدین کو سہارے کی ضرورت ہے جو آپ ہی دے سکتے ہیں۔'' آنکھوں سے نمکین پانی اس کے رخساروں پر ٹپ ٹپ گر رہا تھا، کتنا دشوار تھا اس کے لیے یہ سب کہنا۔
''کیسا سہارا؟'' شاذ نے ناسمجھی سے پوچھا۔
''امی ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی مجھ سے اکیلے نہیں سنبھل رہا سب کچھ مجھے آپ کے ساتھ کی ضرورت ہے۔'' جائشہ نے اپنی بات سمجھائی۔
''میں ہوں تو صحیح۔ جو بھی کام ہو بول دیا کرو اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے یہ سب تو بغیر نکاح کے بھی ممکن ہے۔ شاذ نے اپنے طور حل دیا۔
''شاذ، بغیر نکاح کے بہت سے کام کر سکتے ہیں آپ مگر سب کچھ نہیں، مجھے کالج سے اکثر اکیلے آنا پڑتا ہے ابو اپنے جوڑوں کے درد کی وجہ سے مجھے لینے نہیں آسکتے، اور پھر بغیر نکاح کے آپ وقت بے وقت میرے گھر نہیں آسکتے بھلے ہی آپ ابو کے بھتیجے ہوں میرے منگیتر ہوں مگر ایک حدود کی دیوار ہمیشہ قائم رہے گی۔
اس گھر کو ایک مرد کا سہارا چاہیے جو امی بابا کا حقیقی بیٹا بنے۔'' آنکھوں میں نمی لیے اس نے کہا۔
''جائشہ تم جانتی ہو میری دو بہنیں غیرہ شادی شدہ ہیں۔ میں ابھی اپنی شادی نہیں کر سکتا۔''
''شادی نہیں بس نکاح۔'' جائشہ نے اس کی بات کاٹی۔
''نکاح بھی نہیں کر سکتا۔'' شاذ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ شاذ کے انکار پر جائشہ کے جسم کی لرزش اور بڑھ گئی تھی۔ سن دماغ کے ساتھ وہ دیوار کا سہارا لے کر نیچے بیٹھ گئی۔
''جائشہ کوئی بھی کام ہو بتا دینا میں آجاؤں گا۔'' شاذ اسے تسلیاں دے رہا تھا مگر وہ سن کب رہی تھی موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ گھٹنوں میں سر رکھے وہ سسک رہی تھی اپنی انا وخودی کی پامالی پر، مان ٹوٹنے پر، اپنی بے بسی پر۔''

☆......☆......☆

چڑیوں کی چہچہاہٹ چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ پرندے آسمان پر اڑتے بے فکر لگ رہے تھے۔ ان کو نا رسم رواج کی پرواتھی نہ معاشرے کا ڈر تھا۔ ان کی اپنی ہی دنیا ہے کو ہم انسانوں کی دنیا سے بہت مختلف ہے۔
ہم نے اپنے لیے بہت سے ایسے اصول بنا رکھے ہیں جن سے کچھ حاصل نہیں۔ انسان کو دوسرے انسان کو نفع پہنچانے کے لیے بنایا گیا ہے مگر ہم قدرت کے اصولوں پر کم اپنے خود ساختہ اصولوں پر عمل پیرا ہیں۔''
''جائشہ، جائشہ۔''
اپنے عقب سے آتی امی کی آواز پر وہ چونکی تھی۔
''بیٹا کب سے یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟'' امی بمشکل سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر اس کے پاس آگئیں۔''
''امی آپ اوپر کیوں آگئی میں بس نیچے آنے ہی والی تھی۔'' اس نے شرمندگی سے کہا اور کرسی ان کے آگے کر دی۔
''بیٹا کب سے تمہیں آوازیں دے رہی تھی مگر پتا نہیں تم کن سوچوں میں گم تھیں، کوئی پریشانی ہے کیا؟'' امی نے اس کے چہرے کو کھوجتے

ہوئے پوچھا۔
"ن...... نہیں، امی کوئی پریشانی نہیں ہے میں بس ایسے ہی کھڑی تھی۔" جائشہ نے سنبھل کر کہا۔
"بیٹا میں یہ کہنے آئی تھی کہ شمسہ نے ہمیں جلدی آنے کا کہلوایا ہے، تم عید والا جوڑا پہن لو اور ذرا ڈھنگ سے تیار ہو جانا سسرال ہے۔"
وہ جو امی کی بات خاموشی سے سن رہی تھی سسرال لفظ پر لب بھینچ کر رہ گئی۔ یہ دنیا اور اس کے رسم و رواج دل ہو یا نا ہو مگر مجبوراً انسان کو بھرم رکھنا پڑتا ہے۔"
آج جائشہ کی نند سارہ کا نکاح تھا ہونے والی بہو ہونے کی وجہ سے اسے جلدی بلایا گیا تھا۔ اس رکھ رکھاؤ پر اس کا دل جل کر رہ گیا تھا۔
"جی امی۔" اس نے آہستگی سے کہا پھر وہ دونوں نیچے آکر تیاری میں لگ گئیں۔
☆......☆......☆
تایا جی کے گھر میں ہر سو ایک رونق سی بکھری ہوئی تھی۔ سب کزنز سارہ کو گھیرے بیٹھے تھے۔ جائشہ خاموشی سے بیٹھی سب کے ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ رہی تھی۔
"جائشہ تمہیں چھوٹی مامی سعید ماموں (جائشہ کے تایا) کے کمرے میں بلا رہی ہیں۔" وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب حرا (پھوپھو کی بیٹی) نے امی کا بلاوا دیا۔
وہ وہاں سے اٹھ کر تایا جی کے کمرے کی طرف آ گئی۔ کمرے میں امی ابو، تایا جی اور تائی بیٹھی ہوئی تھیں۔
"امی آپ نے مجھے بلایا تھا۔" اس نے امی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"آؤ بیٹا یہاں آکر بیٹھو، تایا نے پیار سے بلایا اور اپنے برابر میں بٹھا لیا۔
"جائشہ بیٹا شاذ چاہتا ہے کہ آج سارہ کے نکاح کے ساتھ ساتھ تم لوگوں کا بھی نکاح ہو جائے، ہم سب اس کے فیصلے پر رضا مند ہیں۔"
ابو کی بات پر جائشہ نے انہیں بے یقینی سے دیکھا تھا ابو کے چہرے پر چھائی خوشی دیکھ کر اسے اپنی بصارت پر یقین کرنا پڑا تھا۔ بیٹی کا باپ جتنا اپنی بیٹی کی شادی کے دن خوش ہوتا ہے اتنا کبھی نہیں ہوتا۔
"بیٹا تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" تایا جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ جائشہ نے ایک نظر امی کو چمکتی آنکھوں میں دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔
تایا اور ابو قاضی صاحب بات سے بات کرنے اور دیگر معاملات طے کرنے باہر چلے گئے۔
تائی اور امی اسے تفصیل بتا رہی تھیں کہ رخصتی انا (دوسرے نمبر کی نند) کی شادی کے ساتھ ہو گی وہ دونوں اور بھی کچھ بتا رہی تھیں مگر اسے ہوش کہاں تھا۔
وہ تو کسی خواب کی سی کیفیت میں تھی۔ کب قاضی صاحب آئے اور کب اس نے نکاح نامے پر سائن کیے وہ ٹرانس کی سی کیفیت میں تھی سر جھکائے سن دماغ لیے بیٹھی تھی۔
دروازے کی چرچراہٹ ہے اس کے بے جان وجود میں حرکت پیدا کی چرچراہٹ نے اس کے بے جان وجود میں حرکت پیدا کی تھی۔ انجانے سے احساس کے ساتھ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔
"جائشہ!!" شاذ نے اسے پکارا۔ اس نے جائشہ سے کچھ دیر تنہا بات کرنے کے لیے بڑی مشکل سے اجازت لی تھی۔

''مبارک ہو جان شاذ۔'' اس نے بڑے جذب کے ساتھ اسے مبارکباد دی۔ جائشہ نے اس کے انداز پر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''حیران ہو؟ خواب لگ رہا ہے نہ؟'' مگر دیکھو یہ حقیقت ہے۔اس نے شرارت سے جائشہ کے بازو پر چٹکی کاٹی۔

''آہ!'' جائشہ نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اسے غصے سے دیکھا، بچپن میں وہ اکثر اسے ایسے ہی تنگ کرتا تھا۔

''تمہاری آنکھوں میں موجود سب سوالوں کے جواب دوں گا۔''

اس رات تمہاری باتوں پر میں نے بہت سوچا پہلے تو میں تمہارے اس مطالبے پر حیران ہوا تھا مگر پھر بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تمہیں واقعی میرے ساتھ کی ضرورت ہے۔تم نے اپنی انا کو ایک طرف رکھ کر یہ مطالبہ ایسے ہی نہیں کیا۔ ہم لوگوں نے اپنے ہی عجیب اصول بنا رکھے ہیں۔

اسلام میں ایسا نہیں ہے کہ بہنوں کی شادی نہ ہو تو بھائی بھی نہ کرے بہنوں کے انتظار میں اپنا ایمان بھی مکمل ہونے سے باز رکھے۔ جب لڑکا بالغ ہو اتنا ہی کما تا ہو کہ اپنے عیال کو بھوکا نہ رکھے تو پھر شادی میں دیر کیسی۔

عجیب رسم و رواج ہیں ہمارے معاشرے کے ہم لوگوں کی باتوں سے ڈرتے ہیں اور دینی احکامات سے منہ موڑتے ہیں۔

اسلام نے زندگی گزارنے کے ہمیں آسان اصول بتائے ہیں مگر ہم خود اپنی زندگیوں کو کٹھن بنانے پر تلے ہوئے ہیں میں نے بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمیں نکاح ہی نہیں جلد شادی بھی کر لینی چاہیے۔

ہماری بات بچپن میں طے ہے تو شادی بچپن میں کیوں کریں۔'' شاذ نے اس کی ناک دبا کر ایک بار پھر شرارت کی۔

''کیا مسئلہ ہے آپ کو؟'' جائشہ نے اسے گھورا۔

''اچھا بابا سوری، تمہیں پتا ہے تمہارے خاطر مجھے امی کو منانے کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔'' شاذ نے چہرے پر مظلومیت سجا کر کہا۔

''احسان نہیں کیا ہے آپ نے۔'' اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔ دل کا بوجھ ہلکا ہونے کے بعد وہ خود بھی ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

''ہاہا واقعی احسان ہم نے نہیں آپ نے کیا ہے اتنا اچھا آئیڈیا دے کر۔'' اس نے شوخی سے کہا۔

''میں نے بس ارادہ کیا اور اللہ نے مجھ پر کرم کر دیا۔ سارہ کے سسرال والوں نے شادی کی تاریخ مانگ لی، انا کا بھی رشتہ طے ہو گیا اب مجھے انا کی شادی کے بے صبری سے انتظار ہے آخر بہن کی شادی کے ساتھ ساتھ اپنے سہرے کے پھول بھی تو کھلنے ہیں۔''

شاذ نے شوخی سے کہا۔ جائشہ اس کی بات پر دل سے مسکرائی تھی۔

''ایسے ہی مسکراتی رہا کرو، اور فکر نہیں کرو شادی کے بعد چاچا چاچی کو ہم اپنے ساتھ رکھیں گے۔''

شاذ نے اس کا ہاتھ تھام کر یقین دلایا۔ جائشہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ آج وہ بے انتہا خوش تھی کانٹوں بھری راہ سے گزر کر وہ تھک گئی تھی۔ مگر اب شاذ کی سنگ بہار اس کی منتظر تھی۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

عابدہ سبین

محبت روٹھ جائے تو...

خوبصورت جذبوں سے متعارف کراتی تحریر کی تیسری قسط

''امپاسبل، مجھے لگتا ہے محبت کی گہرائی آپ سے زیادہ کوئی نہیں سمجھتا اور آپ کہتے ہیں کہ محبت کا ضیاع ہے۔''

''جس شخص کا خمیر محبت سے گندھا ہو وہ محبت کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔''

''مجھ پر ریسرچ کرنے سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

''اوں، ہوں، ریسرچ نہیں کر رہا۔'' آپ

سا بننا چاہتا ہوں۔''

''ہو ہی نہیں سکتا۔''

نہال نے بیچ میں بول کر حتمی فیصلہ دیا۔

''کیوں......؟''

''وہ کڑیاں دیکھ کر منہ موڑ لیتا ہے اور توں کڑیاں ویکھ کے دنیا توں منہ موڑ لیتا ہے۔''

''یونو...... یہ بھی اسٹائل ہے بگ بی جتنا منہ موڑتے ہیں لڑکیاں اتنا ہی مرتی ہیں ان پر۔''

''ھائے ربا...... تسی اس لیے ریزرو رہتے ہو بھائی جان۔'' نہال نے کلیجہ تھاما۔

''تم لوگ کبھی نہیں سدھر سکتے۔ بھلا میری عمر ہے اس میں چھچھور پن کی۔''

''یونو' بگ بی شادی کے لیے بیسٹ ایج ہے آپ کی۔ بندے کو اسی عمر میں شادی کرنی چاہیے جب وہ میچور ہو جائے۔''

''تھینکس فار ایڈوائز۔''

''بلال کی کردو، میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔''

''قربان تیری سادگی...... کیا خیال ہے آپ کا ہر ویک اینڈ پر گاؤں کے چکر ابا جی کی محبت میں لگ رہے ہیں وہ خود ہی یہ ہی پلان کر رہے ہیں۔''

''مطلب۔''

''مریم فاروق کی کشش ہر ویک اینڈ پر گاؤں لے جاتی ہے اور ہم معصوم بلا وجہ مارے جاتے ہیں۔ آپ دونوں شام کو چھت پر چہل قدمی کرتے ہیں میں اور نہال ابا جی کی جھڑکیاں کھاتے ہیں۔''

''اور تب ہی ہم دونوں نے فیصلہ لیا ہے کہ اس ویک اینڈ پر ہم ان کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ ہمارا ویک اینڈ خراب کر دیتے ہیں۔''

نہال نے پر جوش انداز میں فیصلہ سنایا تھا۔

☆......☆......☆

ریحاب واقعی صبح چلی گئی تھی۔ اب میرب سے بات کرنا بہت کٹھن مرحلہ تھا۔ جو بھی ہے میرب اعجاز تمہیں منا تو میں لوں گا مگر اس سے پہلے میں نے کچھ اور سوچا ہے، اس نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنایا اور یاسر سے تمام باتیں شیئر کریں۔''

''اب امی ابو کو منانا تیری ذمہ داری ہے لیکن یہ طے ہے کہ یاسر کہ شادی مجھے صرف میرب سے کرنی ہے۔''

''اور اگر وہ نہ مانی۔''

''وہ مان جائے گی، آئی بلیو مگر کیا امی ابو مان جائیں گے۔''

''آج تک تیری ایسی کوئی خواہش ہے جو انہوں نے رد کی ہو۔ مگر اعجاز انکل کی طرف سے کچھ۔''

''اچھی بات منہ سے نکال یاسر میں جا رہا ہوں یہ معاملہ تیرے سپرد کر کے اور اب صرف جب ہی آؤں گا جب تم سب کو منا لو گے اور مجھے یقین ہو جائے گا کہ میرب اعجاز صرف میری ہے۔''

''او کے۔''

''ایک کام اور کر دے، مجھے اس کا سیل نمبر دے دے۔''

''وہ ریحاب کی طرح خوش مزاج نہیں ہے، ریزروسی ہے۔ میری بھی اس سے زیادہ بات چیت نہیں ہے۔''

''غلط وہ بہت خوش مزاج لڑکی ہے۔''

یاسر بولا تھا تب ہی امی آگئیں۔''

''در یدا ایک دو دن رک جاتا اور۔''

''امی میری چھٹی کل ختم ہو رہی ہے پھر اسفند نے بھی فون کر کے تنگ کیا ہوا ہے۔''

اس نے گھر میں سب کو اسفند کے بارے میں بتا دیا تھا۔ امی کو تو اس سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔

''اچھا اگلی بار اسے لے کر آنا ساتھ۔''

''ہاں یاسر کی شادی پر ضرور لاؤں گا۔''

''تیری بھی ساتھ ہی کروں گی۔''

''دیکھیں گے۔''

وہ مسکراتا ہوا اٹھ کے ابو سے ملنے چلا گیا اور سب سے مل کر وہ ایک بار پھر سے یاسر کو یاد دلاتا ہوا باہر نکلا تھا۔ یاسر اس کے ہمراہ ہی آیا تھا۔

گیٹ سے باہر ہی انہیں اعجاز انکل کھڑے مل گئے تھے۔

''السلام وعیکم انکل۔''

اس نے احترام سے سلام کیا حال چال پوچھا۔

''جا رہے ہو اتنی جلدی۔

''بس انکل چھٹی ختم ہو رہی ہے کل۔''

''اچھا...... اللہ تمہیں کامیاب کرے...... مگر بچے چکر جلدی لگا لیا کرو تمہارے ابو کی طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی۔''

انہوں نے پیار سے سمجھایا تھا۔

''جی انشاء اللہ اس بار جلد آؤں گا۔''

قدرے خفیف سا وہ سر جھکا گیا۔

☆......☆......☆

وہ رات کو گھر لوٹا درید عباس کو سامنے دیکھا تو کھل سا گیا۔ درید بھی بہت چاہت سے اسے گلے لگا تھا۔

''کیسا ہے، بڑا بے شرم نے بھول ہی گیا تھا۔''

''تجھے بھولنا اتنا آسان کام ہے ہاف وائف۔'' آنکھ دبا کر شوخی سے بولا تھا اسفند ہنس دیا۔

''تھینکس بھیا آپ آ گئے، ورنہ اسفند بھیا کی حرکات و سکنات آج کل مشکوک ہو گئیں تھیں ...... آفس کے بعد ایسے گھر سے نکلتے ہیں کہ دیکھیں اب لوٹے ہیں۔''

''تجھے صرف بکواس کرنی آتی ہے۔''

اسفند نے اسے ایک لگایا تھا۔ اور درید کے ساتھ بیٹھ کر حال احوال لینے لگا۔ وہ سب اس وقت صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ درید کے آنے سے جیسے وہ بہت کھل سا گیا تھا۔ اسے درید سے وہ ہی لگاؤ سا ہو گیا تھا جو سعد رسول سے تھا کبھی...... اور اگر درید عباس نہ ہوتا تو شاید سعد رسول کی کمی عمر بھر اسے دکھی کرتی۔''

''گھر میں سب ٹھیک تھے۔''

''ہاں اور سب تجھے سلام کہہ رہے تھے۔ امی نے مجھے خاص الخاص کہا ہے کہ اگلی بار تجھے ساتھ لے کر آؤں۔''

''اچھا۔'' وہ اتنے خلوص پر خوشی سے مسکرایا تھا۔

''بھئی لگتا ہے بھابی سے صلح ہو گئی ہے چہرہ پر نور برس رہا ہے۔''

عدیل پکا کھوجی تھا، اسفند ہنس دیا درید گھورنے لگا۔

''میں نے تیری کھوج لگا لی بھئی۔''

''مجھے اتنی کھلی چھٹی کب دی ہے، تین تین پہرے دار ہیں میرے نظریں بھی ڈھنگ سے ملانے نہیں دیتے۔ اور خود شام میں روز جانے کس سے ملنے جاتے ہیں۔'' وہ کلس کر بولا۔

''میری طرف سے کھلی چھٹی ہے تجھے مگر لڑکی

صرف ایک ہی ہو۔"
درید نے کہا، بلال نے اس کے سامنے روز کی طرح جوس کا گلاس رکھا۔ بھلا ایک گلاس سے پیٹ بھرتا ہے کبھی۔
اس کی ذومعنی بات درید سمجھ گیا تھا۔
"پیٹ تو بھرتا ہے میاں نیت نیک ہونی چاہیے۔" زیادہ پینے سے لوز موشن بھی لگ جاتے ہیں۔ اسی لیے موشن ہو یا اموشن کنٹرول میں رکھنے چاہیے۔"
"خاک...... یہ زندگی کا مزہ نہیں۔"
"تیرا قصور نہیں ملتان کی آب وہوا ہی ایسی ہے۔"
"ھور کی، کوئی لڑکی غلطی سے پتا بھی پوچھ لے تو پہلے منڈے نے فون نمبر مانگنا ہے دوستی کی آفر مانگنی ہے لڑکی نو آپے پتہ چل جائے گا کہ لڑکا ملتان تون بی لانگ کرداوا۔"
"تون، وڈا سیانا۔"
طلال نے نہال کو لتاڑا تھا۔
اسی ہنسی مذاق میں کافی وقت بیت گیا تھا۔ وہ درید سے اس دن والی بات نہ پوچھ سکا۔ مگر اگلے دن وہ شام میں لائبریری نہیں گیا تھا بلکہ درید کے ساتھ شام گزاری تھی اور درید نے اسے ساری اسٹوری سنادی۔"
"اگر اب بھی گھر نہ جاتا تو شاید عمر بھر پچھتاتا، تھینکس گاڈ اسفند، میرا نقصان زیادہ نہ ہوا، مگر وہ ناراض ہے مجھ سے۔"
"وہ حق پر ہے۔"
"میں اسے منانا چاہتا ہوں اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔" "میں اسے چھوڑ کر نہیں آیا تھا بلکہ۔"
"اللہ کرم کرے گا یار، انشاء اللہ یاسر تمہیں گڈ نیوز ہی دے گا۔"
"انشاء اللہ۔"
درید کے دل سے نکلا تھا۔
ابھی اسے لوٹے ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ یاسر نے اسے فون کر کے بتایا۔
"سب راضی ہیں صرف میرب نہیں مانتی انکل بھی خوش ہیں مگر وہ صرف میرب کی مرضی کے بنا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے۔"
"مجھے اس سے بات کرنی ہے یاسر پلیز مجھے اس کا نمبر دو۔"
وہ بے چین ہوگیا، یاسر نے اسے ریحاب کا نمبر دیا تھا۔
"ریحاب تمہاری بہن احمق ہے اسے سمجھاؤ پلیز۔"
"کیا ہوا......؟؟"
"مانا کہ میں سزا کا مستحق ہوں وہ جو چاہے سزا دے مگر یہ نہ کرے۔ وہ منع کر رہی ہے۔" ریحاب اسے سمجھاؤ۔"
"تم خود اس سے بات کیوں نہیں کرتے۔"
"وہ میری سنے گی۔"
"ہاں۔"
اس کو ریحاب سے میرب کا نمبر مل گیا تھا اور رات میں ہی وہ اس کا نمبر ملا رہا تھا۔ دو تین بار ملانے پر کال ریسو کی تھی اس نے۔
"ہیلو......کون؟"
شاید وہ نیند میں تھی۔
"درید عباس۔"
اس کی آواز سن کر دوسری طرف سناٹا چھا گیا تھا۔
"میرب پلیز فون بند مت کرنا......"
"ایم سوری میرب پلیز......تم مجھے جو سزا دو

گی میں سہہ لوں گا، مگر انکار مت کرو۔ میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔''

''دو سال سے میرب اعجاز کی خبر لی آپ نے۔''

''بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا میں، مانتا ہوں، تسلیم کرتا ہوں اپنی ہر خطا۔ مگر دو سال کیسے جیا یہ میرا رب جانتا ہے میرب...... ہر رشتہ سے قطع تعلق کر بیٹھا تھا میں۔''

''ایک بار مجھ سے پوچھ تو لیتے، بنا کچھ کہے، بنا بتائے چلے گئے، مڑ کر دیکھا تک نہیں، ہر رابطہ ختم کر دیا میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں خود آپ سے شیئر کروں گی ہر بات۔ انتظار تو کرتے وقت تو دیتے مجھے۔''

اس کی آواز میں نمی گھل گئی، جو درید عباس کا دل کاٹ گئی۔

''مجھے اس وقت اپنی دنیا تباہ ہوتی نظر آئی تھی میرو، میں نہیں سہہ سکتا تھا کہ تم کسی اور کی ہو۔

''مجھے محبت کی راہ پر لا کر خود راہ بدل گئے۔ میں کیسے کسی اور کی ہو سکتی تھی۔ آپ میرے لیے ہر راستہ بند کر گئے تھے۔ درید عباس۔''

''مگر اب مجھے جینا آ گیا ہے زندگی کے ان مشکل لمحوں میں جب آپ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی آپ منہ موڑ گئے، ایک بار پلٹ کر بھی نہیں پوچھا کہ تم کیوں بار بار کال کر رہی ہو۔ اب صبر آ گیا ہے۔ جی لوں گی میں۔''

''مگر میں نہیں جی سکتا میرب اعجاز، میرے حال پر رحم کرو۔ فار گاڈ سیک مجھے معاف کر دو۔''

اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

''میرب تم پہلی لڑکی ہو میرے دل میں سمانے والی اور تمہارے بعد ہزاروں چہرے آئے مگر مجھ پر اثر نہ کر سکے۔ اگر میرے دل میں تم نہ ہوتیں تمہاری محبت نہ ہوتی تو دو سال میں خود پر ہر خوشی حرام نہ کرتا۔ میں نے مڑ کر وہ شہر نہ دیکھا جہاں میں پیدا ہوا، جہاں میرا گھر تھا میرے ماں باپ تھے۔ ان تمام محبتوں پر صرف تمہاری محبت حاوی رہی۔ میں پلٹ کر نہیں گیا کہ تم وہاں جا کے شدت سے یاد آؤ گی، کہیں تم سے سامنا ہو گیا تو کمزور پڑ جاؤں گا۔''

''آ جاتے، ایک بار آتے تو آپ۔'' وہ روتے ہوئے چیخی تھی۔

''اب تم مجھے بے بس کر رہی ہو، رو تو مت یار پلیز۔''

''کیا فرق پڑتا ہے آپ کو، میں تو دو سال سے رو رہی ہوں۔''

کبھی پوچھا آپ نے، اب بھی ویسے ہی جی لیں جیسے جی رہے تھے۔''

''اتنا عرصہ مجھ پر وقت بھاری رہا میرب مگر تم نہیں سمجھو گی کہ اس غلط فہمی نے میری زندگی پر کیسا اثر کیا۔ سارا قصور تمہارا ہے بتا نہیں سکتی تھی کہ تم دو بہنیں ہو۔''

''آپ کو انٹرسٹ کب تھا ان باتوں میں، اور ٹھیک ہے سارا قصور میرا ہے تو۔ مجھے میرے قصور کے ساتھ رہنے دیں۔''

''تم مجھے ہرٹ کر رہی ہو میرب۔''

''آپ نے بھی مجھے ہرٹ کیا ہے۔''

''او کے سوری، بس کہو تو کان پکڑ لوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اب بھی خفا تھی مگر کال کاٹ گئی درید سر پیٹ کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

دو دن بعد وہ لائبریری آیا تھا غیر ارادی طور پر وہ منتظر بھی تھا حریم کا مگر بظاہر کتاب کا مطالعہ بھی کر رہا تھا۔ دو گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی وہ نہیں

آئی تو اسے تشویش سی ہوئی تھی۔ مگر اس کے پاس کوئی رابطہ نہیں تھا کہ وہ حریم فاطمہ کی مما کی طبیعت ہی دریافت کرتا سو وہ اٹھ کر مسجد چلا گیا اور عشاء کی نماز کے بعد گھر لوٹا تو درید عباس کا مسکراتا چہرہ منتظر تھا۔

''اس نے ہاں کر دی اسفند، امی نے مجھے اور تجھے بلایا ہے۔'' اس نے اسفند کو گھما ڈالا۔

''رئیلی۔'' اسفند بھی خوش تھا اس کے لیے۔

''کب جائے گا...... پھر۔''

''نیکسٹ ویک، تو بھی تیار رہنا۔''

''ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

اس کا روز کا معمول بن چکا تھا لائبریری جانا مگر حریم فاطمہ کا انتظار کئی دن پر محیط ہو گیا جو اس کی کیئرینگ نیچر کو بے چین کر گیا۔

''خیر ہے اسفند کل بھی رات بھر جاگتا رہا آج بھی بے کل ہے۔ ورنہ میں تو خوش تھا کہ اب تو پرسکون نیند لیتا ہے۔''

''پتہ نہیں درید بس دل بے کل سا ہے۔''

''کوئی پرابلم ہے۔''

درید کے پوچھنے پر نفی میں سر ہلا دیا۔

جانے کیوں اسکے دل میں بے چینی تھی کہ حریم فاطمہ مشکل میں ہے۔

''آیت الکرسی پڑھ کر سو جا، اللہ کرم کرے گا۔''

درید نے مشورہ دیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس نے سب کچھ پڑھ ڈالا تھا پھر بھی سکون نہیں آیا۔

اگلے دن پھر وہ اس کا منتظر رہا جب وہ نہیں آئی تو اس نے ٹھان لی کہ ضرور پتا کر کے رہے گا۔ یہ بھی سچ تھا کہ انسانی ہمدردی کے علاوہ اس کے دل میں کچھ نہ تھا۔ اگر اسے حریم کے بارے میں پتا نہ ہوتا تو شاید وہ اتنے بے چین نہ ہوتا اب جبکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اور اس کی ماں اکیلی ہیں، نہ اس کے والد حیات تھے اور نہ ہی کوئی بھائی تھا۔ ماں ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھی۔ رشتے دار کوئی ملتے نہیں تھے۔ وہ تنہا اس ماں کی ذمہ داری اٹھا رہی تھی اور پابندی سے یونیورسٹی بھی جاتی تھی۔

اس کے ذہن میں حریم کی نوٹ بک پر لکھا ایڈریس تھا سو وہ پوچھتا پوچھتا آخر پہنچ گیا تھا حالانکہ اس شہر میں اس کی واقفیت بھی خاصی نہیں تھی مگر اس نے حریم فاطمہ کا گھر ڈھونڈ لیا تھا گنجان علاقے میں گھر کے سامنے کھڑا تھا وہ۔ اسے ڈور بیل بجاتے عجیب سی جھجک مانع تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ ڈور بیل بجاتا دروازہ خود ہی کھل گیا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نکلی تھی اسفند اس سے پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ شاید جلدی میں تھی۔ اس پر ایک نظر ڈالتی وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اسفند کئی لمحے ادھ کھلے دروازے کو دیکھتا رہا پھر ہمت کر کے دروازہ بجایا تھا۔

ایک نوعمر لڑکا آیا تھا۔

''حریم فاطمہ......''

''باجی اندر ہیں آجائیں......''

اس نے اسفند کو بتایا اسے ساتھ لا کر اندر بٹھایا، گھر میں گہرا سناٹا تھا۔

''تعزیت کرنے آئے ہیں آپ۔''

لڑکے کے الفاظ تھے کہ بم وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ تعزیت اس کا مطلب......''

وہ ابھی اس شاک سے نہیں نکل تھا کہ سیاہ اسکارف ہمیشہ کی طرح لپیٹے حریم فاطمہ اندر آئی تھی۔ اس کا چہرہ اس کے دکھ کی گواہی دے رہا تھا۔ آنکھیں گریہ وزاری سے سوجھی ہوئیں تھیں۔ گہرا حزن و ملال تھا اس کی آنکھوں میں۔''

''سر......آپ......؟''
اس کی آمد یقیناً اس کی توقع کے قطعی برعکس تھی......
''بہت افسوس ہوا حریم، مجھے تو یہیں آکر علم ہوا کہ تمہاری والدہ کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔''
''جی سر، مما بھی مجھے تنہا کرگئی۔''
''اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے اور تمہیں صبر عطا کرے۔ (آمین)'' اسفند نے گہرے ملال سے کہا تھا حریم نے چہرے پر تیزی سے پھیلنے والے آنسو صاف کیے اس کا دکھ اسفند کو شدت سے دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تنہا رہنا کتنا کھٹن ہے۔ اس نے عمر تنہا گزاری تھی، مگر وہ مرد تھا اور حریم ایک کمزور دوشیزہ...... ہمارے معاشرے میں ایک لڑکی کا تنہا زندگی گزارنا بہت مشکل امر ہے۔ شاید تب ہی اس نے حریم کے دکھ کو بہت محسوس کیا تھا۔''

☆......☆......☆

''بگ بی نہیں آئے اب تک۔''
طلال نے ایک بار پھر گھڑی پر نظر ڈالی جو دس بجانے والی تھی، ان چاروں کے چہروں پر فکر مندی جھلکنے لگی۔ ''وہ تو عشاء پڑھ کر سیدھے گھر آتے ہیں۔''
''وہ مسجد نہیں گئے آج میں پوچھ آیا ہوں۔''
نہال نے بتایا درید کے چہرے پر اس وقت سب سے زیادہ پریشانی تھی۔
''لائبریری سے پتا کر کے آؤں۔''
''وہاں سے وہ روز کے ٹائم پر نکل آیا تھا۔''
درید خود جا کر معلوم کر کے آیا تھا اور اسی باعث وہ بہت پریشان بھی تھا کہ آخر اسفند لائبریری سے کہاں گیا۔ نماز پڑھنے وہ گیا نہیں حالانکہ وہ لائبریری سے سیدھا مسجد جاتا ہے اور پھر سیدھا گھر۔''
''تم لوگ پلیز کھانا کھالو۔'' آجائے گا وہ۔''
درید نے کہا اس کے انتظار میں اب تک کسی نے کھانا تک نہیں کھایا تھا۔ درید نے زبردستی انہیں کھانا کھلایا اور ان کی تسلی کے لیے دو چار نوالے خود بھی لیے حالانکہ اس کا دل اسفند میں اٹکا ہوا تھا۔ دس سے سوئی گیارہ کا ہندسہ بھی کراس کرگئی تھی۔ سیل فون اس کا سوئچ آف جارہا تھا۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ اس کی ٹینشن بھی ہر گزرتے منٹ کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔''
تقریباً ساڑے گیارہ بجے دروازہ بجا تھا اور وہ چاروں جو صحن میں ہی بیٹھے تھے یکدم کھڑے ہوئے تھے۔ درید نے بے تابی سے بھاگ کر دروازہ کھولا تو سامنے اسفند ہی تھا۔ درید نے گہری سانس خارج کر کے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔
وہ بہت خاموشی سے اندر آیا تھا۔
''کہاں تھے آپ بھیا۔'' طلال اور نہال نے بیک وقت پوچھا۔
ان کے چہروں پر اپنے لیے فکر اور جھلکتی محبت دیکھ کر وہ حیران ہوا تھا۔
''اسفند بارہ بجنے والے ہیں؟ کہاں تھا تو......؟'' ہر جگہ تجھے دیکھ آیا میں لائبریری کے بعد کہاں گیا تھا۔''
اللہ پاک کیسے انسانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دیتا ہے بنا تعلق، بنا کسی رشتے کے اس دور میں جہاں سگے رشتے بھی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ان کی محبت مثالی تھی۔
''ایم سوری گائز، ارجنٹ کام تھا وہاں چلا گیا تھا۔''
اس نے طلال کا گال تھپک کر انہیں تسلی دی۔
''جان نکال دی تھی آپ نے یار بگ بی۔''

''ڈونٹ وری آئی ایم فائن یار۔''
اس نے دونوں بازوؤں میں ان دونوں کو سمیٹا تھا۔
انہیں ٹال کر جب وہ ہاتھ لے کر قدرے فریش ہو کر لیٹا تھا تب درید عباس نے کہا۔
''میں ٹین ایج بچہ نہیں جسے تم ٹال دو گے۔ کہاں تھے تم اور چہرے پر اتنا گہرا رنج آنکھوں میں سرخی، چال میں مایوسی میں نے نوٹس کی ہے اسفند ضیاء، پلیز ٹیل می، کیا ہوا......؟''
آج تک اسے درید عباس میں سعد رسول کی محض جھلک نظر آتی تھی مگر اس لمحے اسے لگا کہ سعد رسول ہی اس کے سامنے بیٹھا اس سے جرح کر رہا ہے۔ وہ یکدم اٹھ بیٹھا کتنے لمحے اس نے درید کے چہرے کے نقوش کھوجے تھے کہ کہیں واقعی سعد تو نہیں۔ آج عرصے بعد اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہوئے تھے۔ آنکھوں کی سرخی گہری ہوئی تو درید بہت شاکڈ سا اسے دیکھنے لگا۔
''آر یو اوکے اسفند۔''
اس لمحے وہ خود کو اتنا کمزور محسوس کر رہا تھا کہ بنا کچھ کہے وہ درید عباس سے لپٹ گیا۔ درید نے نا سمجھتے ہوئے بھی دونوں بانہیں مضبوطی سے اس کے گرد باندھ لی تھیں۔
کتنا وقت وہ درید کے گلے لگا رہا تھا۔ پھر الگ ہوا تو چہرہ بھیگا ہوا تھا۔
''کیا بات ہے......؟'' اتنے عرصے میں آج سے پہلے تجھے اتنا کمزور میں نے کبھی نہیں پایا تھا۔ اسفند کیا ہوا ہے۔''
اس نے اب تک درید کو حریم کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ اس بات کو ایشو بنا لیتا اور خدانخواستہ طلال تک ہلکی سی خبر بھی پہنچی تو اس نے فسانے بنا دیں تھے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا مگر آج واقعی اس کا دل بہت بھاری ہو رہا تھا۔ اور اپنے لیے ان سب کے چہروں پر محبت اور پریشانی دیکھ کر اس کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ کم از کم وہ تنہا نہیں ہے۔''
تب ہی اس نے درید عباس کو حریم فاطمہ کے بارے میں بتا دیا۔
کئی دن سے وہ نہیں آ رہی تھی میں ویسے ہی اس کی مما کی طبیعت پوچھنے اس کے گھر گیا۔ وہاں جا کے علم ہوا کہ اس کی مما تو اس دنیا میں رہی نہیں۔ درید جانے کیوں مجھے اس معصوم سی لڑکی کا دکھ اپنے دل میں اتنی شدت سے محسوس ہوا کہ میں کمزور پڑ گیا۔ میں نے ساری زندگی تنہا گزاری مگر مجھے زیادہ پرابلمز اس لیے نہیں ہوئیں کہ میں ایک مرد ہوں، وہ...... وہ تو کمزور سی لڑکی ہے، کیسے رہ پائے گی اس معاشرے میں تنہا۔''
درید نے خاموشی سے اس کی باتیں سنیں تھیں۔
ہمارا ایمان ہے اسفند کہ وہ رب کبھی ہمیں ہماری برداشت سے بڑھ کر آزمائش نہیں دیتا اگر اس لڑکی پر آزمائش ہے تب وہ ہی ذات باری تعالیٰ اس کے لیے وسیلہ بھی بنائے گا۔ ہوسکتا ہے اس پاک ذات نے اس لڑکی کے لیے کوئی بہترین فیصلہ محفوظ کر رکھا ہو۔''
''بے شک درید وہ ہم سے زیادہ ہمیں جانتا ہے اور ہم سے کہیں بہتر ہمارے لیے سوچتا ہے۔ بس ویسے ہی یار میرا دل آج بہت اداس سا ہو گیا تھا شاید اپنے پرانے دن یاد آ گئے تھے۔''
''ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔''
درید نے اس کا سر تھپکا۔
''اللہ پاک اسے ہمت اور صبر عطا فرمائے۔ اور اس کی حفاظت فرمائے بے شک وہ ہی ہماری

ہماری حفاظت کرنے والا ہے۔''
درید کی بات پر اس نے سر ہلایا تھا۔
''او کے ناؤ ریلیکس، اب پلیز تمام باتیں ذہن سے نکال کر سو جاؤ۔' وہ اسے شانہ تھپک کر کہتا خود بھی جا کر لیٹ گیا تھا۔''

☆......☆......☆

''دیکھو حریم موت برحق ہے ہر انسان کو قضا آنی ہے، میں تمہارے دکھ کا مداوہ تو نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ تمہارے لیے دعا کروں اور تمہیں صبر کی تلقین کروں میری کوشش ہے کہ تمہیں اس دکھ کے احساس سے نکال سکوں۔''
وہ حریم کی تنہائی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ تب ہی آج پھر اسے حوصلہ دینے چلا آیا تھا۔
کیسے صبر آ سکتا ہے اسے جس کی دنیا ہی اجڑ جائے سر۔ مما کے علاوہ میرا تھا کون۔ صرف وہ ہی تو میری کل کائنات تھیں۔''
اس کے آنسو ہزار ضبط کے باوجود بھی نہیں رُک رہے تھے۔
''مجھے تمہاری تنہائی کا احساس ہے حریم، کیونکہ خود میں نے بھی ایک عمر تنہا گزاری ہے۔''
''شاید یہ تنہائی ازل سے ہمارا مقدر ہے سر جی۔ پہلے میں اور مما بھی تنہا تھے اور اب مجھے یہ کڑا وقت تنہا گزارنا ہے۔ پھر جی...... آپ نے جس طرح میرا ساتھ دیا۔ میرا حوصلہ بڑھایا آپ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتی۔
''میں نے جو کیا وہ انسانیت کے ناتے میرا فرض تھا، حریم خدا کے لیے اسے احسان کا نام نہ دو۔''
اس نے نرم لہجے میں اسے ٹوکا تھا۔
''سر آپ کے پیرنٹس بھی نہیں ہیں۔''
''نہیں عرصہ ہوا وہ خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔''
''پھر آپ اکیلے رہتے ہیں، بہن بھائی بھی تو ہوں گے ناں آپ کے ساتھ۔''
''تمہاری طرح اکیلا ہوں میں بھی، ہاں چار بہت اچھے دوست اللہ پاک نے عطا کیے ہیں جنہوں نے میری تنہائی دور کر دی۔''
اس نے فرسٹ ٹائم اپنے بارے میں کچھ بتایا تھا اسے۔
شام میں درید اس سے پوچھ رہا تھا۔
''تو گیا تھا حریم کی طرف۔''
جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
تجھے نہیں لگتا اسے تیری ضرورت ہے، کتنے دن بعد آج تو گیا حالانکہ وہ ان دنوں بہت بڑے دکھ سے گزر رہی ہے اور اسے ایک ہمدرد کی ضرورت ہے۔''
''آف کورس اسے کسی ہمدرد کی ضرورت ہے، مگر درید عباس ہم کبھی بھی خود کو دوسروں کے سامنے Define نہیں کر سکتے، ہماری نیت ہمارے دل کا حال صرف ہمارا رب جانتا ہے۔''
''واٹ ڈو یو میں۔'' درید نے حیرت سے پوچھا۔''
''وہ مجھے سر کہتی ہے بہت احترام دیتی ہے میرے دل میں بھی اس کا احترام بہت زیادہ ہے مگر لوگ دلوں میں جھانک کر نہیں دیکھتے جو تم کہہ رہے ہو وہ قطعی غیر شرعی ہے۔ میرے روز اس کے گھر جانے سے اس کے وقار پر کوئی حرف آئے مجھے اچھا نہیں لگے گا یو نو، وہ لڑکی تنہا ہے۔''
جس گہرائی میں وہ سوچتا تھا درید وہ نہیں سوچ پایا تھا۔ مگر اب اسے لگا کہ اسفند ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''یو آر رائٹ...... مگر یار پھر بھی دن بھر اکیلی رہتی ہے اور تو جانتا ہے کہ اکیلے انسان کو ہزاروں سوچیں ستاتی ہیں، کم از کم فون پر ہی سہی اسے حوصلہ دیتے رہنا۔''

''ہوں...... ایک دو دن کی بات ہے پھر وہ یونیورسٹی جانے لگے گی تو دل کو کچھ صبر آ جائے گا۔ ذہن دوسری طرف ہوگا تو شاید وہ اس صدمے سے باہر نکل آئے۔''

''اسفند ایک بات کہوں۔''

وہ جو بات کہنے جا رہا تھا اس نے پہلے سینکڑوں بار سوچا تھا پھر بھی اسے شک تھا کہ اسفند برا نہ مان جائے۔

''ہاں اسفند نے اچھنبے سے اسے دیکھا تو بات کہنے کی بھی اجازت مانگ رہا تھا۔

''تنہا تم بھی ہو تنہا وہ بھی ہے ہو سکتا ہے اللہ پاک نے تمہیں حریم سے ملوایا ہی اس لیے ہو کہ تم اس کا سہارا بن سکو۔''

اس کی بات پر اسفند کئی لمحے ساکت سا اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

درید عباس کیا تجھے لگتا ہے میری زندگی میں اس کی گنجائش ہے۔ میں اسے کیا دے پاؤں گا۔ اور جب میں اسے وہ مقام ہی نہیں دے سکتا جو کہ ہونا چاہیے تو کیوں اس کی زندگی داؤ پر لگاؤں، ہو سکتا ہے کوئی ایسا شخص بھی ہو جس کے دل میں اس کی ہی چاہت ہو بس۔''

درید نے سنہرے کانچ سی آنکھوں میں جھانکا تھا جہاں اضطراب برپا ہونے لگا تھا۔ ''تو کیوں وہ بات کر رہا ہے درید جسے میرا من قبول نہ کرتا ہو۔ اور اگر واقعی اللہ پاک نے میرے لیے ایسا کوئی فیصلہ کر دیا تو پھر میرے من کو راضی بھی وہ خود کر دے گا وہ ہی دلوں میں محبت ڈالتا ہے۔''

درید نے اس کی برداشت کا مزید امتحان نہیں لیا تھا ٹاپک چینج کر دیا۔ مگر اس کے اندر جیسے محبت پھر سے رو پڑی تھی۔

☆......☆......☆

''درید کہاں ہے؟''

وہ آج شام گھر پر ہی تھا۔ درید کے علاوہ سب صحن میں ہی بیٹھے تھے۔

''یونو بگ بی اس کی لو اسٹوری آج کل ہٹ ہے مصروف ہوں گے میرب بھابی سے فون پر۔''

طلال کتنی بارک بینی سے تجزیہ کرتا تھا اسفند مسکرا دیا۔

''اچھی بات ہے ناں، تم نے نوٹس کیا اس میں کافی چینج آیا ہے۔

''ہوں، اور دن بدن پیارے بھی ہو رہے ہیں۔''

طلال مزے سے بولا درید بھی چھت سے اتر آیا تھا۔

''بگ بی کیا واقعی محبت انسان کو بدل دیتی ہے۔''

وہ یقیناً درید کو چھیڑ رہا تھا۔

''ہاں ناں یار دیکھا نہیں بلال کتنا بدل گیا ہے، حریم فاروق کی محبت میں، ہم جیسوں کو تو منہ ہی نہیں لگاتا۔'' درید عباس ہمیشہ ایک تیر سے دو شکار کرتا تھا مگر اس لمحے اس کی بات جہاں طلال کی چلتی زبان بند ہوئی تھی، وہیں بلال کے چہرے پر بھی سایہ سا لہرا گیا تھا جو اسفند اور درید دونوں نے شدت سے نوٹ کیا تھا۔

''چل نہال اٹھ تیری دوا لے آؤں کل پھر جانا بھی ہے۔''

بلال نے ان کی باتیں قطعی اگنور کرتے ہوئے چارپائی پر بے سدھ لیٹے نہال کو اٹھایا تھا

جسے کل رات سے شدید بخار تھا۔
''ضروری ہے کہ کل ہی جائیں، اگلے ہفتے چلے جائیں گے۔''
طلال کا سارا موڈ جھنجھلاہٹ میں بدل گیا تھا۔
''ابا جی کا فون ملا کر دیدوں تجھے خود کہہ دینا۔''
اس کا جلا کٹا لہجہ طلال پر گھڑوں پانی ڈال گیا۔
بلال زبردستی نہال کو اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا جبکہ طلال اپنے سیل فون سے کھیلنے لگا اسفند اور درید نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی۔
کچھ تو تھا جس نے نا صرف بلال کو ڈسٹرب کیا تھا بلکہ ہر وقت زندگی کو فل انجوائے کرنے والے طلال احمد کو بھی عجیب سی خاموشی میں مبتلا کر رکھا تھا۔
''کچھ تو خاص ہے کل، جو تمہارے ابا جی نے ارجنٹ بلالیا۔''
''اتوار کو بلال کا نکاح ہے۔''
بڑی خبر وہ بہت سنجیدگی سے سنا رہا تھا۔
''واقعی میں۔''
درید نے مسکرا کے خوشی کا اظہار کیا۔
''چھوٹے چچا کی بیٹی مقدس سے۔''
اس کی خوشی کو طلال کی اگلی بات نے حیرت میں تبدیل کر دیا جبکہ اسفند کو بھی شاک لگا تھا کیونکہ یہ بات اب سب کو پتا تھی کہ بلال مریم کو چاہتا ہے۔
''مگر بلال تو مریم کو پسند کرتا ہے ناں......؟''
''سو واٹ! ابا جی کو کیا فرق پڑتا ہے کہ بلال کیا چاہتا ہے اور کسے چاہتا ہے انہوں نے صرف ہمیشہ اپنی مرضی اور اپنی خوشی کے لیے ہر فیصلہ کیا ہے بلال خوش ہو نہ ہو۔ وہ خوش ہیں کہ انہوں نے بلال کا رشتہ اپنی پسند سے اپنے بھائی کی بیٹی جس کی عمر بمشکل پندرہ سال ہوگی اس سے طے کر دیا۔''
ان دونوں کے لیے یہ باتیں سدید حیرت اور تاسف کا باعث تھیں بلال کے دل ٹوٹنے کا دکھ اور پھر ایک کم عمر بچی کے ساتھ رشتہ طے کرنا۔
''اور بلال چپ چاپ مان گیا۔''
''کیا کرتا ہمیں یہ حق کب حاصل ہے بگ بی کہ ہم اپنی مرضی سے کر سکیں بلال نے بھی خاموشی اختیار کر لی اب چاہے عمر بھر وہ خوش نہ رہے مگر یہ طے ہے کہ ابا جی کے سامنے کچھ نہیں بولے گا۔''
''غلط...... یہ غلط ہے بلال کو اسٹینڈ لینا چاہیے۔''
''ابا جی سے بدتمیزی کرے یا ان کے سامنے اڑ جائے؟''
''نہیں وہ انہیں قائل کرنے کی کوشش تو کرے اپنی پسند اپنی محبت کا تو بتائے۔''
''بلال بھائی کی خاموشی ان کی محبت کی وجہ سے ہی ہے وہ خود پر ہونے والی زیادتی سہہ لے گا مگر مریم آپی پر آنچ نہیں آنے دے گا۔''
''اس کے بغیر جی لے گا۔''
''ان کے ساتھ جینا زیادہ کھٹن ہے آپ نہیں جانتے کہ اگر بلال بھائی نے مریم آپی کا نام بھی لیا تو خاندان بھر میں فساد برپا ہو جائے گا اور ہر شخص صرف مریم آپی کو قصوروار ٹھہرائے گا۔''
''اس کی وجہ۔''
اسفند نے پہلی بار کچھ پوچھا تھا۔ وہ صرف سن رہا تھا۔
سب سے بڑی وجہ کہ وہ چچا کی دوسری بیوی

کی اولاد ہیں اور چچا نے اپنی پسند ہے شہر کی زیادہ پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کی تھی۔ مریم آپی نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اپنی امی کی طرح۔ اور ہمارے خاندان میں زیادہ پڑھی لکھی لڑکیوں کو ویسے ہی برا سمجھا جاتا ہے۔''

''2013ء میں بھی اتنی جہالت حالانکہ اب تو گاؤں دیہات کے لڑکے لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کر کے اچھی جاب کے متلاشی رہتے ہیں زمانہ بہت بدل گیا ہے طلال۔''

''زمانہ بدل کر کہیں بھی چلا جائے ہمارے ابا جی کے اصول نہیں بدل سکتے یو نو درید بھیا میں صرف اسی لیے اپنی زندگی فل ٹائم انجوائے کرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے پاس یہ چند سال ہیں جو میں اپنی مرضی اپنی خوشی سے جی سکتا ہوں۔''

''ویری سیڈ! بائی گاڈ مجھے اتنا گہرا شاک لگا کہ اس دور میں جب دنیا اس قدر ایڈوانس ہوگئی ہے اب بھی ایسی سوچ۔''

''اور تم دیکھو درید کہ پھر بھی طلال نے خاموشی سے ان کی بات مان لی حالانکہ آج کل کی اولاد اپنی بات منواتی ہے۔''

اس لیے کہ ان کے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔''

طلال نے موضوع کو سمیٹا تھا۔'' بلال اور نہال کی آمد پر وہ تینوں چپ ہو گئے تھے۔''

☆......☆......☆

''درید میرا جانا ضروری ہے، بس تو چلا جا۔''

درید کی امی کا فون آچکا تھا انہوں نے درید کو بلوایا تھا اب درید اس کے ساتھ بحث کر رہا تھا۔

''بہت ضروری ہے اگر تو نہیں گیا ناں، تو سمجھ تیری میری ختم۔''

''تیری میری کیا۔''

اسفند نے مسکراہٹ لبوں میں دبائی تھی۔ درید کی صورت نے رب نے اسے دوست جیسی نعمت عطا کی تھی۔ وہ کبھی بھی اسے ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

سو وہ چپ چاپ اس کے ساتھ آ گیا تھا مگر شام تک ہی درید اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ بور ہو رہا ہے حالانکہ امی ابو یاسر سب نے بہت خلوص اور اپنے پن سے اسے ویلکم کیا تھا۔

''شکل پر بارہ بج رہے ہیں کیا ہوا۔''

''کچھ نہیں، بس دل نہیں لگ رہا۔''

''دل نہیں لگ رہا یا کچھ یاد آ رہا ہے۔''

درید نے خواہ مخواہ ہی ہوا میں تیر چلایا تھا۔

''سچ بتاؤں ذہن میں بلال کا خیال چپک کر رہ گیا ہے جانے کیسے ہیں اس کے ابا جن کے نزدیک اولاد سے زیادہ اپنی مرضی اہم ہے۔''

''بلال کو بھی خاموشی سے ہر غلط فیصلے پر سر نہیں جھکانا چاہیے آج وہ چپ رہا تو سمجھو اس نے طلال اور نہال کے لیے بھی ہر دروازہ بند کر دیا۔'' درید کے خیال میں بلال کو اپنے حق کے لیے آواز اٹھانی چاہیے۔

''مگر یار وہ کیسے اپنے والد کے سامنے ڈٹ جائے۔''

''اپنی اماں سے کہہ کے بات منوالے، ماں کو بچوں کی خوشی سے زیادہ کوئی بھی چیز اہم نہیں رہتی۔''

''تجھے لگتا ہے کہ ان کے ابا کے آگے ان کی اماں کی چلتی ہوگی۔''

اسفند نے اسے دیکھا جو پر سوچ انداز میں سر ہلانے لگا تھا۔''

کچھ دیر بعد یاسر آ گیا تو درید غائب ہو گیا

اور وہ جانتا تھا کہ درید کہاں گیا ہے میرب اعجاز نے ہاں کر دی تھی۔ مگر وہ ناراض تو اب بھی تھی اور درید عباس اُسے منانے آیا تھا۔

'اگر ایسے ہی منہ موڑ کے بیٹھنا تھا تو مت آئیں۔''

''اب چلی جاؤں۔''

''لُک میرب جو کچھ بھی ہوا غلط فہمی کے باعث ہوا ارادتاً میں نے تمہیں ہرٹ نہیں کیا۔''

''آپ کی جلد بازی کے باعث ہرٹ ہوئی ہوں میں۔ پل بھر میں کیے گئے فیصلے سے دکھ پہنچا ہے مجھے اور پھر دو سال تک پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ آپ کو اتنا بھی اعتبار نہیں تھا مجھ پر کہ ایک بار پوچھ لیتے۔''

وہ روہانسی ہوگئی درید عباس گہری سانسیں خارج کر کے رہ گیا۔

''تسلیم کر تو رہا ہوں اپنی ہر خطا اور کیا دو سال میں نے سکون سے گزارے ہیں میرب اعجاز اِک اِک لمحہ تمہارے لیے تڑپتا رہا ہے میرا دل، محبت کی ہے میں نے تم سے اپنے دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ تمہیں چھوڑ کر جانا میرے لیے خود کسی سزا سے کم نہیں تھا۔''

وہ سنجیدہ ہوگیا۔

میرب نے اس کا چہرہ دیکھا جہاں سچائی رقم تھی۔

''اور اب تک جھیل رہا ہوں یہ سزا۔ ختم کر دو اب ناراضگی پلیز۔

''کیا کروں اور؟ جو چاہتے تھے مان تو لی ہے آپ کی بات۔''

''صرف میری خواہش پر ہاں کی، تمہارے دل میں تو ناراضگی اب بھی اسی طرح ہے۔''

''کس نے کہا۔''

''ضرورت ہے کسی کو کہنے کی۔ روز تین بار تمہارا نمبر ڈائل کرتا ہوں جو بنا رسپانس کے بزی کر دیا جاتا ہے۔ اور کیا سمجھوں میں اسے میرب اعجاز۔''

''اندازہ ہوا کہ مجھے کتنی تکلیف ہوئی ہوگی جب آپ میرے ساتھ یوں کرتے تھے۔''

''تم مجھ سے بدلے لے رہی ہو۔''

اس نے گھورا وہ بمشکل اپنی ہنسی روک پائی۔

''جو مرضی سمجھیں۔''

''او کے، فائن، بٹ یاد رکھنا، مس میرب اعجاز بہت جلد تمہارا سارا قرض سود سمیت چکاؤں گا۔ جتنا ستانا ہے ستا لو، جو بدلہ لینا ہے لے لو میرا وقت بھی قریب ہے پھر کیا کرو گی۔''

''آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔''

''جو مرضی سمجھو۔''

''او کے میں ابھی پاپا سے بات کرتی ہوں۔ ابھی وقت میرے پاس بھی ہے۔''

وہ الٹا اسے ہی دھمکانے لگی تھی۔ درید حیران رہ گیا اس کی چالاکی پر۔ اسے گھورا تو ہنس کر اٹھ کے بھاگ گئی۔

☆......☆......☆

وہ تین دن رہا صرف پہلے دن کے علاوہ باقی باقی دو دن بہت اچھے گزرے تھے اس کے۔ خاص کر درید کی والدہ کے ساتھ گزرا بہت اچھا رہا، واپسی پر آتے وقت بہت پیار سے انہوں نے کہا تھا۔

''یہ گھر جتنا درید کا ہے اتنا ہی تمہارا ہے جب دل چاہے اپنا گھر سمجھ کے آ جانا۔''

''کیوں نہیں آنٹی انشاء اللہ۔''

''اگر تم مجھے درید کی طرح امی کہو گے تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔''

''ضرور کہوں گا، امی کہنے کی حسرت تو میرے من میں دم توڑ گئی تھی لیکن اگر آپ کو اچھا لگے گا تو ضرور کہوں گا۔''

وہ مسکرا کے بولا تھا انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ یاسر بھی بغلگیر ہوا تھا۔

''تم سے مل کر بہت اچھا لگا مگر حیرت جس بات پر ہوئی وہ یہ ہے کہ تم جیسا اچھا اور شاندار آدمی درید کا دوست کیسے بن گیا۔''

''جیسے اب تیرا بنا۔''

درید نے جل کر کہا تھا۔

بہت اچھی یادیں دل میں لیے وہ ملتان آیا تھا مگر یہاں آ کر جو پہلا جھٹکا لگا کہ گھر لاکڈ تھا یعنی وہ تینوں اب تک گاؤں سے نہیں آئے تھے۔''

اللہ خیر کرے ورنہ طلال کہاں ٹکنے والا ہے۔''

وہ دونوں ہی فکر مند ہوئے تھے فریش ہو کر انہوں نے بلال اور طلال دونوں کے نمبر ٹرائی کیے تھے مگر دونوں نے ہی کوئی رسپانس نہ دیا۔ پھر درید تو لیٹ گیا اور اس کا ذہن حریم کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے بھی اس نے ایک بار اسے کال کی تھی مگر کسی نے اوکے ضرور کی تھی بات نہ کی۔ اب اس نے پھر سے نمبر ڈائل کیا تو نمبر سوئچ آف تھا۔ حریم نے اسے کئی مس کالز کی تھیں پھر اب کیوں آف تھا نمبر۔ بظاہر وہ مطمئن سا تھا مگر جانے کیوں ذہن الجھ سا گیا۔ پہلے بلال اور اب حریم۔''

بلال تو صبح ہی آ گیا۔ مگر وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ مریم بھی تھی۔ اور جب اس نے بتایا کہ انہوں نے کورٹ میرج کر لی ہے تو درید اور اسفند دونوں شاکڈ رہ گئے۔

''اتنا غلط قدم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔''

''بہت مجبور ہو گیا تھا۔ لیکن اگر تم لوگوں نے بھی نہیں رکھنا تو بتا دو میں دوسرا ٹھکانہ ڈھونڈ لیتا ہوں۔''

سمجھ سکتے تھے وہ کہ اس وقت بلال کی کیا کنڈیشن ہوگی۔

''بکواس نہ کر اسفند کا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔''

درید نے فریج سے جوس لا کر اسے اور مریم کو دیا تھا۔ بلال کو ریلکس کیا۔

''بھابی کو اندر لے جاؤ ریسٹ کر لیں گی۔''

اسفند کے کہنے پر وہ اسے کمرے میں چھوڑ آیا تھا مگر خود واپس ان کے پاس آ بیٹھا تھا۔

''نہال اور طلال۔''

''وہ آئے نہیں اب تک۔'' گویا اسے خبر ہی نہیں تھی۔

''ہوا کیا تھا بلال نے تم نے یہ انتہائی فیصلہ لیا۔''

'اسفند میں نہ مریم پر ظلم ہونے دے سکتا تھا نا میں اس پندرہ سالہ بچی کے ساتھ زیادتی ہونے کے حق میں تھا۔ میں اٹھائیس سال کا ہوں اور وہ مجھ سے عمر میں آدھی تھی۔ یہ ظلم نہ تھا۔''

بلال نے ان دونوں کو جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

''بے شک یہ غلط تھا مگر طلال تم اپنے والد کو یہ ہی بات سمجھاتے۔''

''کیا میں نے انہیں سمجھایا نہیں ہوگا۔'' اسفند ان کی بے جا ضدی اور زبردستی نے ہی مجبور کیا۔ جب مجھے کوئی رستہ نظر نہیں آیا تو میں نے اور حریم نے نکاح کر لیا۔ مگر ابا جی نے یہ تسلیم نہیں کیا اور مجھے گھر سے نکال دیا۔ طلال اور نہال دونوں میرے ساتھ تھے۔ مگر شاید ابا جی نے انہیں زبردستی روک لیا ہو۔''

''اور بھابی کے والدین ان کا ردعمل۔''

''کیا ردعمل ہونا تھا۔ ماں تو اس کی مر چکی تھی سوتیلی ماں نے اسے بھی جیتے جی مار رکھا تھا۔ اور چچا جی کو ہوش ہی نہیں تھا۔ تمہیں پتا ہے اسفند اگر میں یہ قدم اٹھاتا تو سب سے زیادہ ظلم مریم کے ساتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ میرے گاؤں جانے سے پہلے ہی یہ بات سب کو پتا چل چکی تھی کہ میں اور مریم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اور انہوں نے اس معصوم کو ادھ موا کر دینا تھا، صرف اس خطا کے لیے یہ مجھے چاہتی ہے۔''

''بہت افسوس کی بات ہے بلال تم جو کچھ بتا رہے ہو۔ اللہ پاک تمہارے والد کے مزاج میں نرمی پیدا کرے مگر فکر مجھے طلال اور نہال کی ہو رہی ہے۔''

اس کی آواز بھیگ گئی اسفند نے اٹھ کر اسے گلے لگا کر حوصلہ دیا تھا۔

''او کے جسٹ ریلیکس ہونا تھا جو ہو چکا۔ اور آگے جو ہوگا اللہ بہتر کرنے والا ہے مگر تم یوں کمزور پڑو گے تو بھابی کو ہمت کہاں سے ملے گی۔ بے شک یہ غلط انداز میں ہوا مگر اب پلیز خود کو پرسکون رکھو بے شک اللہ پاک ہی ہمارے لیے بہترین کرنے والا ہے۔''

☆......☆......☆

اگلی صبح طلال اور نہال پہنچے تو بلال کو کچھ سکون ہوا ورنہ وہ یہ ہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اس کی غلطی کی سزا اس کے چھوٹے بھائیوں کو سہنی پڑے گی۔''

نہال اور طلال کم عمر تھے۔ ان کے چہروں پر ہونے والے واقعے کے اثرات واضح نظر آ رہے تھے۔ اسفند نے کافی دیر انہیں خود سے لگا کو حوصلہ دیا تھا۔

''اچھا سنو! آج کے بعد ہمارے درمیان یہ موضوع نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم سب کچھ اس ذات پر چھوڑ دیتے ہیں وہ یقیناً ہمارے حق میں ہم سے بہتر فیصلہ کرتا ہے۔۔'' اسفند نے بڑے بھائیوں کی طرح دونوں کو سمجھایا۔

''جی بگ بی۔''

طلال نے فوراً حامی بھری۔ خیر اس کی بات کا اتنا اثر ہوا کہ اگلی صبح سب کی بہت خوشگوار تھی۔ درید کی خاص کر کیونکہ اسے کچن سے چھٹی مل گئی تھی اور یہ چارج اب مریم بھابی نے سنبھال لیا تھا۔ جب سب نارمل تھا تو اب اسفند ضیاء کے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے تھے۔''

''کیا ہوا تجھے۔''

وہ پوچھے بنا رہ نہ سکا۔

''پتا نہیں درید میرا دل عجیب سا ہو رہا ہے۔''

''وجہ۔''

''حریم کا نمبر مستقل ایک ہفتے سے بند ہے۔''

''گھر جا کر معلوم کر لے پھر اس میں الجھنے کی کیا بات ہے۔''

درید اسے گھر کا رستہ بھی دکھا گیا تھا اور شام میں آفس سے واپسی پر اس کا رُخ حریم کے گھر کی طرف تھا۔ مگر وہاں جا کے گھر لاکڈ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ وہ پلٹ کر بائیک اسٹارٹ کرنے لگا تھا کہ اسے وہ ہی نو عمر لڑکا مل گیا جو پہلی بار اسے حریم کے گھر ہی ملا تھا۔

''یہ گھر لاک کیوں ہے۔''

''باجی ہاسپٹل میں ہے ہاں۔''

اس کی بات تو اسفند کو سخت پریشان کر گئی۔

''کیوں......؟''

''باجی نے خودکشی کر لی تھی۔ وہ تو اللہ نے زندگی رکھی تھی ان کی جو بچ گئی۔''

اسفند ضیاء کے قدموں تلے سے دھرتی کھینچ لی تھی۔

''کیا کون سے اسپتال میں ہے وہ۔''

اس نے اس لڑکے سے پتا پوچھا تھا اور بیس منٹ بعد وہ ہاسپٹل میں تھا مگر جھٹکا اسے تب لگا تھا جب حریم نے اس سے ملنے سے منع کر دیا۔

''خالہ میں اس کی خیریت پوچھنے آیا ہوں۔''

''ابھی وہ بہت سہمی ہوئی ہے بیٹا۔ نہیں ملنا چاہتی کسی سے۔''

یہ حریم کی وہ ہی پڑوسن تھی جو اس کے پاس رہتی تھی۔

''ہوا کیا ہے حریم کو۔''

''اللہ جانے میں تو اپنے سسر کی فوتگی پر گئی ہوئی تھی، واپس آئی تو اس کی حالت بہت ابتر تھی وہ تو سانسیں تھیں جو بچ گئی۔''

وہ بہت سادہ سی گھریلو خاتون تھیں۔ اس لیے اپنے اندازے میں بتا رہی تھیں۔

اس نے بہت کوشش کی تھی مگر حریم ملنے پر تیار نہ ہوئی۔

اس رات وہ پوری رات کرسی پر بیٹھا رہا نیند تو دور کی بات وہ لیٹ بھی نہ پایا تھا آخر اسے کیوں ایک غیر لڑکی کی اتنی فکر ہے۔

درید صبح جاگا تو حیران رہ گیا۔

اسفند کا بستر خالی تھا۔ حالانکہ فجر پڑھ کر وہ لازمی لیٹتا تھا مگر آج صحن میں بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا۔ درید نے فی الوقت چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔

☆......☆......☆

آج بھی آفس سے سیدھا وہ ہاسپٹل گیا تھا۔ خالہ نہیں تھیں اور حریم گھٹنوں میں سر دیے ہچکیوں سے رو رہی تھی، وہ لب بھینچ کر کئی لمحے کھڑا رہا۔

''حریم۔''

اس نے پکارنے پر وہ بری طرح چونکی تھی اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ جو اسفند نے شدت سے محسوس کیے تھے۔ وہ آہستگی سے چلتا اس کے قریب آیا تھا۔ حریم سہم کر پیچھے کھسکی تھی۔

''حریم، تم ٹھیک ہو اب۔''

اسفند نے پوچھا، جواباً حریم کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور لب لرز رہے تھے۔ اس کی یہ حالت شدید تکلیف دہ تھی آخر کیا ہوا تھا جو حریم اس حال تک پہنچ گئی۔

''حریم پلیز ڈر کیوں رہی ہو میں ہوں اسفند۔''

وہ اس کے بیڈ کے پاس ہی کونے پر بیٹھا تھا حریم کئی لمحے اسے آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی پھر جانے کیا ہوا وہ خود سمجھ نہ سکا کہ حریم پاگلوں کی طرح آ کر اس کے سینے سے لگی تھی اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر رونے لگی تھی اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔

''سر جی مجھے مر جانے دیں مجھے نہیں جینا۔''

وہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہی تھی اسفند کی اپنی حالت اس وقت بہت عجیب ہو رہی تھی وہ کیا کرے کیسے اسے سنبھالے، کیا کہے۔ اس نے بہت ہمت کر کے کافی وقت اسے رونے دیا پھر مضبوطی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

''زندگی اللہ پاک کی سب سے بڑی نعمت ہے حریم ایسے نہیں کہتے اور تم تو بہت بہادر ہوں ناں، تم نے یہ کیوں کیا......؟''

اس نے سوال کیا۔

وہ لمحہ بھر کو چپ ہوئی تھی اس کے لب پھر

لرزے تھے خوف کی وہ ہی کیفیت پھر سے اس پر طاری ہوئی تھی۔ اس کا زرد ہوتا چہرہ یکدم لٹھے کی مانند سفید ہوا تھا۔

جس زندگی کو میں سر اٹھا کر نہ جی سکوں اسے ختم ہو جانا بہتر نہیں ہے سر۔''

حریم کو جانے اس پر اتنا اعتبار کیوں تھا کہ اس نے جو لب سی لیے تھے صرف اسفند کے سامنے کھول دیے اور اسفند نے اس کے لرزتے لبوں سے نکلنے والے لفظ سن کر جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔

ضبط کی انتہا تھی اس کی۔ ورنہ جو حقیقت حریم نے اسے بتائی تھی وہ نا قابل معافی تھی۔

''ایک بار مجھے بتاتی تو سہی یہ قدم اٹھانے سے پہلے۔''

''کتنے فون کیے تھے آپ کو......؟؟ حریم کے بتانے پر اس کو مس کالز کا دھیان آیا اس وقت وہ درید کے گھر میں تھا۔

میں اسے نہیں چھوڑوں گا ہمیں پولیس کو بتانا چاہیے۔''

''نہیں۔''

''وہ یکدم چیخی تھی۔''

''آپ کو قسم ہے اس ذات کی جو ہماری جان و آبرو کا مالک ہے یہ بات آپ کے اور میرے بیچ رہے گی اگر آپ مجھے زندہ دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ سر اٹھا کے جینے کے قابل نہیں رہی میں۔''

وہ بے بسی سے لب کچل کر رہ گیا۔ مگر حریم......

''انصاف اس رب سے بہتر کوئی نہیں کرتا میں نے اپنا مقدمہ اس کی عدالت میں چھوڑ دیا ہے۔ مجھے تماشہ نہیں بننا سر جی، پلیز۔''

اس نے دونوں ہاتھ اسفند کے سامنے جوڑے ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

''وہ اتنے عرصے سے تمہیں تنگ کر رہا تھا حریم اور تم نے ایک بار بھی مجھے نہ بتایا مجھ سے شیئر تو کرتیں شاید آج۔''

وہ بولتے بولتے لب بھینچ گیا۔

''اگر مجھے اندازہ ہوتا تو میں کبھی تمہیں اکیلے نہ رہنے دیتا وہاں۔''

''کچھ نہیں بچا سر۔ کاش میں مر جاتی۔ مجھ سے یوں نہیں جیا جائے گا۔ مجھے مار دیں پلیز مجھے مار دیں۔''

اسفند نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ تھام لیے تھے اور اسے خود سے لگا لیا وہ کتنے ہی وقت روتی رہی اس کے سینے سے لگی۔

''ایسے نہیں کہتے حریم، تم اب تنہا نہیں ہو۔''

اس نے حریم کو تسلی دی تھی۔ ڈاکٹرز سے بات کر کے پتا چلا کہ ابھی مزید دو تین دن اسے یہاں رکنا ہوا۔ اس کا معدہ اچھی طرح واش کرنا تھا۔

وہ گھر لوٹ تو آیا تھا مگر دل وہیں اس معصوم لڑکی میں اٹکا ہوا تھا۔ سب کے درمیان بیٹھا بھی وہ جیسے یہاں تھا ہی نہیں۔

''خیریت ہے بگ بی آج سے پہلے کبھی آپ کو اتنا زیادہ پریشان نہیں دیکھا۔''

طلال کے کہنے پر وہ چونکا تھا سب اس کی طرف متوجہ تھے۔

''کچھ نہیں یار، بس سر میں درد ہے۔''

''سر کا مساج کروں بھائی جان۔''

نہال نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا تھا مگر وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''چائے پی لوں گا سکون ہو جائے گا۔''

''کہاں جا رہے ہے، مریم بنا دے گی۔''

(اس خوبصورت ناولٹ کی چوتھی قسط اگلے ماہ پڑھنا نہ بھولیے)

نئے سال کے لیے مصنفہ کی، نوجوان لڑکیوں کے لیے سبق آموز تحریر

"کہاں چلیں؟" بظاہر گاجر چھیلنے میں مصروف اماں نے اُس کی آمد پر اُسے اوپر سے نیچے تک دیکھا تو وہ کلس کر رہ گئی۔

"اماں، یہ وقت میرے کالج جانے کا ہے اور ہر صبح کی طرح میں وہیں جا رہی ہوں۔"

"اچھا! بڑی نوازش تیری جو اس اہم خبر کو مجھ تک پہنچایا تو نے۔ اب ایک بات ذرا کان کھول کر سن لے۔ میں ایسی بے خبر بھی نہیں دنیا سے کہ مجھے یہ نہ پتا ہو کہ کالج کس حلیے میں جایا جاتا ہے۔" اماں نے اس سے بھی زیادہ تلخ لہجہ اپناتے ہوئے، اُس کے عبایا سے نیچے جھانکتی ہوئی دودھیا پیروں میں سجی سیاہ لیکن ستاروں سے چمچاتی کولہا پوری چپل کو گھورتے ہوئے کہا کہ تو وہ گڑبڑا گئی۔ پھر جلدی سے خود کو سنبھالا اور اس سے پہلے کہ اماں مزید بگڑ کر اُس کا کام بگاڑ دیتیں اپنا لہجہ بھی شیرینی میں ڈبو لیا۔

"ارے اماں...... میں تو بتانا ہی بھول گئی۔ آج کالج میں فیئر ویل پارٹی ہے لاسٹ ایئر بیچ کی تو اسی سلسلے میں چھوٹا سا فنکشن ہے۔ میں نے بھی شعری مقابلہ میں حصہ لیا ہے۔ اس لیے یہ پہن کر جا رہی ہوں۔ جچ لگ رہا ہے نا۔" اس نے اماں کے کہنے سے پہلے ہی اپنے عبایا کے بٹن کو کھول کر سفید پرل سے سجے سیاہ جارجٹ کے سوٹ کا دیدار کرا دیا۔ تو اماں نے پہلے تو اسے حسبِ توفیق گھوریوں سے نوازا پھر گاجر کو چھیلنے کی طرف دوبارہ متوجہ ہو کر بولی۔

"اچھا...... ایک دن میں تیری میڈم سے ہی آ کر پوچھوں گی کہ تم لوگ لڑکیوں کو کچھ پڑھاتے وڑھاتے بھی ہو یا بس فنکشن کروا کر میراثی بننے کی ٹریننگ دے رہے ہو۔" اماں بظاہر گاجر چھیلتے ہوئے عام سے لہجے میں بولیں۔ مگر اسے لگا کہ کہیں واقعی اماں کسی دن میڈم کے سامنے اسے اسی طرح چھیل کر نہ رکھ دیں مگر اس وقت اماں سے ٹکر لینا اُس کے حق میں قطعاً اچھا ثابت نہ ہوتا سو اس نے فرار میں ہی عافیت جانی۔

"ٹھیک ہے اماں کر لینا بات۔ کالج میں ایسی غیر نصابی سرگرمیاں بھی ہوتی ہیں۔ جو اسٹوڈنٹس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو سامنے لانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔"

"ہاں ہاں معلوم ہے مجھے...... تجھ میں بھی

بڑی بڑی صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں۔'' اب کی بار اماں نے حجاب سے ڈھکے ہوئے آدھے چہرے کے بیچ کاجل سے بھی نمایاں اور عیاں آنکھوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تو وہ لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے رہ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ اماں کی تیر برساتی آنکھوں کے ساتھ ہاتھوں کی برچھیوں کا بھی شکار ہوجاتی اس نے اڑان کے لیے پر پھیلا لیے۔

''اچھا اماں...... مجھے دیر ہورہی ہے۔ وہاں جاکر ریہرسل بھی کرنی ہے۔ اللہ حافظ۔'' وہ پلک جھپکتے میں گیٹ کھول کر باہر نکل گئی اور اماں پلکیں جھپکائے بنا اُسے نظروں سے اوجھل ہونے تک تکتی رہیں۔

☆......☆......☆

وہ ایسی ہی جلد باز تھی۔ اسے زندگی میں ہر کام کرنے کی جلدی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اس قدر ذی شعور ہے کہ وہ اپنی زندگی کے سارے فیصلے صحیح کرسکتی ہے اور اس کے چنے گئے تمام راستے اُسے اپنی منزل کی طرف پہنچائیں گے۔ اور جب انسان قدرت کے بنائے گئے اصولوں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے تو نتیجے میں اسے بھی منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ مگر کیا کرے انسان کہ بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔

انابیہ اکرم بھی ایسی ہی تھی۔ وہ سب کچھ ایک جھٹکے ایک پل میں پالینا چاہتی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو ستاروں بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے ستاروں کو آنچل میں بھر لینے کی خواہش تو کرلیتے ہیں مگر یہ یکسر فراموش کردیتے ہیں کہ یہ مسافت بڑی کٹھن ہوتی ہے اور انسان کی چاہ

سے کیا ہوتا ہے یہ تو رب کی مرضی ہے کہ سورج کو مشرق سے نکالتے نکالتے کب مغرب سے نکال دے مگر انسان حدیں پھلانگتا جاتا ہے کیونکہ اسے خود پر غرور ہے اپنے انسان ہونے پر اکڑ ہے۔

انابیہ نے زندگی کی بیسویں بہار کیا دیکھی کہ آنکھوں میں خواب بنا شروع کر دیے۔ وہی خواب جو عموماً لڑکیاں سولہویں برس سے ہی دیکھنا شروع کر دیتی ہیں ایک شہزادے کی آمد کے، سنگِ مرمر سے بنے، جنت کی طرح سجے محل کے، مگر جنت زمین پر کب ہے۔ یہ زمین پر بسنے والے بھول جاتے ہیں۔

اور جو سب بھول جائے اور بس اپنا آپ یاد رکھے تو اسے دیوانہ ہی کہتے ہیں اور دیوانوں کو اپنے نفع ونقصان کی پہچان کہاں رہتی ہے۔ وہ تو مچلتے بھڑکتے شعلے کو بھی اس کی چمک کے باعث پکڑنے کی ضد اور کوشش کرتے ہیں۔

انابیہ بھی ایسے ہی دیوانوں میں سے تھی جو اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے مچل رہی تھی اور لپک کر اپنی آرزوؤں کے جگنوؤں کو ہمیشہ کے لیے اپنی مٹھی میں قید کر لینا چاہتی تھی۔ اس لیے جب مدحت عارفین کی صورت میں اسے اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے پہلی سیڑھی ملی تو اس نے قدم دھرنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ مدحت اُس کی کالج فیلو تھی۔ اَپر کلاس سے تعلق رکھنے والی، شوخ و چنچل مدحت کو اپنے گرد خوشامدیوں کا جمگھٹا لگانا بہت پسند تھا جو اُس کی ہر بات میں واہ واہ کریں۔ اُس کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیں۔ اور ان کے بدلے مدحت اپنے حامیوں کو مختلف اقسام کے تحائف سے بھی نوازتی رہتی اکثر انہیں گیدرنگ کے نام پر پارٹی دیتی۔

اور ایسی ہی ایک پارٹی میں اسے بالآخر اپنی منزل ازمیر امین کی صورت میں مل گئی۔ وہ مدحت کا کزن اور ایک مل اونر کا بیٹا تھا۔ ازمیر کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کی تلاش انابیہ کو تھی۔ شاندار گاڑی، وسیع وعریض بنگلہ اور بینک بیلنس اور خوشحالی کے باعث پُرکشش سراپا اور ازمیر جس کو زندگی کی رنگینیاں ہی بھاتی تھیں۔ اجلی رنگت اور نازک سراپے والی انابیہ بھی بھا گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ نظریں چار ہوئیں اور کہانیاں شروع ہوگئیں۔ ازمیر اور انابیہ کے درمیان محبت کی کہانیاں اور اطراف میں بدنامی کی کہانیاں۔ مگر انہیں کہاں پرواہ تھی۔ وہ مست اور مگن تھے۔ محبت کے نشے نے انہیں مدہوش کر رکھا تھا۔ وہ روز ملتے مگر تشنگی تھی کہ جاتی ہی نہ تھی۔ انابیہ لڑکی ہونے کے باعث تھوڑا ڈرتی مگر پھر ازمیر کا بیقراری بھرا اصرار اسے بھی بے قرار کر دیتا۔

''انابیہ تم میرے لیے ایک نشے کی طرح بن گئی ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ میں تم سے نہ ملوں تو تڑپ تڑپ کر مر جاؤں گا۔'' اور انابیہ دوڑتی چلی آتی۔ چاہے اُسے لاکھ بہانے بنانے پڑیں۔ جھوٹ بولنا پڑیں۔ وہ اپنے تئیں بڑی خوبی سے اماں کو بیوقوف بناتی تھی مگر مائیں کبھی بھی اتنی بیوقوف نہیں ہوتیں جتنا اولاد انہیں سمجھتی ہے۔ خاص طور پر وہ مائیں جو اولاد کے ہر دم بدلتے رنگوں پر نظر رکھنے کی عادی ہوتی ہیں۔ اماں بھی ایسی ہی ماؤں میں سے ایک تھیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ انابیہ کے پر نکلنے لگے ہیں وہ بلندیوں پر پرواز کی خواہاں ہیں مگر وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ انابیہ جیسی چڑیاؤں پر باز اپنی نظریں گاڑے بیٹھا ہوتا ہے اس لیے وہ انابیہ کے پر کترنے کی تیاریاں کرنے لگیں اور وہ پھڑ پھڑا کر بھی چور راستوں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکے اُس کے لیے انہوں نے امجد

نامی پنجرہ بھی ڈھونڈ لیا۔
امجد اُن کی دور کی خالہ زاد کا لڑکا تھا۔ محنتی، ایماندار اور شریف۔ کچھ کم رو تھا مگر کم ظرف نہ تھا۔ مگر جناب انابیہ کو خبر ہوئی تو اس نے شور مچانا شروع کر دیا بھلا پرندہ کب پنجرے میں قید ہونا چاہتا اسے تو ہر حال میں آزادی ہی چاہیے ہوتی ہے۔ معصوم پرندہ اس بات سے بھی غافل ہوتا ہے کہ بعض اوقات اُس کے مالک کا اُس کو قید کر دینا سختی نہیں اُس کا حفاظتی اقدام ہوتا ہے تاکہ وہ بیرونی خطرات سے محفوظ رہ سکے۔ اماں بھی انابیہ کو محفوظ کرنا چاہتی تھی مگر اس نے اماں کے اس اقدام کو ظلم سے تعبیر کیا۔
''نہیں اماں۔ جب تک میری مرضی نہ ہوگی تم میری شادی نہیں کر سکتیں۔ یہ میرا حق ہے۔'' انابیہ کا تناؤ جود اماں کو مزید سُلگا گیا۔ انہوں نے لمبی گھنی چوٹی سمیت اسے مروڑ کر رکھ دیا۔
''تیری مرضی کیا ہے یہ میں خوب جانتی ہوں۔ تجھ جیسی اولادیں جو ماں باپ کی عزت اچھالنے کے درپے ہو جائیں انہیں کسی قسم کا حق طلب کرنے کا حق حاصل نہیں رہتا۔'' تکلیف سے انابیہ کے آنسو نکل آئے مگر دل سے آسمان کی وسعتوں کو چھونے کا خواب نہیں نکلا اور پھر اس نے بظاہر اپنے گرد خاموشی کی فضا قائم کر لی مگر اُس کا دل و دماغ دن رات منصوبے تراشنے لگا اور آج کل بھیانک منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے جدید ٹیکنالوجی سے بڑا ساتھی کون ثابت ہو سکتا۔ افسوس صد افسوس کہ پرانی نسل چاہ کر بھی ان جدید آلات سے اتنی آگاہی حاصل نہیں کر پاتی جتنی نئی نسل کر جاتی ہے اور نسلوں کا فرق تو ہمیشہ سے ہی متنازع رہا ہے۔ انابیہ نے موبائل پر مدحت عارفین اور ازمیر امین کے ساتھ مل کر آزادی کا منصوبہ بنایا۔
''میں چاہتا ہوں ہم نئے سال کا آغاز ایک ساتھ کریں۔ اپنی محبت کی نئی داستان رقم کریں۔'' ازمیر کا لہجہ چاشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کی محبت سے لبریز آواز، اُس کا چاہت بھرا لہجہ ہی تو انابیہ کو دنیا و مافیہا سے بیگانہ کر دیتا تھا۔ اُس کی سماعتیں صرف اُس کی آواز سنتی تھیں اور سننا چاہتی تھیں۔ دماغ وہی سوچتا تھا اور سوچنا چاہتا تھا جو وہ کہتا اور آنکھوں کے آگے تو پردہ ہی ازمیر کی شاندار اور پُرکشش شخصیت کا تھا سوائے اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ وہ اکتیس دسمبر کا دن تھا۔ وہ صبح کالج کے لیے نکلی تھی اس نے اماں کو رجھانے کے لیے خود پر فرمانبرداری کا لبادہ اوڑھ لیا۔
''اماں تم جو کہو گی میں وہی کروں گی۔ مجھے سمجھ آ گئی ہے کہ مائیں اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتیں بس مجھے اپنی پڑھائی مکمل کر لینے دو۔ بس تین چار ماہ تو ہیں۔ میں گریجویٹ ہو جاؤں گی تو اللہ نہ کرے کسی برے وقت میں کمانے کے قابل تو رہوں گی۔''
اور اماں پسیج گئیں۔ اور یہی ماؤں کی ہار ہوتی ہے وہ اولاد کو ہاتھ جوڑتا منت کرتا گڑگڑاتا نہیں دیکھ سکتیں۔ خاص طور پر اولاد سعادت مندی کا مظاہرہ کرے اب چاہے دکھاوا ہو یا اصلیت۔ مدحت کے کہنے پر انابیہ وقت پر کالج آتی جاتی۔ اپنی کلاس بھی پابندی سے اٹینڈ کرتی تاکہ اماں جاسوسی کریں تو انابیہ مشکوک نہ ٹھہرائی جائے اور تو اور اپنا موبائل جسے وہ کلیجے سے لگائے پھرتی تھی۔ بے پروائی سے اِدھر اُدھر پڑے رہنے دیتی اور رات کو جاگ جاگ کر پڑھتی۔ اماں مطمئن ہونے لگیں تھیں کہ انابیہ کے رابطے ختم ہو گئے مگر اُس کا رابطہ تو دوسرے مزید ایڈوانس موبائل

(ٹیب) سے ہنوز قائم تھا۔ جس پر اسکائپ سمیت ہر آپشن موجود تھا وہ اُسے اپنے بیگ میں اپنی الماری میں چھپا کر نہ رکھتی تھی کیونکہ اماں اُس کی چیزوں کی تلاشی تو ضرور لیتیں۔ وہ اُسے بستروں کے پرانے ٹرنک کے پیچھے بند کر کے رکھتی تھی اور رات کو اماں جب اُس کا موبائل اپنے سرہانے رکھ کر خراٹے بھرتے ہوئے گہری نیند سو جاتیں تو انابیہ کا دن شروع ہو جاتا۔ اور اسی دوران راز و نیاز کے ساتھ مستقبل کے منصوبے بنائے جاتے۔

وہ سال کے آخری دن کی صبح گھر سے کالج کے لیے نکلی ضرور مگر کالج نہیں گئی وہ مدحت کے ساتھ اُس کے گھر چلی آئی۔ دونوں کو مل کر ازمیر کے گھر جانا تھا۔ جہاں بقول اُس کے وہ نیو ایئر پارٹی کا سلیبریشن بھی کرنے والا تھا اور وہیں دونوں کا نکاح پڑھ کر ہمیشہ کے لیے ایک ہو جانا بھی طے ہوا تھا۔ وہ دونوں عصر کے بعد تیار ہو کر نکل گئیں۔ سردیوں میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں دروازے پر پہنچی تو اندر جانے سے پہلے ہی مدحت کے منگیتر کی کال آ گئی ان دونوں نے نیو ایئر سلیبریشن کہیں اور منانا تھا اس لیے مدحت نے اُسے ڈراپ کر کے گاڑی ریورس کر لی۔ وہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ لان عبور کر کے اندر آئی تو داہنی جانب کا دروازہ کھلا دیکھ کر اندر آنے کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک انجان آواز سُن کر چونک گئی اسے لگا کہ وہ غلط جگہ تو نہیں آ گئی کہ یہ ازمیر کے بجائے کسی اور کا گھر ہو مگر اُس کی ساری غلط فہمیاں کانوں سے ٹکراتے جملوں نے دور کر دیں۔

''ارے یار کہاں ہے تیری چڑیا۔ دیکھ تیری وجہ سے میں کلفتن والا کنسرٹ چھوڑ کر آیا ہوں تجھے پتا ہے وہاں تو پورا غول ہے چڑیاؤں کا۔''

''ارے میری جان یہ ازمیر کا وعدہ ہے تو اُن سب کو بھول جائے گا۔ بس پہنچنے والی ہو گی پھر مل کر جشن منائیں گے اور بات سُن میں لوں گا پورے لاکھ۔ آگے تو تُو نے ہی کمانا ہے۔'' ازمیر کی شراب میں ڈوبی آواز اور گھٹیا لہجہ اور عزائم نے لمحوں میں اُس کی آنکھوں پر گرا پردہ تو گرا دیا مگر اس نے اپنے ہوش و حواس معطل نہ ہونے دیے وہ دبے قدموں پلٹی اور پھر بھاگتی ہوئی مین روڈ پر آ نکلی۔ رکشہ پکڑا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اماں دل پکڑے صحن میں بیٹھی تھیں۔ اس نے اماں کے پرس سے نکال کر رکشے والے کو پیسے دیے اور اُن کے پیروں میں پڑی چپل اُتار کر اُن کے ہاتھ میں تھما دی گم صم اماں اسے بس تکے جا رہی تھیں۔

''اماں آج تم مجھے اتنا مارو جتنا تم نے مجھے پیار کیا ہے۔ مگر مجھے خود سے اور اپنی دعاؤں کے حصار سے دور نہ کرنا۔ کیونکہ یہی وہ جال ہے جس سے میں بچنے کی ہمیشہ کوشش کرتی رہی اور آج اُسی نے مجھے بچالیا۔'' وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ باہر نئے سال کی خوشی میں پٹاخے پھوٹ رہے تھے۔ آتش بازی ہو رہی تھی۔ اماں چونک پڑیں اور پھر گڑگڑاتی انابیہ کو دیکھ کر ایک بار پھر پسیج گئیں اور اُس کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔ اور آسمان کی طرف دیکھ کر شکر ادا کرنے لگی کہ شکر ہے یہ سال انہیں خالی ہاتھ کر کے نہیں گیا اور انابیہ اماں سے لگی یہ سوچنے لگی کہ وہ برسوں سے اپنی خواہشوں کے پیچھے بھاگتی چلی گئی مگر اب کے برس اسے سراب اور خواب کا فرق خوب سمجھ آ گیا تھا۔ شکرانے کے آنسو اُس کے رخسار بھی بھگوتے چلے گئے۔

☆☆......☆☆

دشمنِ جاں، میرا ساجن

خوب اچھے سے شاپنگ کرانا نرگس کو، جی بھر کے خوش کر دینا اُسے تاکہ ساری مطلب کی بات اُگل دے۔ دیکھو کہیں کم تو نہیں پڑیں گے پیسے...... اچھا ایسا کرو یہ بھی لے لو۔'' شازیہ مارے خوشی کے پھولے نہ سمارہی تھیں۔ اور جذبات میں آ کر مزید ڈیڑھ ہزار......

رنگ و بو کی اس محفل میں رونق عروج پر تھی۔ ایگزیبیشن ہال میں ملک کے معروف مصور کی پینٹنگز کی نمائش جاری تھی اور آرٹس کے دلدادہ افراد اس نمائش میں بڑے شوق و دلچسپی کے ساتھ شرکت کے لیے آ موجود تھے۔ وہ ٹخنوں تک آئی سیاہ فراک میں ملبوس اپنی کزن علشبہ کے ہمراہ اِن پینٹنگز پر شاندار تبصرے کرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس وقت وہ جس پینٹنگ کے سامنے کھڑی تھی وہ ایک دوشیزہ کی نیم عریاں پینٹنگ تھی جس کے سامنے وہ کسی لڑاکا سیاستدان کی طرح بیان پر بیان داغے جارہی تھی۔

''آج کل تو نرالا ہی رواج چل پڑا ہے۔ عورتوں کو بے لباس کر کے اُن کی بے بسی و بے چارگی اور زمانے کی بے حسی کا نقشہ کھینچ کر مصور اُسے اپنا شاہکار سمجھ کر خراج وصول کرتا ہے اور لوگ جانے کون کون سی نفوس کی تسکین کے لیے اپنے محل کے در و دیواروں کی زینت بنا کر اپنے ماتھے پر آرٹ کے قدردان ہونے کا ٹیگ لگائے پھرتے ہیں۔'' اُس کی زبان بنا بریک لگائے جو چلی تو ماہین کے زوردار ٹہوکا مارنے پر رُکی۔

''حد کرتی ہو۔ جب نہیں پسند ایسی پینٹنگز تو کیوں دیدے پھاڑے ٹک ٹک دیکھ رہی ہو۔ چلو اب آگے بھی بڑھو۔'' علشبہ نے ہال میں ایک نظر دوڑاتے ہوئے اُسے جھاڑ پلائی۔ صد شکر کہ محسن اس وقت شازیہ اور روبی کے ساتھ دوسری طرف پینٹنگز دیکھنے میں مصروف تھا۔ اگر اُس نے ماہا کے یہ بلند آواز زرین تبصرے سُن لیے ہوتے تو بناء لحاظ کیے بے عزت کر کے رکھ دیتا ان دونوں کو۔

''کیا......! میں دیدے پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں۔ تم ذرا اپنی بینائی چیک کرواؤ۔ تمہیں غصے سے گھورنے اور دیدے پھاڑنے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔'' وہ اب اپنے وہی دیدے علشبہ کے چہرے پر جمائے خونخوار لہجے میں بول رہی تھی۔

''اف میرے اللہ! جس طرح بھی دیکھ رہی ہو اب دیکھنا بند کرو۔ ہال میں موجود ساری خلقت ہمیں عجیب نظروں سے گھور رہی ہے۔'' علشبہ نے اُسے بازو سے پکڑ کر آگے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا

تو وہ منمناتی ہوئی زبردستی آگے بڑھی۔
ابھی وہ دونوں تھوڑا آگے بڑھیں تھیں کہ ایک نسوانی آواز نے انہیں اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ وہ خاتون ایک اچھی خاصی مہنگی پینٹنگ کی قیمت دریافت کررہی تھیں۔
''ارے یہ تو اپنے منظور صاحب کی بیگم عقیلہ آنٹی ہیں۔ یہ یہاں کیسے۔'' ماہا کے قدم اب آگے بڑھنے سے انکاری تھے۔ وہ وہیں رُک کر عقیلہ آنٹی کی کارروائی دیکھنے لگی۔
''یار ماہا ایک تو میں تمہاری اس جاسوسی کی عادت سے تنگ ہوں۔ کیا ضرورت لوگوں کے ہر معاملات پر نظر رکھنے کی۔ عقیلہ آنٹی جو بھی کریں اُس سے ہمیں کیا۔'' علشبہ بے زاری سے سامنے عقیلہ آنٹی کو پینٹنگ خریدتے دیکھ کر بولی۔
''ارے پاگل آج کا زمانہ ایسا ہے کہ کسی نے گلی میں پان بھی تھوکا تو وہ بھی بریکنگ نیوز کے طور پر دنیا بھر میں نشر ہوتی ہے۔ اور میں تو اس گلی کی اتنی اہم شخصیت کی مخبری کررہی ہوں۔ چلو دنیا بھر میں نہ سہی گھر بھر میں تو یہ خبر نشر کرسکتی ہوں ناں کہ روز کاروبار میں نقصان کا رونا رونے والی مسز منظور آرٹ گیلری سے ڈیڑھ لاکھ کی پینٹنگ خریدتی پائی گئیں۔'' وہ شرارت سے ایک آنکھ دباتے ہوئے بولی۔ اسی اثناء میں اُس کے عقب سے آواز گونجی۔
''تم دونوں کی بے تکی حرکتیں ختم ہوگئیں تو اب گھر چلیں۔'' وہ دونوں بیک وقت چونک کر پلٹیں۔ سامنے محسن زمانے بھر کی بے زاری چہرے پر سجائے اُن دونوں سے مخاطب تھا۔
''جی بھائی...... اب چلیں......!'' علشبہ نے فرماں برداری سے کہا تو ماہا بھی سر جھکائے محسن کے معیت میں چل پڑی۔
''بالکل کھڑوس ہے تمہارا بھائی۔'' ماہا نے محسن کی پشت کو گھورتے ہوئے علشبہ کے کان میں سرگوشی کی۔ علشبہ نے فقط اُسے گھور کر تنبیہ کرنے پر اکتفا کیا۔
شازیہ اور روبی اخراجی راستے کے سامنے کھڑیں اُن لوگوں کی منتظر تھیں۔ اُن کے قریب آنے پر وہ سب پینٹنگز پر اظہارِ خیال کرتے گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی ماہا نے مسز منظور والی خبر فوراً نشر کردی۔
''ہائے ڈیڑھ لاکھ کی پینٹنگ...... یعنی محمود بھائی سے کاروبار علیحدہ کرکے بھی اچھا خاصا کمارہے ہیں منظور بھائی۔'' شازیہ بیگم نے خبر سننے کے بعد حیرانگی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔
''چلو جی......! لگادی آگ اس مسینی نے۔'' محسن ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے غصے سے بڑبڑایا۔ یہ الگ بات کسی نے اِس بڑبڑاہٹ کو سُنا نہیں۔
''اور یاد ہے آپا...... اُس دن عقیلہ بھابی ہمارے گھر آئیں تھیں تو کتنا بُرا بھلا کہہ رہی تھیں محمود بھائی کو کہ اُن کے کاروبار علیحدہ کرنے سے انہیں کتنے مشکل اور مالی تنگی سے بھرپور دن گزارنے پڑرہے ہیں۔'' روبی نے بھی شازیہ کی تائید کرتے ہوئے گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا۔ وہ دونوں بہنیں جو جٹھانی دیورانی کے رشتے میں بھی بندھی ہوئیں تھیں اب منظور اور محمود صاحب کی فیملی کے بخیے اُدھیڑنے میں مصروف ہوگئیں۔ جبکہ ماہا اُن دونوں خواتین کو موضوع گفتگو دے کر علشبہ کے ساتھ موبائل میں کھینچی جانے والی تصویریں دیکھنے لگی۔ اور اُن سب کی باتوں سے جھنجھلاتا محسن بیک ویو مرر سے ماہا کو گھورتے ہوئے زیرلب بڑبڑایا۔ ''پوری بی جمالو ہے یہ لڑکی!''

☆......☆......☆

صبح سبزی لیتے ہوئے شازیہ کی ملاقات پڑوس کی روبینہ سے ہوئی۔ باتوں باتوں میں ذکر چل نکلا منظور اور محمود صاحب کے گھرانوں کا۔ ویسے بھی یہ دونوں گھرانے اپنے کشیدہ تعلقات کے بناء پر محلے میں ہاٹ ٹاپک بنے ہوئے تھے۔ شازیہ اور روبینہ کی باتوں کا اختتام شازیہ کے اس جملے پر ہوا تھا۔

''ارے غلط سننے کی تو بات ہی نہیں ہماری ماہا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے۔'' شازیہ نے ماہا کا نام یوں لیا تھا جیسے مبشر لقمان کوئی خاص خبر دیتے ہوئے باوثوق ذرائع کا نام لیتا ہے۔ خبر منتقل کر کے شازیہ تو اپنے گھر چلی آئیں مگر روبینہ کو ابھی گوشت لینے بھی جانا تھا۔ جہاں اُن کی ملاقات عذرا سے ہوئی وہ بھی محلے کی رہائشی تھیں۔ وہاں بھی یہی گفتگو ہوئی اور ختم باوثوق ذرائع یعنی ماہا پر ہوئی۔ اور پھر عذرا بی بی کو پارلر جانا تھا جس کی مالکن محمود صاحب کی پڑوسن اور زوجہ محمود کی سہیلی تھی۔ یوں یہ خبر پارلر کی مالکن مہک سے ہوتی ہوئی محمود صاحب کے گھر تک جا پہنچی۔ جس کا نتیجہ تعلقات میں مزید کشیدگی کی صورت نکلا۔

منظور اور محمود صاحب اس محلے کے قابلِ احترام شخصیات میں سے تھے۔ دونوں بھائی مل کر کاروبار چلاتے تھے۔ اتحاد میں برکت کے مترادف خوب منافع بھی ہوتا تھا۔ پر ابھی کچھ ماہ قبل دونوں گھرانوں میں خوب جھگڑا ہوا۔ نہ جانے کسی کی نظر لگی تھی یا دونوں کی بیگمات کی زبان و دماغ کے جوہر کا کمال تھا کہ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے پر سو طرح کے الزام تراشیوں کے بعد کاروبار علیحدہ کرلیا۔ جس میں سرفہرست الزام یہی تھا کہ محنت میری زیادہ، عیاشی دوسرے کی زیادہ...... مگر ہوا یوں کہ کاروبار میں علیحدگی کے بعد کاروبار سے برکت اُٹھ گئی اور وہ منافع نہ رہا جو ساتھ مل کر حاصل ہو رہا تھا۔ سو دونوں بھائی اکثر محلے میں مالی تنگی کا رونا روتے اور ایک دوسرے کی برائی کرتے پائے گئے۔ ایسے میں مسز منظور مہنگی خریداری جو شازیہ کی بدولت محلے بھر میں عام ہوئی اُس نے جلتی پر تیل چھڑکنے والا کام دیکھایا۔ اور جو دونوں بھائی کے دل اب جا کر ایک دوسرے کے لیے نرم پڑنے لگے تھے۔ ایک بار پھر بدگمانی کی آگ میں جل اٹھے۔

''موسم کتنا خوبصورت ہو رہا ہے ناں۔ یوں لگ رہا ہے ابھی جیسے یہ گھنگھور گھٹائیں برس پڑیں گی۔'' نرم نرم، ہری بھری گھاس پر چہل قدمی کرتے ہوئے اُسے مسرور سے انداز میں علشبہ سے کیا تھا۔

''اللہ کرے برس ہی جائیں آج...... ورنہ روز جھلک دکھلا کر چلے جاتے ہیں یہ بادل......'' علشبہ نے حسرت زدہ نظروں سے بادل کو گھورتے دیکھ کر کہا۔ وہ دونوں آج محلے کاس چھوٹے سے پارک میں آئیں تھیں۔ شام کو اس پہر بچے، بزرگ اور خواتین عموماً یہاں چہل قدمی اور ہوا خوری کے لیے آتے تھے۔ وہ دونوں تصورِ برسات میں کھوئی ہوئی تھیں کہ ٹن سے آ کر علشبہ کے سر سے گیند ٹکرائی۔

''آہ!'' علشبہ نے کراہتے ہوئے اُس سمت دیکھا جہاں سے گیند سے اُس پر حملہ کیا گیا تھا۔ ماہا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''آپی گیند دے دیں۔'' چھوٹے سے گپلو سے بچے نے آ کر اُس سے بڑی معصومیت سے گیند مانگا تھا۔

''ارے تم منظور انکل کے سب سے چھوٹے بیٹے ہو یاں۔ اِدھر میرے پاس بیٹھو پھر بال دوں گی۔'' ماہا کو چھوٹا سا گول مٹول سا یہ بچہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔

''میں نہیں آؤں گا آپ کے پاس، مجھے امی پاپا

نے آپ سے بات کرنے سے منع کیا ہے۔'' وہ بچہ نروٹھے پن سے بولا تو ماہا اور علشبہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں حیرانی سے۔

''کیوں، کیوں منع کیا ہے مجھے بات کرنے سے۔'' ماہا نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''امی کہہ رہی تھیں ماہا کے اندر کسی شر پسند رپورٹر کی روح جا گھسی ہے اُسے کوئی بات پتا چل جائے تو پورے محلے میں جب تک اعلان نہ کروادے اُس کے پیٹ میں مروڑ اٹھتا رہتا ہے۔ اس لیے اس سے دور رہنا۔'' بچے نے من وعن ساری بات کہہ ڈالی۔ اور ماہا کا مارے غصے کے برا حال ہوگیا۔ جبکہ علشبہ کچھ دیر قبل لگنے والی چوٹ بھلائے بری طرح ہنسنے میں مصروف تھی۔

''اچھا اور تمہارے پاپا نے کیا کہا۔'' ماہا کا لال بھبھوکا چہرہ یکسر نظر انداز کیے وہ بچے سے پوچھنے لگی۔

''پاپا نے کہ کہ تمہاری امی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ایسی بی جمالو ٹائپ کی آپیوں سے دور رہا کرو اور گھر کی کوئی بات نہ بتایا کرو۔'' اُس بچے کو بھی شاید ماہا کو چڑانے میں مزہ آرہا تھا۔ تبھی چسکے لیتے بتائے جا رہا تھا۔

''اوئے ماہا...... تم نے تو رات ہی رات میں اچھی خاصی شہرت پالی۔'' علشبہ پیٹ پر ہاتھ دھرے ہنس ہنس کر بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ قبل اس کے ماہا اُس کی پشت پر ایک دھموکہ جڑتی۔ گھنگھور گھٹاؤں نے برسنا شروع کردیا۔ وہ بچہ ماہا کے ہاتھ سے گیند چھین کر رفو چکر ہوگیا۔ ماہا نے غصے سے علشبہ کا ہاتھ تھاما اور تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب چل دی۔

''ارے منہ کیوں سوجا ہوا ہے، گر گئی ہو کیا بارش میں۔'' روبی نے اُن دونوں کے پھولے ہوئے چہرے دیکھ کر فکرمندی سے پوچھا۔

''آپ کو پتا ہے منظور انکل کا بیٹا مجھے کیا کیا کہہ رہا تھا۔'' ماہا نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔

''ہاہ! وہ تو بہت چھوٹا ہے۔ وہ تمہیں چھیڑ رہا تھا کیا۔'' روبی نے حیرت سے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہائے یہ ننھے میاں کے بھی پَر نکل آئے۔ آنے دو محسن کو ذرا، کھنچائی کرواتی ہوں اس بالشت بھر کے لڑکے کی۔'' شازیہ جو ساری روداد کچن میں پکوڑے بناتی سُن رہی تھی۔ وہیں سے غصے سے ہانک لگائی۔

''اُف اللہ! یہ بات نہیں ہے جو آپ لوگ سمجھ رہی ہیں۔ دراصل منظور انکل کا بیٹا ماہا کو شر پسند رپورٹر اور بی جمالو کے القاب سے نواز رہا تھا۔'' علشبہ نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے سارا قصہ سنایا۔

''ہائے ایسا کیوں...... آخر ایسا کیا کردیا میری بچی نے۔'' روبی نے ممتا سے چور جذبات کے ساتھ ماہا کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''میں نے نہیں کیا...... آپ لوگوں نے کیا۔ میں نے تو بس آپ لوگوں کو منظور انکل والی بات بتائی تھی۔ یہ بات پورے محلے میں کیسے پتا چلی۔ بتائیں، بتائیں ذرا مجھے بتائیں۔'' ماہا اچھل کر ماں کی بانہوں سے باہر آئی اور لگی باز پرس کرنے۔

''وہ تو میں نے بس ایسے ہی روبینہ سے ذکر کیا تھا۔ اُس کمبخت نے کیا پورے محلے میں ڈنکا بجوادیا۔'' شازیہ نے اعترافِ جرم کرتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں پورے محلے میں ڈنکا بجوا دیا، وہ بھی میرے نام کا...... کیا آپ لوگوں نے، اور بدنام میں ہو رہی ہوں۔'' ماہا غصے سے منہ پھلائے سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''ہاہ! اب اُس کا تو منہ ہی پھولا رہے گا سارا

دن۔'' روبی افسردگی سے اُسے اوپر جاتا دیکھتے ہوئے بولیں۔
''فکر نہ کرو روبی۔ میں آج آلو بھرے پراٹھے بنارہی ہوں ناں تو دیکھنا جب پتا چلے گا تو کیسے دوڑی ہوئی آئے گی۔'' شازیہ نے ماہا کی ناراضگی کا حل فوراً ہی ڈھونڈ نکالا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ آلو کے پراٹھوں کی خوشبو جیسے ہی پورے گھر میں پھیلی ماہا دوڑتے ہوئے نیچے آگئی۔ گن من بارش کا سلسلہ ابھی بھی جاری تھا۔ گرم گرم پراٹھوں سے انصاف کرنے کے بعد ماہا اور علشبہ بھاپ اڑاتی چائے کا کپ لے کر برآمدے میں بیٹھی بارش کا نظارہ کررہی تھیں۔ صحن میں پڑتی بارش کی موٹی موٹی بوندیں فضا میں سنگیت بکھیر رہی تھیں۔
''کتنی اچھی لگتی ہیں ناں یوں برستی بارش۔'' ماہا نے زمین پر موٹی موٹی بوندوں کے پیالے بنتے دیکھتے ہوئے کہا۔
''ہونہہ! بہت زیادہ!'' علشبہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ باہر سے گاڑی کے ہارن بجنے کی متواتر آوازیں سنائی دی۔ اُن دونوں نے چونک کر گیٹ کی جانب دیکھا۔
''لگتا ہے محسن بھائی آگئے۔'' علشبہ کہتے ہوئے کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ماہا بھی اُس کے ساتھ گیٹ کھولنے چل دی دروازہ کھولتے ہی گاڑی زن سے اندر داخل ہوئی۔
''یہ تمہارا بھائی آج کل کیوں کسی خون آشام بلے کا روپ دھارے پھر رہا تھا۔'' وہ سرگوشی کے انداز میں علشبہ سے بولی۔ محسن گاڑی سے اُتر کر اُن دونوں کی ہی جانب بڑھ رہا تھا۔
''یہ کیوں اتنے خطرناک تیور لیے ہماری طرف آرہے ہیں۔'' علشبہ نے دھیرے سے ماہا سے پوچھا۔ ماہا نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کندھے اُچکا دیے۔
''کیا خبریں تم پورے محلے میں پھیلاتی پھر رہی ہو۔ ہر طرف میں ماہا، ماہا کی گردان سن رہا ہوں۔ اگر تم نے اس دن ایگزیبیشن میں مسز منظور کے حوالے سے کچھ جان بھی لیا تھا تو اِس کا ڈھنڈورا پورے محلے میں لپیٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ جانتی ہو تمہاری اس حرکت سے کتنی بدنامی ہورہی ہے ہمارے گھر کی۔ ابھی منظور انکل ملے تھے۔ خوب شکایتیں کر رہے تھے کہ تمہاری وجہ سے اُن کے اور محمود صاحب کے اختلافات مزید بڑھ گئے ہیں۔'' محسن اُس کے قریب آتے ہی برس پڑا۔ وہ پہلے تو پل بھر کے لیے حیران رہ گئی پھر اپنی وضاحت کے لیے کئی بار لب کھولنے کی کوشش کی مگر محسن کو گرجتا برستا دیکھ کر کچھ کہہ نہ پائی۔
''ماہا کا قصور نہیں ہے بھائی!'' علشبہ نے حقیقت بتانے کے لیے لب کشائی کی۔
''چپ بالکل چپ...... ایک لفظ بیچ میں نہ بولنا تم...... تمہاری شہہ پر یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی رہتی ہے اور سُننا پورے گھر کو پڑتا ہے۔ اِسے سمجھ میں آنا چاہیے کہ یہ اب کوئی بچی نہیں رہی، بڑی ہوچکی ہے۔ قصور اس کا بھی نہیں ہمارے گھر کے بڑوں کا ہے جنھوں نے اسے بے جا چھوٹ دے رکھی ہے۔'' علشبہ کو خاموش کرا کر محسن بڑی بے دردی سے ماہا کے عزتِ نفس کی دھجیاں اُڑا رہا تھا۔ ذلت کے احساس سے سرخ پڑتا چہرہ لیے وہ بناء کچھ کہے اپنے کمرے میں آگئی۔
''بھائی اگر آپ کی زبان اتنی کڑوی ہے تو اس کا استعمال صحیح جگہ پر کیا کریں۔ ادھورا سچ جان کر کسی کی ذات کو لفظوں سے سنگسار کرنا کوئی قابل تعریف عمل نہیں۔ اور آپ کی معلومات میں اضافہ کرتی چلوں۔ حقیقت یہ ہے کہ محلے میں اس خبر کا ڈھنڈورا پیٹنے کی

غلطی ماہا سے نہیں ہماری امی سے سرزد ہوئی۔ ویسے منظور انکل کو بھی لگے ہاتھوں یہ مشورہ دینا چاہیے تھا کہ آپ کو کہ گھر میں لاکھوں کا سامان بھر کر محلے بھر میں کاروبار کے نقصان کا ڈھنڈورا نہیں کرتے۔''
علشبہ جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی۔ اُسے آج شدت سے بھائی کے لہجے کی کڑواہٹ اور لفظوں کی تلخی محسوس ہوئی تھی۔ ماہا نٹ کھٹ اور چنچل ضرور تھی مگر کبھی اُس نے کوئی غلط حرکت کی تھی، نہ ہی حدود سے باہر گئی تھی۔ وہ کچھ دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ محسن کا رویہ ماہا کے ساتھ کافی ہتک آمیز سا تھا۔ یوں تو ویسے ہی محسن اور ماہا کی کم ہی بنتی تھی۔ مگر جو انداز آج اُس نے اپنایا تھا وہ علشبہ کو بھی برا محسوس ہوا تھا۔ علشبہ کے جاتے ہی محسن نے بھی سر جھٹک کر اپنے قدم گھر کے اندر کی جانب بڑھا دیے پر سامنے ہی اُسے شازیہ کی ملامتی نظروں کا سامنا کرنا پڑا۔ غالباً انہوں نے اُس کی ساری باتیں سُن لیں تھیں۔ وہ اُن سے نظریں چراتا آگے بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

وہ غسل کے بعد خود کو کافی تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس تازگی میں کچھ عمل دخل ماہا کی عزت افزائی سے حاصل ہونے والی راحت کا بھی تھا۔ وہ آرام کی غرض سے ابھی بستر پر دراز ہوا ہی تھا کہ شازیہ بسکٹ اور چائے کی ٹرے سنبھالے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اُن کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ کھنچائی کا ارادہ صاف نظر آ رہا تھا۔ شازیہ اُس کے سامنے بیٹھتے ٹرے بستر پر رکھتے ہوئے سرد لہجے میں مخاطب ہوئیں۔
''تم نے صرف اس لیے ماہا سے یہ نامناسب رویہ روا رکھا کیونکہ ہم تمہاری شادی اُس سے کروانا چاہتے ہیں۔ بولو یہی بات ہے ناں۔'' اُن کی بات پر وہ نظریں چرا گیا۔

شاید تمہیں لگتا ہو کہ تم شہزادہ گلفام ہو اسی لیے ہم سب تمہاری شادی ماہا سے کروانے کے لیے تُلے ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے یہ میری اور تمہارے بابا کی خواہش تھی کیونکہ ہم سمجھتے تھے کہ تم جیسا اکھڑ مزاج انسان صرف ماہا جیسی نرم مزاج، سمجھدار سب کا خیال رکھنے والی لڑکی سے ہی سنبھل سکتا ہے۔ مگر آج تمہارے رویے نے ہمیں یہ قدم اٹھانے سے بچالیا۔ ورنہ ہم ظفر اور روبی سے آج اس سلسلے میں بات کرنے والے تھے۔ مگر جیسے تم ہمیں عزیز ہو ویسے ہی ماہا بھی ہمیں عزیز ہے اور اب تم بے فکر رہو تم سے ماہا کا رشتہ کرنے کے حق میں اب ہم بالکل نہیں ہیں۔ تم بتا دو اپنی نیلم کو کہ ہم تم دونوں کا رشتہ کرنے لیے تیار ہیں۔'' یہ سب کہہ کر شازیہ وہاں رُکی نہیں۔ فوراً کمرے سے نکل گئیں۔ اور محسن جو کھنچائی کے ڈر سے الرٹ ہو کر بیٹھا تھا۔ آزادی کا پروانہ ملتے ہی اپنے جذبات پر بامشکل قابو پاتے ہوئے نیلم کو کال کرنے لگا۔
''ہماری دعائیں رنگ لے آئیں نیلم امی اور بابا ہماری شادی کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔'' وہ اب نیلم کو خوشی خوشی یہ مژدہ سنا رہا تھا۔ کچھ دن قبل جب اُس نے شازیہ سے نیلم کے گھر رشتہ بھیجنے کی درخواست کی تو انہوں نے صاف انکار کے ساتھ ماہا اور اُس کی شادی کے ارادے کا اظہار کیا۔ جس پر احتجاج کرتا وہ واک آؤٹ کر گیا۔ اُس دن سے اُس نے ماہا کے ساتھ اپنے تعلقات بھارت کی طرح کشیدہ کر دیے تھے۔ بات بات پر مشتعل ہونا اور اشتعال انگیزی سے جواب دینا اُس کا معمول بن گیا تھا۔ اُس کا یہ انتہائی ردِعمل دیکھ کر شازیہ اور غضنفر کو اُس کے آگے ہار مانتے ہی بڑی۔ اور اب وہ اپنی جیت پر نیلم کے ساتھ خوب لمبی بات کر کے جشن منا رہا تھا۔ اور بند دروازے کے پیچھے کان لگائے

اُس کی کھسر پھسر سنتی شازیہ منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دل ہی دل میں اعلانِ جنگ کا طبل بجاری رہی تھیں۔

''خوش ہو جا میرے بچے...... تمہاری محبت کی تو میں ایسی کی تیسی کر کے رہوں گی۔''

☆......☆......☆

شازیہ اس گھر کی بڑی بہو تھیں۔ زبیدہ بیگم بڑے چاؤ سے غفنفر کی دلہن انہیں بنا کر لائیں تھیں۔ شازیہ نے بڑی بہو کی حیثیت سے گھر کو بنا سنوار کر رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ فطرتاً گھر جوڑ کر رکھنے والی خاتون واقع ہوئیں تھیں۔ اُن کے اچھے اخلاق اور فطرت سے متاثر ہو کر زبیدہ خاتون نے اپنے چھوٹے بیٹے کی شادی شازیہ کی چھوٹی بہن سے طے کر دی تھی۔ روبی بھی بڑی بہن کے نقشِ قدم پر چلیں اپنے اخلاق سے سب کا دل جیتتی چلی گئیں۔ زبیدہ خاتون جب تک زندہ رہیں انہوں نے بہوؤں سے خوب ہی سکھ پایا۔ اُن کے گزرنے کے بعد بھی شازیہ نے بڑی بہو کی حیثیت سے خوش اسلوبی کے ساتھ گھر چلایا۔ ہر گھر کی طرح یہاں بھی چھوٹی موٹی تکرار انگڑائیاں لیتیں۔ مگر شازیہ اپنی سمجھداری سے اس تکرار کو تھپک تھپک کر سلا دیتیں۔ شازیہ کو اللہ نے دو بچوں محسن اور علشبہ سے نوازا تو روبی ماہا کے بعد کچھ پیچیدگیوں کے باعث دوبارہ ماں نہ بن سکیں۔ محسن اس گھر کا سب سے پہلا اور لاڈلا بچہ تھا۔ اُس کے ڈھائی سال کے بعد روبی کی گود میں ماہا نے آنکھیں کھولیں۔ اور تب سے ہی محسن، ماہا کا جانی دشمن بن گیا۔ ماہا کے ڈیڑھ سال کے بعد علشبہ کی پیدائش ہوئی۔ جوں جوں بچے بڑے ہوتے گئے اِن کے مزاجوں سے گھر والے بھی آشنا ہوتے چلے گئے۔ محسن تک چڑھا اور اکھڑ مزاج واقع ہوا تھا۔ جبکہ ماہا نرم مزاج اور سب کا خیال رکھنے والی علشبہ اور ماہا میں خوب بنتی تھی۔ دونوں سگی بہنوں کی طرح رہتیں البتہ محسن اور ماہا کی بالکل نہ بنتی تھی اور اس میں زیادہ تر ہاتھ محسن کا ہی ہوتا۔

بچوں کے بڑے ہونے کے ساتھ ہی شازیہ کے دل میں محسن اور ماہا کی شادی کرانے کی خواہش جاگی۔ اس کا خیال انہوں نے اپنے شوہر غفنفر سے کیا تو وہ بھی اس خیال سے متفق دکھائی دیے۔ شازیہ اور غفنفر جانتے تھے کہ بیٹا نہ ہونے کی کسک ظفر اور روبی کے دل کو آج بھی ٹیس پہنچاتی ہے۔ اور پھر ماہا اُن کی دیکھی بھالی لڑکی تھی اچھا ہے کہ اُن کے سامنے رہتی اُن کی بہو بن کر۔ بس یہی سوچ کر انہوں نے محسن سے اس سلسلے میں بات کر ڈالی مگر وہ ماہا کا نام سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا اور محلے کے نکڑ والے بنگلے کے رہائشی عظیم صاحب کی بیٹی نیلم سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ نیلم کا نام سنتے ہی شازیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ نیلم سے محلے کی ہی کسی تقریب میں اُن کی ملاقات ہوئی تھی اور وہ تیز طرار سی لڑکی انہیں ذرا نہ بھائی تھی۔ نیلم سے رشتہ مسترد کر کے شازیہ نے ماہا سے رشتہ کرنے کا عندیہ دے دیا۔ اور اُس دن سے محسن نے انتہائی بُرا رویہ ماہا کے ساتھ روا رکھا ہوا تھا۔ قبل اس کے کہ اس بات کی بھنک روبی اور ظفر کو ہوتی اور اُن کے دل خراب ہوتے شازیہ نے محسن کی بات وقتی طور پر مان لینے میں ہی بہتری جانی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دل ہی دل میں نیلم کا مکمل طور پر پتا کاٹنے کے لیے منصوبہ بنانے لگیں تھیں۔

''سردیوں کی آمد آمد تھی۔ اور اس بار سردی پڑنے کے آثار نظر بھی آرہے تھے۔ اس لیے وہ چاروں آج گرم کپڑوں کی شاپنگ کے سلسلے میں مال آئیں تھیں۔ خریداری کے بعد بھوک سے نڈھال ہوتے ہوئے ان سب نے فوڈ کارنر کا رُخ

کیا۔ علشبہ اور ماہا تو چاچا جی کی تھالی آرڈر کرنے چلی گئیں۔ شازیہ اور روبی وہیں بیٹھیں باتیں کرتی رہی تبھی شازیہ کی نگاہ کچھ فاصلے پر ایک اجنبی لڑکے کے ساتھ بیٹھی نیلم پر پڑی۔ شازیہ ٹھٹھک کر اُسے دیکھنے لگیں۔ جس لڑکی کو اُن کا بیٹا اُن کے گھر کی زینت بنانا چاہتا تھا وہ سرعام کسی اجنبی مرد کے ساتھ زمانے بھر میں گھوم رہی تھی۔ غصے کی شدید لہر اُن کے رگ وپے پر دوڑ گئی۔ نیلم کے انداز واطوار اُس اجنبی لڑکے کے ساتھ کچھ 'اور' ہی مراسم کے چغلی کھا رہے تھے۔

''شازیہ بیگم تم اتنے دنوں سے نیلم کے ساتھ محسن کا تعلق ختم کرنے کے مواقع تلاش کر رہی تھیں۔ لو اب مل گیا موقع۔'' دماغ نے جھٹ سے راہ سجھائی اور شازیہ جلدی جلدی منصوبے کے تانے بانے بننے لگیں۔ گھر آ کر انہوں نے سب سے پہلے علشبہ کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے اُسے محسن اور ماہا کو لے کر اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ پھر محسن کی نیلم سے اندھی محبت کا بھانڈا پھوڑا اور آج تازہ تازہ مال سے دیکھا احوال سنا کر مدد کرنے کی درخواست کی۔ بھائی کی ساری کارستانی سن کر علشبہ سوچ میں پڑ گئی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اُس نے اِس مشن میں ماہا کو ملانے اور شازیہ کی ہدایت کے مطابق محسن اور ماہا کو لے کر اُن کے ارادے کو پوشیدہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ شازیہ محسن علشبہ کے حوالے کر کے اب مطمئن تھیں۔

''میں تمہارے اس کھڑوس بھائی کے لیے کچھ بھی کرنے والی نہیں۔'' ماہا نے علشبہ کی بات سُن کر صاف انکار کر ڈالا۔

''ایسے نہ کہو ماہا۔ تم میرا ساتھ نہ دو گی تو وہ تیز طرار، چلتر نیلم بھائی کی بیوی بن کر ہمارے گھر آ جائے گی۔ اور پھر سوچو کیا ہوگا گھر میں۔ وہ نیلم بھائی کے کان بھرے گی۔ ہمارے خلاف اور بقول تمہارے میرا کھڑوس، کان کا کچا بھائی اُس کی باتوں میں آ کر ہم پر سختی کرے گا۔ 'ہمارا جینا محال کر دے گا اور تو اور کچھ بعید نہیں کہیں وہ ہماری والداؤں کو نہ لڑوا دے...... اللہ اللہ! اُس کے آنے سے ہمارا پیارا گھر اجڑ کر رہ جائے گا۔'' علشبہ نے بڑے جذباتی انداز میں مستقبل کے حالات کی منظر کشی کی اُس نے ایک پل کو تو ماہا کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔

''اچھا اچھا...... اب بس کرو یہ رونا...... بتاؤ کیا کرنا ہے تمہارے بھائی کو اس چڑیل سے بچانے کے لیے۔'' ماہا نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے ایک ادائے شانِ بے نیازی سے کہا۔

''سیانے کہتے ہیں، دشمن کو زیر کرنے کے لیے پہلے اُس کے دوستوں کو جال میں پھنسا کر اُس کی کمزوریاں اگلواؤ۔'' علشبہ نے کسی نامعلوم سیانے کا حوالہ دیا۔

''اور یہ کون سے سیانے کہتے ہیں۔'' ماہا نے بھنوئیں سیکڑ کے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جیسے کہ...... میں۔'' بڑی ادا سے راز فاش کیا تھا علشبہ بی بی نے۔

''ہونہہ...... سیدھا سیدھا بتاؤ کہ کرنا کیا ہے۔'' ماہا اُس کے سیانے پن کو چٹکی میں اڑاتی اصل مدعے پر آ گئی۔

''دیکھو نیلم کی سب سے عزیز ترین سہیلی نرگس ہے۔ یقیناً اُسے نیلم کے سارے راز بھی معلوم ہوں گے۔ تو ہمیں اُسے شیشے میں اُتار کر ساری باتیں بمع ثبوت کے ساتھ اگلوانی ہیں۔ پر مسئلہ یہ ہے کہ سمجھ نہیں آ رہا کہ نرگس کو شیشے میں کیسے اُتاریں۔'' علشبہ نے پلاننگ کے ساتھ ساتھ اپنی مشکل بھی بیان کی۔

''یہ تو کوئی مشکل ہی نہیں۔ نرگس کی دو ہی کمزوریاں ہیں ایک شاپنگ اور دوسرا ہوسٹنگ، ہم

اُس کے دونوں ہی شوق پورے کروا دیں گے اور بدلے میں باتوں ہی باتوں میں سارے راز اُگلوا لیں گے۔ کیسا......؟'' ماہا نے چٹکیوں میں مسئلہ حل کر کے علشبہ کو استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل پرفیکٹ...... پھر آج ہی امی کو آگاہ کرتی ہوں اس تجویز سے۔'' ماہا نے اوکے کرتے ہوئے جواب دیا۔

شازیہ کو یہ منصوبہ بے حد پسند آیا۔ سو جھٹ سے ڈھائی ہزار پرس سے نکال کر اُن کے ہاتھ میں رکھ دیے اور لگیں کہنے۔

''خوب اچھے سے شاپنگ کرانا نرگس کو، جی بھر کے خوش کر دینا اُسے تاکہ ساری مطلب کی بات اُگل دے۔ دیکھو کہیں کم تو نہیں پڑیں گے پیسے...... اچھا ایسا کرو یہ بھی لے لو۔'' شازیہ مارے خوشی کے پھولے نہ سما رہی تھیں۔ اور جذبات میں آ کر مزید ڈیڑھ ہزار علشبہ کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ دونوں سب سے پہلے نرگس کے گھر گئیں اور شاپنگ پہ چلنے کی درخواست کی۔ جیسے نرگس نے بے حد خوشی کے ساتھ قبول کر لیا۔ مال پہنچ کر انہوں نے نرگس کو آزاد چھوڑ دیا۔ موصوفہ مروت کرتے ہوئے فقط پرفیوم، کاسمیٹکس اور جیولری کی خریداری کی بس ایک بار مروتاً پوچھ لیا کہ مجھ پر اتنی مہربانی کیوں......؟ جس پر ماہا نے بڑے پیار سے کہا۔

''ہم آپ کو اپنی بہن سے کم تھوڑی نہ سمجھتے ہیں جو ہم نے لیا، وہ آپ کے لیے بھی لیا۔'' نرگس اللہ جانے مطمئن ہوئی اس بات سے یا نہیں البتہ اپنی پسند کی شاپنگ خوب کی اگلا مرحلہ ہوسٹنگ کا تھا تو میکڈونلڈ پہنچ کر اُن تینوں نے برگر آرڈر کیا اور بیٹھ گئیں۔

''ارے نرگس آپ کی دوست نیلم کا کیا خیال ہے۔ آج کل نظر نہیں آ رہیں آپ کے ساتھ۔'' ماہا نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''ارے وہ...... اُس کا تو نہ ہی پوچھو حال...... چار بوائے فرینڈ بنائے ہوئے ہیں اُس نے، ایسے میں دوست کہاں یاد رہے گی اُسے۔'' نرگس نے پہلے ہی سوال پر سب سے بڑا راز فاش کر ڈالا۔ اُن دونوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''نرگس آپ تو اتنی اچھی باکردار لڑکی ہیں پھر آپ اُسے سمجھاتیں نہیں کہ یہ حرکتیں نہ کرے۔'' علشبہ نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

''ارے یار کیا بتاؤں۔ اُس کی اپنی حرکتوں سے تنگ آ کر تو میں نے دوستی کم کر دی ہے اُس سے۔ بس کبھی کبھی فون آ جاتا ہے اُس کا۔ اپنے دوستوں کے تحفے تحائف کے بارے میں بتاتی رہتی ہے اور میرا دل جلاتی رہتی ہے۔'' نرگس نے بھی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ ہی لیے۔ ماہا علشبہ کو اشارہ کر کے اپنا آرڈر لینے کاؤنٹر پر چلی گئی۔

''دراصل نرگس بات یہ ہے کہ یہ بردار نیلم ہمارے بھائی کے بھی پیچھے پڑ گئی ہے۔ اور بھائی اُس کے لیے گھر میں محاذ کھولے بیٹھا۔ پر آپ خود بتائیں کیا ہمارے خوبرو، اسمارٹ اور وفا شعار بھائی کے لیے نیلم جیسی بدکردار لڑکی رہ گئی ہے۔ سمجھ نہیں آ رہا اب کیا کریں کیسے جان چھڑائیں۔ آپ ہماری کچھ مدد کر سکتی ہیں تو بتائیں۔ علشبہ نے خود پر مظلومیت طاری کرتے ساری داستان سنائی۔

''اوہ یہ بات ہے تبھی تم لوگ مجھے یہاں گھمانے، پھرانے، کھلانے، پلانے لائے ہو۔'' نرگس ایک پل میں معاملے کی گہرائی میں جا پہنچی۔ سو بدمزا سی ہو کر بولی۔ علشبہ زنگر برگر اور فرائیز سے بھری ٹرے وہاں لے کر پہنچی تو بات بگڑتی دیکھ کر فوراً بولی۔

''نہیں، نہیں یہ بات نہیں ہے۔ دراصل ہم دونوں کی نظر میں آپ سے زیادہ عقلمند سمجھدار لڑکی محلے میں کوئی نہیں۔ اس لیے آپ سے مشورہ لینے کے لیے ہم یہاں مال لے کر آئے۔ آپ دیکھیں ناں ایسی باتیں گھر پر تو نہیں ہوسکتی ہیں ناں۔ سنا نہیں آپ نے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ بس اسی لیے ہم یہاں آئے کہ ہلکی پھلکی شاپنگ اور ہوسٹنگ کے ساتھ یہ مسئلہ بھی آپ سے ڈسکس کرلیں گے۔'' ماہا نے بڑے سبھاؤ سے بات کی علشبہ اس کی ذہانت پر عش عش کراٹھی اور نرگس متفق دکھائی دینے لگی۔

''ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ اچھا کہو کیسی مدد چاہیے تم لوگوں کو۔'' کرسپی زنگر کا بڑا سا بائٹ لیتے ہوئے۔ نرگس نے اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے آمادگی کا اظہار کیا۔ ماہا اور علشبہ پُر جوش سی اُسے مزید تفصیل بتانے لگیں۔

''ہونہہ ٹھیک ہے۔ میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔ نیلم نے بتایا تھا کہ چند دنوں بعد وہ اپنے ایک 'خاص' دوست سے ملنے جائے گی۔ میں اُس سے باتوں باتوں میں وقت اور جگہ اگلوالوں گی اور پھر تم لوگوں کو بتادوں گی۔ پھر تم لوگ اپنے بھائی کو لے کر وہاں پہنچ جانا اور نیلم کو وہاں رنگے ہاتھوں پکڑ لینا۔ یوں تم لوگوں کا کام بھی ہوجائے گا اور نام بھی نہیں آئے گا۔'' نرگس نے چٹکی بجاتے ہوئے تجویز دے ڈالی۔ ماہا اور علشبہ کو اُس کی یہ تجویز پسند آئی۔ سو منصوبہ طے پا گیا کہ نرگس اطلاع ملتے ہی انہیں آگاہ کرے گی۔ گھر آکر ماہا اور علشبہ نے یہ ساری معلومات شازیہ کے آگے رکھ دی۔ شازیہ نے فیصلہ کیا کہ نرگس کی بتائی گئی جگہ پر وہ خود ہی محسن کو لے کر جائے گی۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اُس رات کو ہی نرگس نے پیغام پہنچا دیا تھا کہ نیلم کس وقت اور کہاں ملنے والی ہے۔ نرگس اپنا کام کر چکی تھی اب انہیں اپنا کام کرنا تھا۔

انہوں نے دن میں ہی محسن کو کال کر کے جلدی گھر آنے کا کہہ کر نیلم کے لیے کچھ خاص خریداری کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ نیلم کا نام سن کر محسن مقررہ وقت سے قبل ہی بھاگا بھاگا گھر آ پہنچا تھا۔ علشبہ اور ماہا اُس کی بے قراری دیکھ کر ایک دوسرے کو معنی خیز مسکراہٹ سے نواز رہی تھیں۔

مطلوبہ مال میں پہنچ کر شازیہ نے محسن کی پسند سے ایک انتہائی خوبصورت سا لباس خریدا۔ باتوں باتوں میں وہ محسن کو اچھی طرح باور کرا چکی تھیں کہ اس عید تک وہ اس کی اور نیلم کی باقاعدہ رسم ادا کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ محسن کے تو دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ شاپنگ مکمل ہونے کے بعد وہ شازیہ کی فرمائش کے مطابق اُن کے مطلوبہ ریسٹورنٹ میں لے آیا۔ ریسٹورانٹ میں داخل ہوتے ہی شازیہ نے بے صبری سے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور بے چینی سے دوسرے فلور کی سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ محسن وقفے وقفے سے موبائل پر میسج کرتا اور پھر جواب کا انتظار کرتا اُن کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

''بتا دیا تم نے نیلم کو کہ اُس کے لیے ہم نے سوٹ خریدا ہے۔'' سیڑھیاں چڑھتی شازیہ نے سادہ سے انداز میں پوچھا۔

''جی امی!'' وہ کہہ رہی آپ کی امی نے اتنی محبت سے خریدا ہے تو بہت پیارا ہوگا۔'' محسن نے شرمیلی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے بولا۔

''ہونہہ، اِس کے لیے خریدوں گی بڑے پیار سے۔'' شازیہ زیرِ لب بڑبڑائی گلاس ڈور کو دھکیلتی اندر داخل ہوئیں۔ اوپر کا ہال بھی لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ شازیہ نگاہیں سکیڑے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

''چلیں امی! اس طرف میز خالی ہے وہاں بیٹھتے ہیں۔'' محسن نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پر شازیہ نے اُس کے ساتھ چلنے کے بجائے اُس کا ہاتھ تھام کر اپنی جانب کھینچا۔

''ارے محسن دیکھنا ذرا...... یہ لڑکی نیلم جیسی نہیں لگ رہی۔'' شازیہ نے کچھ فاصلے پر نیلم کو اُسی لڑکے کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ محسن اُن کی بات پر ٹھٹھک کر دیکھنے لگا۔ اُس لڑکی کے دائیں طرف کا آدھا حصہ اُن دونوں کی جانب واضح تھا۔ محسن کو بھی اُس لڑکی پر نیلم ہونے کا شائبہ ہوا۔ شازیہ اُس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے اس لڑکی کی جانب بڑھیں۔

''تمہیں کیا بتاؤ عامر...... میرے بابا کتنے ظالم ہیں۔ زبردستی میری شادی میرے محلے کا ایک اَن پڑھ، گنوار قسم کے لڑکے سے کرا رہے ہیں۔'' اِس سے قبل وہ دونوں اُس لڑکی کے سر پر پہنچتے۔ اُس کی آواز اُن کی سماعتوں سے ٹکرائی اور قدم خود بخود رُک گئے اور جسم کا رواں رواں مزید باتیں سننے کو بیدار ہوگیا۔

''نیلم تم انکار کردو اِس شادی سے۔ دیکھو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسا کرتے ہیں ہم کہیں بھاگ چلتے ہیں۔'' اُس عامر نامی لڑکے نے فرطِ جذبات کے عالم میں کہا تو محسن کے کان مزید کھڑے ہوگئے۔ وہ اور شازیہ نیلم کے عقب میں کھڑے تھے۔ اس لیے اب تک اُس کا چہرہ دیکھ نہیں پائے تھے۔

''نہیں عامر میں مشرقی لڑکی ہوں۔ میں اُس چرسی، شرابی سے شادی کرلوں گی مگر اپنے والدین کی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔'' اس بار نیلم کی آواز کافی واضح تھی۔ محسن کو اک لمحہ لگا پہچاننے میں۔ وہ اچانک سے اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اُسے یوں سامنے پا کر نیلم کے ہاتھوں کے تو طوطے ہی اُڑ گئے۔

''تم...... یہاں...... اچانک......!'' لفظ اُس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

''ہاں...... میں...... یہاں...... اچانک......!'' محسن نے دانت کچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

''ایکسکیوزمی مسٹر...... آپ کی تعریف!'' عامر نے اُن دونوں کے بیچ میں ٹانگ اڑائی۔

''میں وہی جاہل، گنوار، چرسی، شرابی جس سے اِن محترمہ کی شادی ہونے والی تھی جو کہ اب قطعی نہیں ہوگی۔'' محسن نے ایک ایک لفظ چبا کر اُن دونوں کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ شازیہ بامشکل اپنی مسکراہٹ چھپائے خاموش تماشائی بنی یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں۔

''نیلم یہ کیا کہہ رہا ہے...... کون ہے یہ!'' عامر نے گھبرا کر نیلم سے پوچھا جس کے اپنے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھی۔ اِرد گرد کے لوگ بھی اب اُن کی جانب متوجہ ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ایک تیز طراری آنٹی تو شازیہ کے برابر میں آ کھڑی ہوئیں اور اُن سے لگیں معاملہ دریافت کرنے۔

''ہائے کیا بتاؤں بہن، میری ہونے والی بہو ہے۔ کم بخت منگنی سے پہلے ہی میرے بچے کو دھوکہ دے گئی۔'' شازیہ نے بلند آواز میں موقع دیکھ کر چوکا لگایا۔ جس کے نتیجے میں غیرت کے مارے لال پیلا ہوتا محسن اپنی انگلی سے ایک ننھی سی انگوٹھی اُتار کر میز پر پٹختا ہوا بولا۔

''یہ لو مکار عورت اپنی محبت کی نشانی۔'' یہ کہہ کر اگلے ہی پل اُس نے نیلم کے ہاتھ سے اُس کا مہنگا سا موبائل سیٹ جھپٹ لیا۔ ''اور واپس کرو میری محبت کی نشانی۔'' شازیہ یہ منظر دیکھ کر غش کھا کر گرتے گرتے بچی۔ یعنی برخوردار ٹھیک ٹھاک اس چلتر لڑکی

پر اپنا پیسہ برباد کر چکے تھے۔ محسن اُن کا ہاتھ تھامے لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے جانے لگا۔ جاتے جاتے شازیہ نے ایک بار پلٹ کر نیلم کو دیکھا۔ عامر بھی اُس پر برس رہا تھا اور آس پاس کھڑے لوگ تمسخر آمیز نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکی کی اِس سے زیادہ بے عزتی اُن سے دیکھی نہ گئی۔ وہ خود ماں تھیں اور بیٹی والی تھیں۔ مگر نیلم جیسی لڑکیاں اپنے لیے ذلت کا یہ راستہ خود چنتی ہیں۔ گھر آ کر چہرے پر بارہ بجائے شازیہ نے ماہا اور علشبہ کو چپکے سے وکٹری کا سائن بنا کر دکھاتے ہوئے فتح کی خبر پہنچائی۔ محسن اگلے تین دن تک نیلم کے دھوکے کا غم مناتا رہا۔ وہ تو مزید مناتا اگر تیسری غم کی رات شازیہ اُس کے کمرے میں جا کر اُسے آڑے ہاتھوں نہ لیتیں۔

''واہ واہ میاں محسن۔ محبوبہ کے دھوکے کے غم سے فرصت مل گئی تو اب کچھ کام کی بات بھی کر لیں یا ابھی اُس ناہنجار لڑکی کے جدائی کے غم میں اور ٹسوے بہانا ہے۔'' ماں کی دھاڑ نے محسن کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

''جی امی...... کہیں! کیا کام کی بات کرنی ہے۔'' وہ مؤدب سا بن کر بیٹھ گیا۔

''دیکھو برخوردار...... تم نے اپنی ضد ہم سے منوائی اور اُس کا نتیجہ دیکھ لیا۔ اب سیدھی سی بات ہے گھر کی بچی ماہا ابھی بھی تمہارے سامنے ہے۔ ہم سب اُس کی فطرت و کردار سے بخوبی واقف ہو۔ تو کہو اب کیا ارادہ ہے۔'' شازیہ نے کڑے تیوروں کے ساتھ اُس سے پوچھا۔

''جیسے آپ کی مرضی امی! مجھے ماہا سے شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔'' انتہائی معصومانہ انداز میں جواب سامنے آیا۔ کچھ دیر تک تو خود شازیہ کو بھی یقین نہ آیا۔ انہیں بے یقین سا دیکھ کر جب یہی الفاظ محسن نے دوبارہ دہرائے تب یقین آیا۔

شازیہ شادیٔ مرگ کی سی کیفیت میں اُٹھ کر کمرے سے باہر غضنفر کو یہ خوشخبری سنانے گئیں تھیں۔ اُن کے جاتے ہی محسن افسردگی سے ساتھ پڑے موبائل کو دیکھنے لگا۔ اس کا یا پلٹ میں اس موبائل کا ہی تو سارا ہاتھ تھا۔ اگر وہ اس میں موجود نیلم کے میسجز، ویڈیوز نہ دیکھ لیتا تو اب بھی ماہین کی قدر نہ کر پاتا۔ یہ وہی موبائل تھا جو وہ نیلم سے جھپٹ کر لایا تھا۔

''مگر مجھے اعتراض ہے اس شادی پر۔ مجھے تمہارے عاشق مزاج دل پھینک بھائی سے شادی نہیں کرنی۔'' وہ جوالہ مکھی بنی شعلہ بار نگاہوں سے علشبہ کو گھورتی سانپ کی طرح پھنکاری تھی۔

''میرا بھائی کوئی دل پھینک عاشق نہیں ہے۔ وہ تو بس اُس چالباز نیلم کے جال میں پھنس گیا تھا۔'' علشبہ کی طرف سے محسن کے لیے ایک کمزور سا دفاع سامنے آیا۔

شازیہ اور غضنفر نے روبی اور ظفر سے محسن کے لیے باقاعدہ رشتہ مانگا تھا۔ روبی اور ظفر کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ بلکہ وہ تو یہ سوچ کر بے حد خوش تھے کہ اُن کی بیٹی شادی کے بعد بھی اُن کی نظروں کے سامنے رہے گی۔ روبی، محسن اور نیلم والے معاملے سے بخوبی آگاہ تھیں۔ اور یہ بھی اچھی طرح جانتی تھیں کہ نیلم کے عشق کا بھوت اب محسن کے سر سے اتر چکا ہے۔ اتنا تو وہ بھی جانتی تھیں کہ محسن کردار کا کچا نہیں اور ماہا سے شادی کے لیے خود راضی ہوا ہے۔ پر مسئلہ اب یہ تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ محسن اور ماہا کے تعلقات پاک بھارت تعلقات سے مماثلث رکھتے تھے۔ چنانچہ بہت سوچ سمجھ کر ماہا کی رائے اس رشتے پر جاننے کی ذمہ داری علشبہ کو سونپی گئی اور اسی ذمہ داری کو نبھانے کے چکر میں آج علشبہ کو ماہا کی کھری کھری سننے کو مل رہی تھی۔

''ہاں تمہارا بھائی تو دودھ پیتا بچہ ہے ناں جو نیلم کے جال میں پھنس گیا۔ تم سب نے دھوکہ دیا ہے مجھے۔ میری پشت پر خنجر گھونپا ہے۔ اگر مجھے ذرا بھی خالہ جان کے ارادوں کی بھنک پڑتی ناں تو قسم سے میں نیلم کی شادی تمہارے بھائی سے کروا کر دم لیتی۔'' ماہا ملکہٗ جذبات کا روپ دھارے جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی۔ اُسے شدت سے وہ پل یاد آنے لگا جب محسن نے اُسے بناء غلطی جانے بے بھاؤ کا سنایا تھا۔

علشبہ کو ماہا کی جانب سے اسی جواب کی امید تھی۔ سو انکار بڑوں تک پہنچا کر افسردہ سی ہو بیٹھی۔ دل میں تو اُس کے بھی خواہش تھی کہ ماہا اُس کی بھابی بنے۔

''کوئی نہیں بچی ابھی ذرا غصے میں ہے۔ تھوڑا وقت دو۔ دیکھ لینا اقرار ہی کرے گی ماہا۔'' شازی نے انکار سن کر بے فکری سے جواب دیا۔ روبی بھی اُن کی بات سے متفق ہوتی اثبات میں سر ہلا گئیں۔ پر یہ انکار کی خبر جونہی محسن تک پہنچی وہ افسردہ ہوتا شازیہ اور روبی کے پاس جا پہنچا۔

''کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں جو ماہا مجھ سے شادی سے انکار کر رہی ہے۔'' وہ شکوہ کناں انداز میں بولا۔

''تم تو نہیں، مگر تمہاری حرکتیں ضرور گئی گزری ہیں۔'' شازیہ نے دُوبدو جواب دیا۔

''میں شرمندہ ہوں ناں امی اپنی غلطیوں پر۔ آپ لوگوں نے مجھے معاف کر دیا ہے تو اب وہ بھی مجھے معاف کر دے۔'' وہ واقعی شرمندہ تھا۔ شرمندگی اُس کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔

''کر دے گی میرے بچے، ضرور معاف کر دے گی۔ تم نے ماضی میں اُس کا دل بھی تو بے حد دُکھایا ہے۔ تو اب کچھ جوہر دل جیتنے کے لیے بھی دکھاؤ۔ دیکھو بیٹا...... مرد کی جو ذات ہوتی ہے ناں وہ بڑی سر پھری ہوتی ہے۔ مگر جو عورت ذات ہوتی ہے۔ وہ سر پھری تو نہیں مگر روکھی ضرور ہوتی ہے۔ پر جو مرد اُس کی دل سے قدر کرتا، خیال رکھتا، ساتھ دیتا، عزت واحترام اور محبت کرتا اُس کو وہ اپنے دل کے مسند پر ضرور بٹھاتی ہے۔ بیٹا تم نے اب تک اپنے رویے سے ماہا کا دل دکھایا۔ اب تم اُس کے دل میں اپنی جگہ خود بناؤ۔ ہماری تو دل سے خواہش ہے کہ تم دونوں شادی کے خوبصورت بندھن میں بندھ جاؤ۔ مگر ہمت تمہیں اب خود کرنی پڑے گی۔'' روبی پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے سمجھا رہی تھیں۔ محسن اُن کی باتوں پر قائل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ شازیہ محسن کو تائیدی انداز میں مسکراتا دیکھ کر روبی کی بات سے متفق ہونے کا اظہار کر رہی تھیں۔ محسن ماں اور خالہ کی بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

☆......☆......☆

کچھ دنوں بعد ماہا سے ایک بار پھر بات کی گئی۔ اس بار میدان میں خود شازیہ اور روبی اتریں۔

''میرے بچے وہ خود تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' شازیہ اُسے پچکارتے ہوئے سمجھا رہی تھیں۔

''خالہ امی...... اگر یہی غلطی میں کرتی جو محسن بھائی سے سرزد ہوئی ہے تو کیا سب کا دل تب بھی اتنی آسانی سے صاف ہو جاتا؟ تب کیا محسن مجھے پورے خلوص سے اپناتے۔'' کافی دیر سے خاموش بیٹھی ماہا نے سر اُٹھا کر سنجیدگی سے سوال اٹھایا۔ شازیہ اُس کا سوال سن کر خاموش ہو گئیں۔ روبی بیٹی کے سوال پر بہن سے نظریں چرا گئیں اور ماں کے کمرے میں داخل ہونے کے لیے دستک دیتا محسن کمرے کے اندر سے سنائی دیتے اس سوال پر چونک کر رک گیا۔

''بیٹا معاشرہ مردوں کو معاف کر دیتا ہے مگر عورت کو نہیں۔ اور اگر معاف کر بھی دیتا ہے تو احسان

سمجھ کر......" شازیہ پست آواز میں معاشرے کی حقیقت بتا رہی تھیں۔

"غلط کرتا ہے معاشرہ ناانصافی کرتا ہے......
لیکن خالہ امی صرف یہی وجہ نہیں محسن سے شادی سے انکار کی۔ میرے اور اُس کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ بات بے بات مجھ پر غصہ کرتا۔ شادی کے بعد تو حق سمجھ کر مجھ پر اپنا غصہ اتارے گا۔ میرے عزتِ نفس کو مجروح کرے گا۔ میری تذلیل کرے گا۔ کیونکہ وہ اب تک یہی کرتا آ رہا ہے۔ پھر میں یہ سب جانتے بوجھتے کیوں اُس شخص کا ساتھ قبول کروں جس کی آنکھوں میں مجھے دیکھتے ہی خون اُتر آتا ہے۔ آپ لوگ پلیز مجھے اُس سے شادی کے لیے فورس نہ کریں۔"

ماہا نے عاجزانہ انداز میں اپنے انکار کی وجہ بتائی۔ ماہا کی اس بات کے بعد دونوں بہنوں کے لیے مزید کچھ کہنا مشکل ہوگیا۔ دروازے کے پیچھے کھڑے محسن پر ڈھیروں پانی پڑ گیا۔ شرم سے اُس کا رویہ ماہا کے ساتھ اس قدر خراب رہا تھا اس بات کا احساس آج اُسے ماہا کے انکار نے اچھی طرح دلا دیا تھا۔ قبل اس کے روبی اور شازیہ کمرے سے باہر نکلتیں وہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ وہ ساری رات محسن کی اپنے اور ماہا کے رشتے کے بارے میں سوچتے گزری۔ گھر میں اچانک ہی اُداسی چھا گئی تھی۔ یوں جیسے خوشیوں نے اُن کے در پر دستک دیتے دیتے راستہ موڑ لیا ہو۔

☆......☆......☆

"کن سوچوں میں گھری ہو روبی۔" ہرا دھنیے کی چٹنی پیستے ہوئے شازیہ نے پیاز کاٹتی ہوئی روبی سے بالآخر پوچھ ہی ڈالا۔ وہ کافی دیر سے روبی کو خیالوں میں گم دیکھ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں آپا، بس ایسے ہی!" روبی نے چونک کر پہلے شازیہ کو دیکھا اور پھر سر جھٹکتے ہوئے بولیں۔

"ارے ماہا کی سالگرہ آنے والی ہے ناں۔ اُسے تحفہ دینے کے لیے تو سوچ بچار میں نہیں لگی ہوئی ہو۔ ایک تو اس لڑکی کو جلدی کچھ پسند بھی نہیں آتا۔" شازیہ نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ چٹنی پیس کر اب وہ روبی کے برابر ہی آ بیٹھیں تھیں۔ اور ساگ کے پتے توڑ رہی تھیں۔ روبی کچھ دیر خاموش رہیں۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنا شروع ہوئیں۔

محسن کچھ دیر قبل ہی بیدار ہوا تھا۔ آج ہفتہ تھا اور اُس کا آج کا دن آفس سے آف ہوتا تھا۔ غسل سے فراغت کے بعد وہ ناشتے کی طلب سے مجبور شازیہ کو ڈھونڈتا ہوا کچن کی جانب آیا تھا۔ پر وہاں ماہا کی سالگرہ کا ذکر سن کر رُک گیا۔

"اوہ تو محترمہ کی سالگرہ آنے والی ہے۔ یہ اچھا موقع ہے محسن اس دن ہی اس نک چڑھی کزن کا دل جیت کر اُس میں محبت کے بیج بوئے جاسکتے ہیں۔" عقل نے جھٹ مشورہ دے ڈالا۔ اور وہ اپنی ہی عقل کو داد دیتا واپس پلٹنے ہی والا تھا کہ روبی کی بات پر ٹھٹھک گیا۔

"آپا دراصل ظفر کے دوست ہیں ایک عرفان بھائی، انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے ماہا کا رشتہ مانگا ہے۔ لڑکا اچھا ہے۔ پڑھا لکھا ہے، ملازمت بھی بے حد اچھی ہے اب سمجھ نہیں آ رہا ہمیں کہ کیا کریں۔ ہماری تو خواہش ہے کہ ماہا اور محسن کی ہی بات بن جائے۔ مگر پہلے محسن راضی نہیں تھا۔ اب راضی ہوا ہے تو ماہا ہتھے سے اُکھڑی ہوئی ہے۔ یہ بیل سر منڈھتے مجھے تو دکھائی نہیں دیتی آپا۔" روبی اپنی بات کہہ کر اب متفکر سی شازیہ کو دیکھ رہی تھیں۔ جو ساری بات سُن کر اب خاموش سی ہوگئیں تھیں۔

وہ مزید وہاں نہ رُک سکا...... پلٹ کر واپس

اپنے کمرے میں آ گیا۔
وقت کبھی بڑی برق رفتاری سے بساط پلٹ دیتا ہے۔ اور انسان کب بادشاہ سے پیادہ بن جائے کبھی نہیں جان پاتا۔ کل تک وہ ماہا کو مسترد کرتا آ رہا تھا۔ اور اب جب وہ جی جان سے راضی تو وہ اُسے مسترد کر رہی تھی۔ پر یہ مسترد کرنے کا سلسلہ اب تھم جانا چاہیے۔ وہ کافی دنوں سے ماہا کی شخصیت کا معائنہ کر رہا تھا اور یہ حیرت انگیز بات تھی کہ اُس کو اچھی طرح جانچنے کے بعد زندگی کے اس موڑ پر وہ اُسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔
''بات آگے بڑھ گئی ہے محسن بیٹا...... اب یا تو ماہا کو شادی کے لیے راضی کر لو یا پھر بھائی کا روپ دھار کر اُسے گھر سے رخصت کرنے کو تیار ہو جاؤ۔ دل نے دہائی دی تو وہ جھرجھری لیتا کمرے میں تیز تیز قدموں سے ٹہلنے لگا۔ اب یہ اور بات تھی کہ اُس کا ذہن قدموں سے بھی زیادہ تیز چل رہا تھا۔
وہ اپنے دُھلے ہوئے کپڑے وارڈ روب میں رکھ رہی تھی۔ جب روبی اُس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔
''کیا کر رہی ہو ماہا......؟'' وہ کیا کر رہی تھی۔ وہ دیکھ تو رہی تھیں مگر پھر بھی پوچھ بیٹھیں۔
''کچھ نہیں امی...... کپڑے رکھ رہی تھی الماری میں۔'' وہ عام سے انداز میں کپڑے الماری میں رکھ کر پلٹی اور اُن کی جانب متوجہ ہوئی۔
''کیا ہوا کوئی بات کرنی ہے امی آپ نے۔'' ماہا روبی کو ادھیڑ بن میں مبتلا دیکھ کر پوچھ ہی بیٹھی۔
''ہونہہ، ہاں! ایک ضروری بات کرنی ہے بیٹا تم سے۔ یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' روبی اُس کے پوچھنے پر ایک دم فیصلہ کرتے ہوئے اُس کا ہاتھ تھام کر بستر پر بیٹھ گئیں۔
''دیکھو بیٹا جو بات میں کہنے جا رہی ہوں۔ اُسے ٹھیک سے سُننا، سمجھنا اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔'' وہ تمہید باندھتے ہوئے بولیں تو ماہا اُنہیں حیرت سے دیکھنے لگی۔
''بیٹا دل کی چاہ تو یہی تھی کہ تم بیاہ کر بھی اسی گھر کے آنگن میں پھلتی پھولتی ہمیں نظر آؤ۔ پر ایسا شاید رب کو منظور نہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کو توقف کے لیے رُکیں۔ اس دوران اُن کے چہرے پر مایوسی کے سائے واضح طور پر لہراتے نظر آ رہے تھے۔ ماہا نے اُن کے چہرے سے نظریں چرائیں۔ اور لب بھینچ کر اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو مسلنے لگی۔ روبی نے سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔
''تمہارے ابو کے ایک دیرینہ دوست ہیں عرفان صاحب، انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ لڑکا اچھا ہے، پڑھا لکھا تعلیم یافتہ اور اچھی ملازمت کا حامل ہے۔ اگر تم ہاں کہو تو ہم پھر بات آگے بڑھائیں گے۔'' اتنا کہہ کر روبی ماہا کے چہرے پر نگاہیں گاڑھے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگیں۔ ماہا کے چہرے پر سنجیدگی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ اور وہ بالکل خاموش تھی۔ روبی کچھ دیر تک تو اُس کے جواب کا انتظار کرتی رہیں پھر کہنے لگیں۔
''ماہا، شازیہ آپا اور محسن ابھی بھی دل و جان سے تمہیں اپنانا چاہتے ہیں۔ یہ ہم سب کی دلی خواہش ہے۔ مگر ہم میں سے کوئی بھی تم پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرنا چاہتا۔ لہٰذا تم اپنے فیصلے میں بااختیار ہو۔ سو بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو اور جب کر چکو تو ہمیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا۔ ہم سب کو انتظار رہے گا۔'' اپنی بات مکمل کر کے ماہا کے ماتھے پر بوسہ دے کر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اور اُس کے لیے سوچوں کا ایک جہان آباد کر گئیں۔
ایک گہری سانس لے کر وہ آہستگی سے بستر سے اٹھی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کھڑکی تک

آ گئی۔ ہولے سے کھڑکی کے پٹ وا کیے۔ ایک تیز ہوا کا جھونکا اُس کے اُداس چہرے سے ٹکرایا۔ اُس نے نرمی سے آنکھیں بند کر کے تازہ ہوا کی اُس کی زلفوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اُس کے تنے ہوئے اعصاب رفتہ رفتہ ڈھیلے پڑنے لگے اور چہرے پر چھائی اُداسی کی پرچھائی بھی غائب ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ آنکھیں کھول کر وہ اب نیچے کی جانب دیکھنے لگی۔ اور پھر یکدم دم بخود سی رہ گئی۔

وہ نیچے کھڑا بڑی دلچسپی سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ یک ٹک اُس کے چہرے پر نظریں ٹکائے۔ اور اُس کی نظریں، فاصلہ ذرا زیادہ تھا۔ مگر پھر بھی اُس کی نظریں اُسے کیا پیغام بھیج رہی تھیں، وہ بخوبی جان چکی تھی۔

''یا الٰہی! یہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' وہ دھڑکتے دل سے تیزی سے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کرتی بستر پر آ بیٹھی اور زیر لب بڑبڑانے لگی۔

''غلط کہہ رہی ہو کہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں سب سمجھ آ رہا ہے۔'' اُس کے اندر سے صدا بلند ہوئی۔ وہ بے چین سی ہو گئی۔

''مان کیوں نہیں لیتیں کہ اُسے پسند کرتی ہو۔ آج سے نہیں بچپن سے، مگر اُس کے رویے سے اتنی بددل ہو چکی ہو کہ اُس کے ہاتھ بڑھانے پر بھی اُس کا ہاتھ تھامنا نہیں چاہتیں۔'' صدا ایک بار پھر اُس کے اندر گونجی اس بار وہ تھکے تھکے سے انداز میں آنکھیں موند کر بستر کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''تم جان چکی ہو کہ وہ بھی اب دل سے تمہیں پسند کرنے لگا ہے۔ مگر تم اُسے سزا دینا چاہتی ہو، تڑپانا، ستانا چاہتی ہو۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ تمہیں اب تک ستاتا آیا ہے۔'' اس بار اندر سے آتی آواز جذبوں کے بھرپور شدت کے باعث کچھ تیز ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے موتی چھلک پڑے۔ اُسے اب وہ سارے پل یاد آ رہے تھے جن میں محسن نے اُس کا دل بری طرح دکھایا تھا۔

''بولو...... یہی چاہتی ہو ناں تم۔'' کوئی اندر سے مسلسل اُکسا رہا تھا۔ وہ چیخ پڑی۔

''ہاں یہی چاہتی ہوں میں، جس طرح میں تڑپی ہوں روئی ہوں اس کے لیے۔ بالکل ویسے ہی وہ بھی تڑپے میرے لیے۔ تب جا کر کروں گی میں اقرار۔ پہلے اُسے ماہا ظفر کی قدر تو ہو۔ پھر ماہا اپنی ذات اُس کے نام کرنے کو ہوتی تیار۔'' وہ لبوں تک آتے موتیوں کو ہتھیلی کے پشت سے رگڑتی۔ ایک عزم کے ساتھ خود کلام ہوئی۔

☆......☆......☆

چھٹی کا دن تھا تو صبح ناشتے کے میز پر سب اکٹھے تھے۔

''بھائی صاحب کچھ علم ہے آپ کو...... محمود اور منظور صاحب کے گھرانوں کے درمیان حائل کشیدگی اب ختم ہو چکی ہے۔ اور دونوں گھرانے اب پھر سے ایک ہو گئے ہیں۔'' چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ظفر صاحب نے اچانک یاد آنے پر غضنفر صاحب کو بتلایا۔

''ہاں کل میری بھی ملاقات ہوئی تھی محمود صاحب سے بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ استفسار کیا تو محترم بتانے لگے کہ دلوں میں چھپی رنجشیں اب ختم ہو گئیں اور دونوں بھائی اب پھر سے مل کر رہنے لگے ہیں۔'' غضنفر صاحب شاید پہلے بتانا بھول گئے تھے ابھی ظفر صاحب کی بات پر یاد آیا تو بتانے لگے۔

''واقعی! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ہمیشہ سے اس گھرانے کو مل جل کر رہتے دیکھا ہے۔ اب یوں لڑتے دیکھ کر بڑا دل برا ہوتا تھا۔'' شازیہ نے خبر سن

کر خوشی کا اظہار کیا۔
''مگر اچانک یہ سب ہوا کیسے، جھگڑا ختم کیسے ہوا'' روبی نے حیرت کا اظہار کیا۔
''اب یہ تو ہمیں علم نہیں بیگم...... چلیں بھائی صاحب کرکٹ میچ شروع ہونے والا ہے۔ ٹی وی کے سامنے براجمان ہونے کا وقت آ گیا ہمارا۔'' ظفر صاحب ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ غفنفر صاحب کو میچ کی یاد دہانی کروائی۔ اور دونوں بھائی ناشتے کی نشست سے اٹھ گئے۔
ظفر اور غفنفر کے جانے کے بعد ماہا نے دھیمے لہجے میں عرفان صاحب کے بیٹے کے لیے اپنی رضا مندی روبی کے سامنے ظاہر کر دی۔ پل بھر میں اُن سب کے ہنستے مسکراتے چہرے گہری خاموشی کے سائے میں ڈوب گئے۔ اُس نے ایک نظر محسن پر ڈالی، وہ کھانے سے ہاتھ روکے، نگاہیں میز پر گاڑھے لب بھینچے بیٹھا تھا۔ اُس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کھل گئی جسے چھپانے کی غرض سے وہ وہاں سے اُٹھ گئی۔
اُس کے اٹھتے ہی محسن بھی وہاں سے اُٹھ کر لاؤنج سے باہر جانے لگا۔ شازیہ اور روبی نے بڑے غور سے یہ سارا منظر دیکھا۔
''روبی تم تو کہہ رہی تھیں کہ ماہا سے اس انداز میں بات کی ہے کہ اُس کا فیصلہ محسن کے حق میں ہی آئے گا۔ مگر یہاں تو اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔'' شازیہ نے بے تابی سے استفسار کیا۔
''آپا یقین کریں میں نے تو پوری کوشش کی کہ اسے احساس دلا کر فیصلہ اُس پر چھوڑ دوں۔ پر نہ جانے اس لڑکی کے دماغ میں کیا خناس سمایا ہے۔'' انہیں بھی اب ماہا پر غصہ آنے لگا تھا۔
''ہونہہ! شاید وہ محسن کے لیے دل میں کوئی نرم جذبات نہیں رکھتی اس لیے اُسے معاف نہیں کر پا رہی۔ ٹھیک ہے پھر تم ایسا کرو عرفان کو ایک دو دن میں گھر بلا لو۔ بچی کی خواہش نہیں تو میں بھی ضد نہیں کروں گی۔ محسن سے رشتے کے لیے۔'' شازیہ نے جو فیصلہ بہتر جانا وہ سنا دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بچوں کی بات کو لے کر گھر میں کسی بھی طرح کی بدمزگی ہو۔ روبی بے چارگی سے اپنی بہن کو دیکھ کر رہ گئیں۔
وہ فیصلہ سُنا کر بڑی مطمئن سی اپنے کمرے کی کھڑکی سے محسن کو باہر گاڑی اسٹارٹ کرتا دیکھ رہی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی محسن زن سے گاڑی بھگا تا منظر سے غائب ہو گیا۔ ایک دل جلا دینے والی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر سج گئی۔

غمِ دل کو اِن آنکھوں سے چھلک جانا بھی آتا ہے
تڑپنا بھی ہمیں آتا ہے تڑپانا بھی آتا ہے

پردے برابر کر کے وہ بڑے پُرمسرت سے انداز میں گنگناتی اپنے کتابوں کے شیلف کی جانب بڑھ گئی۔ شام رفتہ رفتہ گہری سیاہی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ محسن صبح کا نکلا ہوا، ابھی تک گھر واپس نہیں لوٹا۔ شازیہ کئی بار فون ملا چکیں تھیں مگر کال ریسو نہیں ہو رہی تھی۔
''سنیں! محسن ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔ کب سے کال کر رہی ہوں مگر ریسو نہیں کر رہا۔ ذرا آپ بھی تو معلوم کر کے دیکھیں۔'' شازیہ پریشان سی غفنفر صاحب سے کہنے لگیں۔
''ارے آ جائے گا۔ کوئی پہلی بار تھوڑی گیا ہے گھر سے باہر۔ اور ابھی تو فقط نو ہی بجے ہیں۔ آپ کے صاحبزادے تو رات دس بجے تک باہر رہنے کے عادی ہیں۔'' غفنفر صاحب ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ دروازے پر ایک تواتر کے ساتھ بیل بجنا شروع ہو گئی۔ علشبہ گیٹ کھولنے گئی تو دل تھام کر رہ

گئی۔ محسن اپنے ایک دوست کے سہارے سامنے کھڑا تھا اور اُس کا دایاں بازو اور سر پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

''یہ...... یہ کیا ہوا ہے بھائی آپ کو...... یہ پٹیاں کیسی؟'' وہ پریشان سی سوال پر سوال کیے جا رہی تھی۔ اُس کی آواز سن کر گھر کے دیگر افراد بھی وہاں آگئے۔

''دراصل محسن کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ کچھ چوٹیں ضرور آئیں ہیں پر شکر ہے کہ شدید نوعیت کی نہیں۔ مگر زخم بھرنے میں وقت لگے گا۔'' اُس کا دوست اب اُن سب کو تفصیل بتا رہا تھا۔ محسن کے چہرے پر نقاہت طاری تھی۔ اُس سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ اُس کی حالت کے پیشِ نظر اُسے فوراً سہارا دے کر کمرے میں لے جایا گیا۔ شازیہ کا تو رُو رُو کر برا حال ہوگیا۔ علشبہ الگ روہانسی سی کھڑی تھی۔

محسن کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی ماہا کا دل ڈوبنے لگا۔ اُسے صبح کا وہ منظر یاد آگیا جب وہ غصے سے گاڑی دوڑاتا اُس کی نظروں سے غائب ہوا تھا۔ دل میں شرمندگی کا احساس جاگ اٹھا۔ وہ تو بس اُسے تنگ کرنا چاہتی تھی۔ ایسا تو نہیں چاہتی تھی کہ غصے میں اپنا نقصان کر بیٹھے۔

گھر میں اُداسی کی فضا پھیلی ہوئی تھی۔ شازیہ پریشان سی زیادہ تر محسن کے سرہانے بیٹھی رہتیں۔ روبی بہن کی حالت کے پیشِ نظر گھر کی ساری ذمہ داریاں سنبھال رہیں تھیں۔ علشبہ روبی کے ساتھ اُن کا ہاتھ بٹا رہی تھی جبکہ وہ بڑے نامحسوس انداز میں محسن کا خیال رکھ رہی تھی۔ اُس کے لیے خاص کھانے بنانا، سوپ بنانا، اُس کے کپڑوں کو استری کرنا اور دیگر چھوٹے موٹے کام وہ اس انداز میں انجام دے رہی تھی کہ کسی کو کچھ خاص محسوس ہی نہ ہو۔ محسن سے وابستہ شکاتیں اب رفتہ رفتہ دم توڑنے لگیں تھیں۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا اس حادثے کو۔ محسن کے زخم اب بھرنا شروع ہوگئے تھے۔ آج ہی وہ دوست کے ساتھ پٹیاں بدلوا کر آیا تھا۔ پریشانی اور ٹینشن کی وجہ سے شازیہ کی طبیعت بھی کچھ خراب ہو چلی تھی۔ علشبہ کچن سمیٹنے میں مصروف تھی تو وہ نیم گرم دودھ میں ہلدی گھول کر دبے پاؤں محسن کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا اپنے کسی دوست سے باتوں میں مصروف تھا۔ وہ آہستگی سے گلاس کارنر ٹیبل پر رکھ کر واپس جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ محسن کے جملے پر ایک جھٹکے سے واپس پلٹی۔

''منصوبہ بالکل زبردست جا رہا ہے یار...... بڑا شوق تھا موصوفہ کو عرفان انکل کے بیٹے کو گھر پر بلانے کا۔ اب جب تک میں ٹھیک نہ ہو جاؤں تب تک تو کچھ ہونے والا نہیں۔'' وہ بڑے مزے سے کہتا ہوا ہنس رہا تھا۔ اُس کے چہرے کا رُخ کھڑکی کی جانب ہونے کی وجہ سے وہ اب تک ماہا کی موجودگی سے لاعلم تھا۔

''نہیں، نہیں...... کسی کو شک تو کیا وہم بھی نہیں گزرا میرے اس ڈرامے کا۔'' محسن اپنے دائیں ہاتھ سے کھڑکی کے پٹ بند کرتا سارے راز کھول رہا تھا۔

''اڑا ایسا ویسا...... کافی خیال رکھتی ہیں اب میرا محترمہ...... مگر میں اُسے محسوس ہی نہیں ہونے دیتا کہ اُس کے ہر عمل پر نظر رکھ رہا ہوں۔'' وہ بڑی دلکش مسکراہٹ لبوں پر سجائے کہتے ہوئے پلٹا تھا اور سامنے خونخوار نظروں سے گھورتی ماہا کو دیکھ کر سٹپٹا کر رہ گیا۔

''میں کچھ دیر بعد بات کرتا ہوں یار۔ اللہ حافظ۔'' رابطہ منقطع کر کے وہ اب مکمل طور پر ماہا کی

جانب متوجہ تھا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا ماہا چیخ پڑی۔

''جھوٹے مکار...... شرم نیں آتی گھر میں سب کو دھوکے میں رکھ کر پریشان کرتے ہوئے۔''

''تمہیں شرم آتی ہے مجھے یوں ستا کر، پریشان کر کے۔'' وہ سوال کے جواب میں سوال کر رہا تھا۔ کچھ لمحے قبل کی گھبراہٹ اڑن چھو ہو چکی تھی۔ جیسے ماہا کو حقیقت پتا چل جانے پر اُسے کوئی فرق ہی نہ پڑتا ہو۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ ویسے بھی گھر میں سب کو پریشان کرنے والے کارنامے تم ہی انجام دیتے ہو۔ کبھی کسی بے شرم لڑکی کے پیچھے پڑ کر، تو کبھی جھوٹ موٹ کے ہاتھ پیر تڑوا کر۔'' وہ سر تا پیر اُسے طنزیہ نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی۔

''اور مجھے پریشان کرنے والے کارنامے تم انجام دیتی ہو۔ کبھی مجھے شادی سے انکار کر کے تو کبھی کسی ایرے غیرے کے لیے ہاں کر کے۔'' وہ پُرسکون سا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہا تھا۔

''ویسے بھی مائی ڈیئر کزن جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ اور میں تو اِن دونوں حادثات کا شکار ہوں تو پھر مجھو مجھ پر تو سب کچھ معاف ہے۔'' وہ اب بڑے آرام سے اپنے گلے سے پٹی اتارتا ہوا بول رہا تھا۔ جیسے اب اس راز کی کوئی فکر نہ ہو۔ ماہا اُس کے اس انداز پر سلک سی گئی۔

''کیا مطلب......! کون سی محبت، کون سی جنگ...... کن حادثات کا رونا رو رہے ہو تم۔'' وہ تیکھی نگاہیں اُس کے چہرے پر گاڑھتے ہوئے بولی۔

''محبت وہ جو میرا دل تم سے کرتا ہے۔ جنگ وہ جو تم میری محبت سے کرتی ہو۔'' وہ مسکراتا ہوا اُس کی جانب ایک قدم بڑھا۔

''میرے پاس فضول وقت نہیں کہ تمہاری اِن بے تکی باتوں پر برباد کروں۔'' اُس کا دل محسن کی بات پر دھڑکا تھا۔ تبھی جان چھڑانے والے انداز میں کہتی دروازے کی جانب پلٹی۔

''رُکو ماہا! میں مانتا ہوں میں بہت برا ہوں، تم سے لڑتا ہوں، تم پر غصہ کرتا ہوں۔ تمہیں ہرٹ کرتا ہوں۔ پر اہم بات یہ ہے کہ میں ان تمام باتوں پر شرمندہ ہوں۔ اور دیکھو اگر شرمندہ نہ ہوتا تو کیا منظور اور محمود انکل کے گھرانوں کے درمیان صلح کرواتا۔'' اس کے لہجے اور آنکھوں میں سچائی جھلک رہی تھی۔ محسن کے الفاظ ماہا کی سماعتوں بن کر بم کی طرح گرے۔ وہ حیرت زدہ سی اُس کی جانب پلٹی۔

''کیا...... تم نے اُن دونوں گھرانوں میں صلح کروائی ہے۔ مگر کیوں؟'' وہ شاکڈ سی اُسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کیونکہ وہ اپنی آپس کی لڑائی میں تمہارا نام بدنام کر رہے تھے اور مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ تمہارا نام جب اب مجھ سے جڑنے والا ہے تو پھر میں اُسے بدنام کیوں ہونے دوں۔'' وہ سیدھا اُس کی آنکھوں میں جھانکتا کہنے لگا۔ ماہا گڑبڑا گئی۔

''میرا نام کیوں تمہارے نام سے جڑنے لگا۔ شاید تمہیں علم نہیں میں اس رشتے سے انکار کر چکی ہوں۔'' وہ گڑبڑاتے ہوئے بھی اُسے حقیقت بتا رہی تھی۔

''سب پتا ہے مجھے تمہارا انکار بھی، اور انکار کی وجہ بھی۔'' وہ منہ پھلا کر بولا۔

''جب سب پتا ہے تو اِن بے تکی حرکتوں کا مطلب۔ ایک دفعہ جب میں فیصلہ کر لیتی ہوں پھر بدلتی نہیں۔'' وہ دوٹوک انداز میں کہتی دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔

''اور اگر میں نے تمہارا فیصلہ بدل ڈالا تو......'' وہ دو قدم مزید آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''اتنی تم میں ہمت نہیں۔'' دل اچانک ہی زور سے دھڑکا تھا۔ وہ دل کی حالت سے گھبرائی۔ مگر یہ گھبراہٹ محسن پر ظاہر نہ ہونے دی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جواب دیتی رہی۔

''ہمت کی تو بات ہی نہ کرو تم...... تم سے شادی لڑ جھگڑ کر بھی کر سکتا ہوں۔ مگر لڑ کر نہیں پیار سے جیتنا چاہتا ہوں تمہیں۔'' وہ سینے پر ہاتھ باندھے اُس کے سامنے کھڑا اُسے جیتنے کی باتیں کر رہا تھا۔ ماہا کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہا تمہیں اچانک ہوا کیا ہے۔ ساری زندگی میں تمہاری نظروں میں چبھتی رہی ہوں۔ آج تم مجھے جیتنے کی باتیں کر رہے ہو۔ تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں محسن۔'' محسن کا رویہ جہاں اُس کا دل دھڑکا رہا تھا۔ وہیں اُس کے ذہن کو بھی اُلجھا رہا تھا۔

''ہوا یہ ہے کہ کچھ دن قبل مجھے پتا چلا کہ میں تم سے اب تک اس لیے لڑتا رہا تھا کیونکہ تم نے گھر والوں سے میرے حصے کی محبتیں چرالیں تھیں اور اس کے باوجود تم مجھے اچھی لگتی تھیں۔ اس لیے میں تم سے لڑ کر خود کو باور کرانا چاہتا تھا کہ تم مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ پر اب میں سوچ رہا ہوں کہ......'' وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ ماہا اُس کی جانب متوجہ سی اُس کے آگے بولنے کا انتظار کرتی رہی مگر وہ خاموش رہا۔ ایک معنی خیز خاموشی اُن دونوں کے بیچ حائل ہو گئی۔

''کیا سوچ رہا ہوں...... آگے بھی بولو......'' بالآخر ماہا تنگ آ کر پوچھ ہی بیٹھی۔

''نہیں! ابھی نہیں بتاؤں گا۔'' وہ اُس کی بے قراری دیکھ کر اُسے تنگ کرنے لگا تھا۔

''نہ بتاؤ......!'' وہ اُس کے ارادے کو فوراً بھانپ کر لاپروائی سے بولی۔

''ویسے بھی کل میں تمہارے اس ڈرامے کا کلائمکس کرنے والی ہوں۔'' اپنی جانب سے وہ اُسے ٹھیک ٹھاک دھمکی دے رہی تھی۔

''کر دینا...... میرے لیے تو یہ کلائمکس اچھا ہی ثابت ہو گا۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''وہ کیسے......؟'' وہ متعجب ہوئی۔

''وہ ایسے کہ...... جب تم سب کو سچ بتاؤ گی تو سب مجھ سے اس جھوٹ کی وجہ دریافت کریں گے اور پھر جب میں اُن سے کہوں گا کہ یہ سب کچھ میں نے ماہا کے لیے کیا ہے تاکہ عرفان صاحب سے رشتے کا کوئی معاملہ طے نہ ہو سکے۔ کیونکہ میں ماہا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جانتی ہو پھر کیا ہو گا۔ امی اور چھوٹی امی تو شروع سے ہی چاہتی ہیں کہ ہماری شادی ہو مگر پھر ابو، اور چھوٹے ابو بھی میری جانبداری کرتے نظر آئیں گے۔ یہاں تک کہ تمہاری چچی میری بہن بھی اور یوں تم بالکل اکیلی ہو جاؤ گی۔ پھر کب تک مقابلہ کرو گے اِن سب کے اصرار اور میری محبت کا۔ جلد ہی تم کو مانتے ہی بنے گی۔'' وہ جو بھی کہہ رہا تھا سچ کہہ رہا تھا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے اُس کی عقل پر عش عش کر رہی تھی۔ اور وہ یوں بیوقوفوں کی طرح منہ کھولے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ماہا حواسوں میں واپس لوٹی تو جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

''محسن غضنفر...... تم سے فرار میں چاہتی ہی کب ہوں۔ ہاں اب جب تم ٹھان چکے میرا دل جیتنا۔ تو کرلو اپنی پوری کوشش...... پر میں اتنی آسانی سے تو تمہیں بھی پتا چلنے نہ دوں گی کہ اس دل پر راج تمہارا ہی ہے۔'' وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اور ایک دل آویز مسکراہٹ سجائے وہ خود سے دل ہی دل میں مخاطب ہوئی۔

☆......☆......☆

کل ماہا کی سالگرہ ہے۔ اور تم ایسے بستر سے

لگے ہو کہ بچی کی سالگرہ کرنے کو جی بھی نہیں چاہ رہا۔'' شازیہ اُسے چمچ سے سوپ پلاتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔

''نہیں امی میری وجہ سے ماہا کی سالگرہ خراب نہ کریں۔ بلکہ آپ ایک بار پھر کل چھوٹی امی سے ماہا کے لیے بات کرکے دیکھیں۔'' وہ عاجزی سے اُن کا ہاتھ تھامے بول رہا تھا۔

''میرے بچے ماہا راضی نہیں ہوگی۔'' شازیہ بے بسی سے اُسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''امی بس آخری بار...... اب اگر انکار ہوا تو میں کبھی ماہا کا نام زبان پر نہ لاؤں گا۔'' وہ التجا کر رہا تھا۔ شازیہ کا دل بھر آیا۔ وہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئیں۔ وہ اُن کے حامی بھرنے پر اُن کے ہاتھوں کو چومنے لگا۔

''کاش میرے بچے اس بار تجھے مایوس نہ ہونا پڑے۔ اللہ تو میرے بچے کی یہ خواہش یہ خوشی پوری کردے میرے مالک۔'' وہ محبت سے محسن کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اُس کی خوشیوں کے لیے دعائیں مانگے جا رہی تھیں۔

اگلے دن سالگرہ کی تیاریاں خوب زور و شور سے جاری تھیں۔ شازیہ روبی نے رات کے کھانے میں کافی اہتمام کرلیا تھا۔ علشبہ ماہا کا فیورٹ کافی کیک بنانے میں مصروف تھی۔ اور ماہا ان سب کی تیاریوں سے انجان بنی نہ جانے اپنے کون سے ذاتی کاموں میں مصروف تھی۔ محسن آج کافی دنوں بعد اپنے کمرے سے باہر نکل کر لاؤنج میں آ کر بیٹھا تھا۔ اور تب سے وہ کبھی موبائل تو کبھی لیپ ٹاپ میں مصروف تھا۔ ماہا کو کل رات والی بات کے بعد اُس سے جس رویے کی امید تھی اُس کے برعکس محسن اُس سے بالکل لاتعلق بنا بیٹھا تھا۔ جیسے کل رات اُن کے درمیان کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اُس کا یہ انداز ماہا کو

اندر تک سُلگا گیا تھا۔

''ہونہہ! کل رات تو بڑے دعوےٰ کیے جا رہے تھے محبت کے اور آج تو موصوف جیسے سب کچھ بھول بیٹھے ہیں۔ اچھا ہی کیا ماہا جو اس اکڑو کے سامنے اپنے دل کی کوئی بات نہیں کی۔ ورنہ بڑی سبکی ہوتی آج اس رویے کو دیکھ کر۔'' ہمیشہ کی طرح وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتے ہوئے اُس کے سامنے سے گزرتے ہوئے کن اکھیوں سے کئی بار دیکھ چکی تھی۔ مگر رات میں میاں مجنوں کا روپ دھارے محسن پر اس وقت کچھ اثر ہی نہ ہو رہا تھا۔

شام کو تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ لاؤنج کو بھی علشبہ نے ہلکا پھلکا سجا لیا تھا۔ روبی کے کہنے پر ماہا نے ہلکی پھلکی تیاری بھی کر لی تھی۔ دھانی رنگ کی فراک میں ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ علشبہ اپنا بنایا ہوا مزیدار سا کافی کیک میز پر رکھ چکی تھی۔ سب کچھ تیار تھا۔ مگر محسن وہاں موجود نہ تھا۔ یاہا بے چینی سے بار بار دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''یہ محسن کہاں رہ گیا آپا۔'' روبی بالآخر پوچھ ہی بیٹھیں۔

''پتا نہیں کہاں رہ گیا یہ لڑکا۔ علشبہ ذرا کال ملا کر پوچھ محسن سے کہ وہ کہاں ہے۔'' شازیہ نے علشبہ کو ہدایت دی تو وہ فوراً کال ملانے لگی۔ محسن سے بات ہو گئی تھی۔

''بھائی کہہ رہے ہیں بس دو منٹ میں آ رہے ہیں۔'' علشبہ نے سب کو مطلع کیا۔ اور واقعی وہ دو منٹ میں آ گیا تھا۔ ایک بید سے بنی ہوئی خوبصورت سی ٹوکری اٹھائے۔ جس میں سفید رنگ کا انتہائی خوبصورت سا نیلی نیلی آنکھوں والا بلی کا بچہ بڑی معصومیت سے جھانک رہا تھا۔ وہ سب حیرت سے محسن کو دیکھنے لگے۔

''یہ تمہارا برتھ ڈے گفٹ۔'' وہ بائیں ہاتھ میں تھامی ٹوکری اُس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ماہا بے یقینی سے اسے حیرت زدہ سی دیکھتی رہ گئی۔

وہ بچپن سے بلی پالنے کی شوقین تھی۔ پر محسن کو جانے کیوں چڑ تھی بلیوں سے۔ وہ اُس کی لائی ہوئی ہر بلی کو گھر سے کہیں دور چھوڑ آتا تھا۔ اور وہ پھر روتی رہ جاتی۔ اور اُس کے رونے پر اگلے دن گھر والے ایک نئی بلی لا کر اُس کے حوالے کر دیتے۔ پر ایک دفعہ تو حد ہو گئی۔ اُس معصوم سے بلی کے بچے کی ذرا سی شرارت پر محسن نے اُسے انتہائی غصے میں ڈنڈے سے اس زور سے مارا کہ وہ معصوم اُسی وقت دم توڑ گیا۔ ماہا تب بہت روئی تھی۔ گھر والوں نے محسن کو بے حد ڈانٹا۔ اور اُس نے ویسا ہی دوسرا بلی کا بچہ لا کر دینے کا وعدہ بھی کیا مگر اس بار ماہا نے منع کر دیا۔ وہ محسن کے غصے سے بے حد ڈر گئی تھی۔ اور نہیں چاہتی تھی کہ مزید کوئی معصوم جان اُس کے غصے کی بھینٹ چڑھے۔ اور آج اُس کی سالگرہ پر وہ اُسے بلی کا بچہ گفٹ کر رہا تھا۔ ماہا کے لیے یہ انتہائی حیرت کا مقام تھا۔ وہ حیرت زدہ سی محسن کو دیکھنے لگی جس کے چہرے پر بڑی پُرخلوص سی مسکراہٹ سجی تھی۔

''تمہیں پسند ہیں نا بلی کے بچے...... میں تمہارے لیے لے کر آیا ہوں۔'' وہ مسکراتا ہوا اُس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ماہا کے لب بھی مسکرا اٹھے۔ اُس کے ہاتھوں سے ٹوکری تھامتے ہوئے اُس نے اُس پیاری سی بلی کے بچے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ وہ ٹکر ٹکر دیکھتا اُس سے فوراً ہی مانوس ہو گیا۔

''بیٹا جی...... آخر تم نے میدان مار ہی لیا۔'' شازیہ نے محسن کے قریب آ کر اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

''ابھی آدھا میدان مارا ہے۔ باقی کام آپ دکھائیں امی جی۔'' وہ بھی جواب میں کھسر پھسر کرنے لگا۔

''چلو بھئی اب کیک بھی کاٹو۔ ہمیں تو ابھی سے بھوک لگ رہی ہے۔'' غضنفر صاحب نے سب کی توجہ کیک کی جانب مبذول کروائی۔

''ماہا نے بلی کے بچے کو بائیں ہاتھ سے تھامے ہوئے سب کی تالیوں اور مبارکباد کے شور میں کیک کاٹنے لگی۔ کیک کاٹ کر سب کو باری باری کھلاتے ہوئے وہ اب اُس کی جانب آئی تھی۔

''اس ٹوکری میں تمہارے لیے ایک پیغام بھی ہے۔'' اُس کے ہاتھ سے کیک کھاتے ہوئے وہ بولا تھا۔ وہ چونک کر اُس ٹوکری کی جانب متوجہ ہوئی۔ اُس میں گلابی رنگ کی پرچی سلیقے سے تہہ لگا کر رکھی ہوئی تھی۔ وہ جھٹ سے اُسے کھول کر پڑھنے لگی۔

تجھ کو اُلجھا کر کچھ سوالوں میں
میں نے جی بھر کر تمہیں دیکھ لیا ہے

ماہا اب تک تم سے لڑ کر خود کو یقین دلاتا رہا کہ تم مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ پر اب زندگی کے اس موڑ پر میں تمہیں کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتا۔ بلکہ تمہیں اپنی زندگی کا ہمسفر بنا کر یہ یقین حاصل کر لینا چاہتا ہوں کہ تم صرف میری ماہا ہو۔'' یہ فقط الفاظ نہیں تھے بلکہ محسن کے جذبات کے ترجمان بھی تھے۔ وہ نم آنکھوں سے کبھی اُس گلابی پرچی کو دیکھتی تو کبھی محسن کو۔ نہ جانے کیا جادو چلا تھا کہ کڑوے کریلے جیسا محسن اب شہد سی میٹھی بولی بول رہا تھا۔ بس ذرا سی سوچ بدلی تھی۔ ذہنوں پر چھائی دھند چھٹی تھی۔ اور محبت نے بہت دھیرے سے اُن دونوں کے دلوں کو تسخیر کر لیا تھا۔ پھر تکرار کو اقرار میں بدلتے دیر ہی کتنی لگتی۔ بلاشبہ یہ رویے ہی ہوتے ہیں جو ہمیں ایک دوسرے سے بدگمان بھی کرتے اور قریب بھی لاتے۔ محسن کی پُرخلوص چاہت اُس کے چہرے پر قوس وقزاح کے رنگوں کی طرح بکھری اور آنکھوں سے چھلک کر محبت کا اقرار کر رہی تھی۔

''ماہا بیٹا...... پھر کیا خیال ہے کل عرفان صاحب کی فیملی کو کل چائے پر بلا لیا جائے۔'' عقب سے اچانک شازیہ کی آواز گونجی وہ دونوں چونک کر حال میں واپس آئے۔ شازیہ ماہا کو کاندھے سے تھامے بظاہر سنجیدگی سے پوچھ رہی تھیں۔ مگر آنکھوں سے شرارت جھلک رہی تھی۔ جسے ماہا اچھی طرح بھانپ چکی تھی۔

''نہیں...... خالہ امی...... مجھے آپ کے پاس ہی رہنا ہے۔'' وہ شرماتے ہوئے اُن کے گلے سے جا لگی۔ شازیہ اور روبی مسکرا اٹھیں۔

''میں جانتی تھی میری بچی نے جلد یا بدیر یہی فیصلہ کرنا ہے۔'' روبی مطمئن سی بولی تھیں۔

''آپ لوگوں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیک کیسا بنا۔'' علشبہ منہ پھلائے شکایت کر رہی تھی وہ سب ہنس پڑے۔

''آج کی شام بلاشبہ میرے لیے ایک بے حد خوبصورت شام ہے۔ میرے تحفے کا بے حد خیال رکھنا۔'' وہ اُس کے کان میں سرگوشی کرتا کہہ رہا تھا۔ وہ بے ساختہ میز کی جانب دیکھنے لگی۔ جہاں بلی کا بچہ اپنی ٹوکری میں جا سویا تھا۔ محبت اُس کے چہرے پر نور کی مانند چمک رہی تھی۔

''اور تحفہ دینے والا کا۔'' وہ پہلی بار شرارت سے بولی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔

''اُس کا خیال تو تمہیں سب سے زیادہ رکھنا ہے۔'' وہ گھمبیر لہجے میں بولا تھا۔ زندگی یکسر بدل چکی تھی۔ وہ کل تک جو اُس کا دشمنِ جان تھا آج سیاں کا روپ دھارے اِس کے دل میں اتر رہا تھا۔

☆☆......☆☆

خصوصی افسانہ برائے سالگرہ نمبر

وہ سہانی خوشی تھی۔

تین بھائیوں کی کل ملا کے نو نرینہ اولادوں کے بعد ملنے والی خوشی۔ تو اُس کا نام سہانی خوشی سے بہترین کوئی اور کیسے ہوسکتا تھا۔ اور یہ نام اسے اُس کے مرحوم دادا نے دیا تھا۔ جو خود اپنے لیے بیٹی کی خواہش کرتے کرتے تین بیٹوں کو پال پوس کر بڑا کرتے رہے۔ اور پھر ان تینوں کے بھی بیٹوں کی خبریں سن سن کر بالآخر بے زار ہو چلے تھے۔ جب سب سے چھوٹی بہو سے انہیں یہ سہانی خوشخبری ملی تبھی انہوں نے اُس کا اتنا سہانا نام رکھا۔

پھر ان کی بھی یہ آخری اولاد ثابت ہوئی۔

کلیم احمد کے داؤد، عباد اور عبید' وسیم احمد کے فواد، جواد' نعمان اور عمران' ندیم احمد کے ارحم اور عاصم اور پھر...... سہانی خوشی۔ سب سے چھوٹے ندیم اور رومانہ سہانی خوشی کے پا کے یکدم گھر کے بادشاہ و ملکہ بن بیٹھے۔

کئی کنال پر محیط وائٹ پیلس میں یہ خاندان برسوں سے یگانگت و محبت سے بسا ہوا تھا اور تینوں بھائی شہر کی سب سے بڑی مارکیٹ کے سب سے مہنگے شاپنگ مال' وائٹ مال' کے مالکان تھے۔

اور یہ شاید دنیا کا وہ واحد گھرانا ہوگا جہاں بیٹوں کی پیدائش پر مردمنہ بناتے تھے۔

ایسے میں سہانی خوشی کی آمد نے ان کے وائٹ پیلس کو دھنک رنگ پیلس میں بدل دیا۔ وائٹ کلر امارات اور شاہانہ پن کا تاثر دیتا ہے۔

پھر سہانی خوشی کے آنے پر لڑکوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سنو وہائٹ کی چھڑی پھیر کر پل میں اسے پنک پیلس میں بدل دیتے۔

سہانی خوشی کی پیدائش پر پورے ایک ماہ تک خوب خوشیاں منائی گئیں، روز مٹھائیاں بٹنیں، لنگر تقسیم ہوئے، خاندان بھر میں تحائف بٹے، پورے شہر کے یتیم خانوں میں دیگیں بھجوائی گئیں۔ غرض یہ کہ خوشی کے اظہار کا جو بھی طریقہ ان کی سمجھ میں آتا تھا وہ بس کر گزرے۔ پورے ایک ماہ تک ان کا گھر باہر برقی قمقموں اور اندر گلابوں سے سجا رہا۔

گھر کا سب سے بڑا بیڈ روم کلیم صاحب اور شائستہ کا تھا۔ انہوں نے وہ خالی کر کے دوسرا کمرہ لیا اور ان کے کمرے کو ملک کے نامور انٹیریئر ڈیکوریٹر سے سہانی خوشی کے لیے مکمل پنک اور وائٹ کلر اسکیم میں سیٹ کروایا گیا۔

وہ تھی تو ندیم اور رومانہ کی بیٹی لیکن اسے بھی اتنا چاہتے تھے کہ کوئی اجنبی کبھی تخصیص نہ کر پاتا کہ

درحقیقت وہ اولاد کس کی ہے۔ وہ تھی بھی اتنی ہی پیاری۔ یوں لگتا کہ اُس کی دنیا میں آمد اسی لیے اس قدر تاخیر سے ہوئی تھی کیونکہ وہ اب تک تمام خاندان کا حسن سمیٹ کر جمع کرتی جارہی تھی۔ دل موہ لینے والے نین نقش اور چہرے پر بکھری بلا کی معصومیت، جو دیکھتا بس دیکھتا رہ جاتا۔ اُس کو نظر اتنی لگتی تھی کہ اُس کی چھوٹی تائی فضیلہ کی تو باقاعدہ نظر اتارنے کی ڈیوٹی لگادی گئی تھی۔

اُس کی پرورش میں تو پھر وہ وہ احتیاطیں کی گئیں وہ وہ نادر اصول آزمائے گئے کہ ملکہ الزبتھ بھی کیا آزماتی ہوگی شہزادیوں کی پرورش میں۔ وہ وائٹ پیلس کی شہزادی ہی تو تھی۔ لیکن لاڈ پیار کے باوجود اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا کہ اُس کی شخصیت کی اعلیٰ تعمیر ہو۔ بگاڑ کسی صورت نہ آنے پائے۔ وہ حاسدین جو سمجھتے تھے کہ خوشی انتہائی تک چڑھی مغرور اور بدتمیز لڑکی بنے گی وہ سب انگلیاں منہ میں دابے آنکھیں پھاڑے اُس کا اخلاق دیکھا کرتے تھے۔ اُس کی اعلیٰ پرورش کے لیے مانو گھر کے سب بچوں کی نئے سرے سے تربیت کی گئی۔ اور پھر محنت کا نتیجہ بھی کبھی صفر نکلا ہے بھلا؟

وہ ایک آئیڈیل لڑکی میں ڈھل کر جوان ہوئی تھی۔ اگر گھر والے اس پر جان چھڑکتے تھے تو وہ بھی اپنی جان اپنا دل ان کے لیے ہتھیلی پر لیے پھرتی تھی۔

اس کی برتھ ڈے، اسکول کالج رزلٹ اور دیگر تمام خوشیاں کسی قومی تہوار کی طرح منائی جاتی تھیں۔

بس پھر اتنی خوشیاں منا منا کر ہی گڑ بڑ ہوگئی۔ وہ جب خود بڑی ہوئی تو سیلی بریشن اُس کی گھٹی میں رچ بس گئی تھی۔ ذرا ذرا بات پر ٹریٹ، پارٹی، گفٹ اور سیلی بریشن۔ داؤد جو گھر کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور تمام رسومات کو فضول سمجھتا تھا وہ ہمیشہ جل کر کہتا۔

''اور منائیں اُس کی پیدائش کی خوشیاں عالمی سطح پر، اس نے تو پوری زندگی کو ہی سیلی بریشن بنا ڈالا ہے۔ چھلاوی نہ ہو تو......''

سب کا قہقہہ بلند ہوتا اور چھلاوی کا منہ پھول کر پھول گو بھی بن جاتا۔ پھر اسے منانے کے لیے بھی سیلی

بریشن ترتیب دی جاتی۔ ورنہ وہ نہ مانتی تھی۔ بس یہی ایک خرابی رہ گئی تھی اس میں۔ لیکن یہ کسی کو بھی خرابی یا خامی نہیں لگا کرتی تھی۔

کیونکہ وہ ان کی خوشی تھی۔ سہانی خوشی۔ دھیرے دھیرے اسے احساس ہوا کہ گھر میں صرف اسی کی خوشیوں کو سیلی بریٹ کیا جاتا ہے۔ اس کے بھائیوں اور کزنز میں اُس کی جان تھی۔ سو اس نے عاصم اور ارحم کو بٹھا کر خفیہ میٹنگ کی جس کے نتیجے میں گھر کے لڑکوں کی بھی خوشیاں منائی جانے لگیں۔ داؤد نے سر تھام لیا۔

''یہ برتھ ڈیز، اینورسریز، سب فضولیات ہیں، وقت اور پیسے کا ضیاع، مغرب کی اندھی تقلید۔'' وہ بگڑتا تو خوشی اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹپٹا کر اُسے دیکھتی اور اٹھلا کر کہتی۔

''آپ کی بھی تو برتھ ڈے سیلی بریٹ ہوا کرے گی نا داؤد بھائی۔''

اور داؤد بھائی اُس کی میٹھی نظروں کی تاب نہ لا پاتے۔ چپ کر کے اُڑنچھو۔ خوشی اسے اپنی فتح سمجھتی، باقی سب بھی......

لیکن داؤد......

لیکن پھر بھی وہ ان کی ایکٹوٹیز میں شریک نہ ہوتا۔ تب خوشی تلملاتی۔

''بورنگ، ڈل، خشک، آدم بیزار۔'' اور اس کے چیلے ایک ایک لفظ پر سر دُھنتے جاتے۔ وہ بول بول کر تھک جاتی پھر کئی دنوں تک داؤد کی عدم موجودگی اور عدم دلچسپی کا قلق دل میں دبائے پھرتی رہتی۔ بس وہ واحد چیز تھی جو وہ دل میں دبائے ہی رہتی تھی۔

تو جناب جس دن خوشی نے اپنی بیسویں سال گرہ کا کیک کاٹ کر تحائف وصول کیے۔ اسی دن اُس کے ممی ڈیڈی نے اُس کا پہلا اور آخری پروپوزل وصول کیا۔

بھئی آخر وائٹ پیلس کے سب سے بڑے ولی عہد کے لیے شہزادی کا منصب سنبھالنے کو خوشی کے سوا کوئی اور کیسے ہو سکتی تھی۔ وہ پیدائشی شہزادی تھی۔ داؤد احمد کے دل کی پوشیدہ خواہش، ہزاروں نظریاتی اختلافات کے باوجود۔

لیکن دوسری طرف تو سونامی ہی برپا ہو گیا۔ بھاں بھاں کر کے انتہائی بھدے طریقے سے روتی خوشی، رومانہ کو پریشان کر گئی۔

''داؤد بھائی سے شادی نہیں ممی پلیز۔'' اب ایک طرف اتنا ہیرا لڑکا اور دوسری طرف چہیتی لاڈلی کے ہیروں سے بھی بیش قیمت آنسو۔ وہ تو بُری پھنسیں۔

ندیم صاحب کو بلایا گیا۔ ان کے بھی قابو سے باہر۔ اب ان قیمتی جواہر کا یوں ٹپکنا اور ضائع ہونا کیسے روکیں بھلا۔ ان دونوں میاں بیوی کو خوشی کی بدولت ملکہ بادشاہ کی مسند پر بٹھا دینے والے بڑے بھائی بھابی کے دل کا ارمان تھی وہ۔ اور وہی حقدار بھی تھے۔ کریں تو کیا کریں۔ پھر ارحم اور عاصم کو بلوایا گیا۔

اپنی سیلی بریشن ٹیم کے خاص اہلکار اور اس کے جان سے پیارے راج دُلارے بھائی جب سامنے آ بیٹھے تو اسے بولتے ہی بنی۔ اور جب بلی تھیلے سے باہر آئی تو ان دونوں کے پیٹ میں گدگدیاں بھر گئی۔ ان کے چھت پھاڑ قہقہے سُن کر رومانہ دہل کر اُس کے کمرے کی طرف بھاگیں۔ اندر کا منظر حیران کن تھا۔

ایک طرف خوشی کی آنسو بھری بلکہ جواہرات بھری آنکھیں دوسری طرف گدگدیوں سے کارپٹ پر لوٹ پوٹ ہوتے ارحم اور عاصم۔

''بات کیا ہے کچھ پتا تو چلے۔'' رومانہ جھنجلا گئیں۔ اور بات کھلی تو......رومانہ نے سر تھام لیا۔

شہزادی سہانی خوشی کو اعتراض اس بات پر تھا کہ داؤد اسے کبھی بھی خوبصورت طریقوں سے برتھ ڈیز اور اینورسیز وش نہیں کرے گا۔ ویلنٹائن ڈے پر ریڈ روز اور ریڈ ڈریس نہیں دلائے گا......اور......اور......اور......

داؤد کے ناکردہ گناہوں کی فہرست لمبی تھی۔ جو

ابھی اس سے سرزد ہونے تھے۔ رومانہ دائیں بائیں سر ہلاتی واپس مڑ گئیں۔ ان کے دماغ میں داؤد کا جملہ گونجا۔

''اور منائیں اِس کی خوشیاں عالمی سطح پر۔ اس نے تو پوری زندگی کو ہی سیلی بریشن بنا ڈالا ہے۔''

''کتنا سچ کہتا ہے داؤد۔ ہم نے تو گویا دودھ میں گھول کے پلا دی سیلی بریشن اس چھلاوی کو۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیڈ روم میں گئی تھیں اور پھر اور پھر......

آپ نہیں پہنچ سکتے وہاں تک جہاں تک سہانی خوشی کی پہنچ ہے۔ مسئلہ سپریم کورٹ میں لے جایا گیا اور وسیم احمد اور فضیلہ کو جج بنایا گیا۔ باقی سب وکلاء تھے وہ بھی خوشی کے۔ داؤد بنا وکیل کے محض ملزم کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ عادی مجرم ہے اس لیے کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں۔ کیس بس یونہی لڑا جا رہا تھا فیصلہ تو سب کو معلوم ہی تھا۔ خوشی خاندان بھر کی لاڈلی تھی۔ اس کی ہر بات کو جائز مانا جاتا تھا۔ ویسے ایک سیلی بریشن کے خبط کے علاوہ اس کی خواہشات ناجائز ہوتی بھی نہ تھیں۔ وہ سمجھدار بچی تھی اور سمجھدار لڑکی میں ڈھلی تھی۔ سو داؤد کو بس شرائط سنائی گئیں۔ جو اس نے سر جھکا کر ہی سُنیں اور سر جھکا کر ہی مان لیں۔ کیس کا فیصلہ خوشی کو بھی سنایا گیا۔ اس نے بھی سر جھکا دیا۔

نری ڈرامہ بازی......

کوئی نہیں جانتا تھا بس وہی جانتی تھی کہ اس نے ایویں ڈرامہ کیا تھا، داؤد اسے دل کی گہرائیوں سے عزیز تھا۔ وہ اس کے دل و دماغ کے کونے کونے چپے چپے پر قابض تھا۔ لیکن یہ خاموش محبت تھی۔ کم از کم خوشی کی محبت کو تو خاموش ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس کی باقی خواہشات کی زبان جو اتنی لمبی تھی۔ بس وہی کافی تھا۔ محبت کے منہ پر اس نے ہمیشہ صمد بانڈ لگا کے رکھا تھا۔ خوشی سراپا خوشی تھی۔

وہ داؤد کے دل کی بھی پوشیدہ خوشی تھی۔

باوجود اپنے بچکانہ پن، جذباتی پن اور لاڈلے پن کے وہ اسے اچھی لگتی تھی چاہے مزید جتنے بھی 'پن' اس میں شامل ہو جاتے، وہ اس کے دل کی رانی تھی۔ وہ اس سے محبت کرنے میں خود کو مجبور پاتا تھا۔ لاکھ اختلافات کے باوجود۔ اور اختلافات میں ہی تو اصل حسن ہے۔ بس اک آگ تھی جو دونوں طرف برابر لگی تھی۔ لیکن یہ ٹھنڈی میٹھی آگ تھی۔ جو جلاتی نہ تھی، رُلاتی اور تڑپاتی بھی نہ تھی۔ بس مسکاتی تھی۔ ان دونوں کے چہروں پر، ایک کو مسکراتا دیکھ کر دوسرا خود بخود مسکرا اٹھتا۔ لیکن پتا ایک کو بھی نہ لگتا۔ بظاہر دونوں مشرق مغرب تھے۔

بالآخر شادی کا دن بھی آ پہنچا۔ وہ تمام رسومات کے شدید مخالف تھا لیکن اُس کی خوشی تمام رسومات کی اتنی ہی دلدادہ تھی۔ بس دل پر پتھر رکھ کر تمام نخرے بھگتائے۔ اور بالآخر وہ رخصت ہو کر اس کے بیڈ روم میں پہنچا دی گئی۔ رخصتی کے وقت سب گھر والے ایسا پھوٹ پھوٹ کے روئے تھے کہ اسے اپنا آپ مجرم مجرم لگنے لگا تھا۔

''یا خدا...... ایک کمرہ تبدیل ہونے پر اتنا رونا دھونا۔'' وہ سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ لیکن خوشی محترمہ اس وقت ساری خوشی بھلائے غموں کے ریکارڈ برابر کرنے میں مصروف تھی۔ میک اپ واٹر پروف تھا نا۔

''یار اگر تمہیں کمرہ چھوڑنے کا اتنا دکھ ہے تو ہم کل ہی ساری سیٹنگ تمہارے بیڈ روم میں کروالیں گے۔'' اس نے خوشی کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے رونا دھونا موقوف کر کے اسے ایسی ظالم نگاہوں سے گھورا کہ وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ ساتھ ہی خاندان کے بڑوں کی گھوریوں کو بھی سہنا پڑا۔ پھر وہ چپ ہی کر گیا۔ آدھے گھنٹے کی طویل برداشت کے بعد یہ سن ساٹھ کا فلمی سین ختم ہوا تو اسے سکون ملا۔

داؤد اپنے بیڈ روم میں خوشی کو دیکھ کر سرشار سا تھا۔ خوشی اس گلابوں سے بھرے حسین و جمیل بیڈ پر بیٹھی تھی۔ سی گرین اور مہندی کنٹراسٹ کے بے حد

بھاری کامدار ڈیزائنر لہنگے میں ملبوس، اپنے ڈریس کے وزن کے بالکل مخالف انتہائی ہلکا پھلکا مگر خوبصورت میک اپ کیے نازک سی جیولری پہنے وہ پرستان کی پری لگ رہی تھی یا محلوں کی شہزادی، اپسرا لگ رہی تھی یا قلوپطرہ...... داؤد فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

جب وہ یونہی کھڑا سوچ میں گم دیکھتا رہا تو تنگ آ کر اس نے سر اٹھایا۔ لیکن داؤد کی بدلی بدلی نگاہیں دیکھ کر پھر سے جھکا لیا۔ وہ بھی چونکا اور پھر سائیڈ ٹیبل کی دراز سے ایک مخملیں باکس نکال کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ باکس کھول کر اُس کے آگے کیا۔ اُس کی نظریں خیرہ ہوگئیں۔ بے حد نازک مگر خوبصورت ڈائمنڈ سیٹ تھا۔ اُس کی نگاہوں میں پسندیدگی دیکھ کر اس نے سیٹ آگے کیا۔ خوشی نے ناراضی سے اسے گھورا۔

''کیا ہوا؟'' وہ پھر حیران ہوا۔

''دیا آپ نے تو پہنائیں بھی آپ۔ اتنا بھی نہیں پتا۔'' وہ ناراضگی سے بولی تو داؤد ٹپٹا گیا۔

''امتحان شروع۔ ہیلپ می ربا۔'' اس نے دل میں دعا کرتے ہوئے اوپر دیکھا تو خوشی کی گھوری میں سختی آ گئی۔

''ہائے ظالم نظروں سے۔'' وہ گنگنایا تو خوشی جھینپ کر سر جھکا گئی۔ داؤد کو سکون ہوا لیکن اگلے ہی لمحے سکون غارت۔

اس کے سر پر جے دوپٹے کو جمائے رکھنے کے لیے ہزاروں پنیں کسی عمارت پر لگے قمقموں کی طرح نصب تھیں۔

''اب یہ...... پنیں تو کھولو۔ دوپٹے کے اوپر سے بھلا کیسے پہناؤں؟'' وہ ہکلایا تو خوشی نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ پانی پانی ہوگیا۔

''اب کیا ہوا؟''

''آپ کو اتنا بھی نہیں پتا کہ یہ پنیں بھی آپ ہی ہٹائیں گے۔ رومینٹک ہزبینڈز یوں ہی کیا کرتے ہیں۔'' وہ حقیقی شرم بھلا کر مصنوعی پن سے لجائی اسے زہر لگی۔

''بڑی آئی کترینہ کیف کی جانشین۔'' وہ جل ہی تو گیا۔

''مجھے تو نہیں پتا۔ البتہ تم یہ بتاؤ کہ تمہیں ''کیا کیا'' پتا ہے۔ مجھے تو بس ایک ہی بات پتا ہے جو ''رومینٹک ہزبینڈز'' کو پتا ہونی چاہیے۔'' داؤد نے لہجہ بدلا تو غبارے میں سے ساری ہوا نکل گئی۔ شرمانا اٹھلانا بند۔ نخرے بند۔ بس پھر آگے کا کام آسان...... ساری ڈیمانڈز بھول کر خوشی صاحبہ تھوڑی سینے سے چپکا کر بیٹھ گئیں۔

بس پھر تو گویا داؤد احمد کو گیدڑ سنگھی ہاتھ آ گئی۔ پتا نہیں مثال درست ہے یا غلط۔ بہر حال، مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اب جہاں خوشی صاحبہ رومینس کے پرپرزے نکالنا شروع کرتیں وہیں داؤد صاحب یہ گیدڑ سنگھی نکال لیتے۔ اور خوشی رفو چکر، اس کے ساتھ اُس کے رومینٹک خیالات بھی رفو چکر۔

لیکن کب تک؟

خوشی بھی آخر سہانی خوشی تھی۔

بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ بہر حال...... اس کی بھی شامت آ ہی گئی۔ جب شادی کے بعد خوشی کی برتھ ڈے آئی۔ ججز اور وکلاء دھرنا دے کر میدان میں آ گئے۔

مطالبات کٹھن تھے۔

برتھ ڈے کے لیے رات بارہ بجے شاندار سیلی بریشن، اس کے بعد برتھ ڈے والے روز خاص طور پر خوشی کے لیے فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر اور بیش قیمت گفٹ۔ اس کے علاوہ ڈنر اور رات میں گھر پر کی جانے والی سیلی بریشن دونوں کے لیے الگ الگ ڈریسز مع لوازمات، اب تک تو سب کچھ سرپرائز ہوا کرتا تھا لیکن داؤد چونکہ اس معاملے میں چغد تھا اس لیے اسے سب کچھ سمجھانا پڑ رہا تھا۔

رات بارہ بجے جب ڈیٹ چینج ہوئی تب تو داؤد نے سب کچھ کر دکھایا۔ بادل نخواستہ ہی سہی، لیکن خوشی صاحبہ خوش تھیں۔ شاندار ڈریس، شاندار پارٹی کا انتظام اور سب کے گفٹس، یہ سب ہر سال ہوتا تھا لیکن

داؤد شامل نہیں ہوتا تھا۔ اس بار وہ شامل تھا تو خوشی کی خوشی کا رنگ ہی نرالا تھا۔ سارے گھر والے مسرور و مطمئن، اُن کا فیصلہ صائب تھا۔ وہ دونوں آپس میں خوش تھے۔ نوکروں کی فوج کے باوجود خوشی داؤد کے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے خود مصروف رہا کرتی تھی اور جب وہ گھر پر ہوتا تب بھی اسی کے گرد پھرتی رہتی۔ کبھی چائے، کبھی کافی، کبھی پانی کبھی کچھ کبھی کچھ۔ وہ لونگ بھی کیئرنگ تھی۔ سو اگر تھوڑا ناز دکھاتی تھی نخرے کرتی تھی تو داؤد کو قبول تھا۔ اُس کی خوشی کی خاطر وہ سیلی بریشنز بھی کرنے لگا تھا۔ جو بھی تھا وہ اُس کی محبت تھی، شریکِ سفر تھی۔ ابھی بچپنا باقی تھا۔ آہستہ آہستہ ذمہ داریاں پڑتیں تو خود بخود سنجیدہ ہو جاتی۔ وہ پُر امید تھا۔ لیکن قدرت نے کچھ اور طے کر رکھا تھا۔ رات کو سیلی بریشن کے بعد سب کو سوتے سوتے دو بج گئے۔ داؤد اپنے بابا اور چچاؤں کے ساتھ دن گیارہ بجے تک مال جایا کرتا تھا۔ سیکنڈ شفٹ میں فواد جواد اور ارحم وغیرہ بھی جایا کرتے تھے۔

اس روز ڈنر کے ساتھ ساتھ داؤد کا کچھ آؤٹنگ کا بھی پلان تھا۔ وہ دونوں اکیلے کم ہی نکلتے تھے۔ عموماً جو بھی پروگرام بنتا تھا وہ فیملی کا بنتا تھا۔ سو آج کے دن کے حساب سے وہ دونوں ایکسائٹڈ تھے۔ داؤد نے اُس کے لیے سرپرائز گفٹ بھی لے رکھا تھا۔

لیکن یہ دنیا انسان کے ارادوں پر نہیں چل رہی۔ یہاں ہم ایک قدم اٹھانے کے لیے بھی اُس رب ذوالجلال کے 'کُن' کے محتاج ہیں۔

وہ وائٹ مال سے نکلنے والا تھا جب ایک شور سا اٹھا۔ وہ اس چار منزلہ شاپنگ مال میں بچوں کے سامان والا فلور مینج کرتا تھا۔ باقی تمام جگہوں پر اُس کے بابا اور چچا کے بیچ ڈیوٹیاں تقسیم تھیں۔ جن میں سب کے بیٹے برابر مدد کیا کرتے تھے۔ داؤد نے اپنے فلور پر ہیلپ کے لیے اس دن ارحم کو بلوایا تھا اور چارج اسے دے کر وہ نکلنے والا تھا جب وہ ہنگامہ اٹھا۔ وہ اور ارحم دونوں باہر نکلے۔ کسی کلائنٹ کا مسئلہ تھا۔

اور کلائنٹ جب خاتون ہو تو مسئلہ اُلجھتا بھی بری طرح ہے اور سلجھتا بھی دیر سے ہے۔ وہ خاتون کسٹمر اپنے بچے کے لیے کچھ شاپنگ کر کے گئی تھیں اور ایک ہفتے بعد ان کو اس میں کچھ خامیاں نظر آئی تھیں۔ مال کا اصول تھا کہ کسی شکایت کی صورت میں تین دن کے اندر اندر رابطہ کرنا ضروری تھا۔ اس کے بعد مالکان کی ذمہ داری نہ ہوتی تھی۔ اب وہ خاتون ایک ہفتے بعد شکایات لے کر آگئی تھیں۔ اور اچھا خاصا تماشا کھڑا کر دیا تھا۔ شاپنگ مال کی ساکھ کا سوال تھا۔ گو کہ اس وقت موجود کسٹمرز بھی اس خاتون کو سمجھا رہے تھے اور مالکان کو فیور کر رہے تھے لیکن پھر بھی بات اگر پبلک ہو جائے تو مخالفین کو موقع مل جاتا ہے۔ خاتون کا بیٹا کچھ زیادہ ہی لاڈلا تھا اور اب وہ اس کے لاڈ کے قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ وہ پورے مال کو بتا دینا چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا پورے شہر کا لاڈلا شہزادہ بلکہ کوہ قاف کا شہزادہ ہے۔ اور داؤد اور ارحم کُڑھ رہے تھے۔

''ایک اور سہانی خوشی۔'' ارحم بڑبڑایا تو داؤد محض سر ہلا کر رہ گیا۔ معاملہ اتنا بڑھ گیا کہ اوپر کے فلورز سے کلیم، وسیم اور ندیم صاحب کو بھی بلوانا پڑ گیا۔ اس عورت کا شوہر بھی آ گیا۔ آؤٹنگ ڈنر سب فراموش ہو چکا تھا۔ دوسری طرف سہانی خوشی صاحبہ کا رو رو کے برا حال تھا۔ شائستہ اور رومانہ اسے تسلیاں دیے جا رہی تھیں اور فضیلہ ایک کے بعد ایک تمام نمبرز پر کالز ملا ملا کر انگلیاں تھکا رہی تھیں لیکن کوئی بھی فون پک نہیں کر رہا تھا۔ عصر سے مغرب اور پھر عشاء ہو چلی تھی جب بالآخر کلیم صاحب نے کال بیک کر کے اپنی بیوی شائستہ کو مختصراً سارا معاملہ سمجھایا اور خوشی سے بھی بات کر کے تسلی دی۔ اُس کے آنسو تو رُک گئے البتہ دل ملال سے بھر گیا۔ اسے اتنے گھنٹوں میں ایک بار بھی داؤد سے گلہ نہیں ہوا۔ وہ بس پریشان تھی کہ خدا جانے ایسا کیا ہوا ہے جو ایک بھی بندہ فون پک نہیں کر رہا نہ ہی کال بیک کر رہا ہے۔ پریشان تو تینوں بیگمات بھی تھیں لیکن وہ اپنی پریشانی بھلائے خوشی کو پُرسکون کرنے میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ جو باپ،

چچاؤں، بھائیوں اور شوہر ایک ایک کا نام لے لے کر روئے جا رہی تھی۔ اُس کا دل اتنا ہی نازک تھا۔ برتھ ڈے، آؤٹنگ، ڈنر وہ بھی سب کچھ فراموش کیے اُجڑے حلیے میں بیٹھی تھی۔ میک اپ آنسوؤں میں بہہ کر ڈھل چکا تھا۔ بال بکھر چکے تھے اور آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ان تینوں خواتین کو اب اُس کی فکر ستا رہی تھی۔ سہانی خوشی جو جلد ہی ان کے گھرانے کو مزید خوشیوں سے نوازنے جا رہی تھی۔

تو بس کلیم صاحب سے بات کر کے وہ قدرے پُرسکون ہوئی۔ وہاں ملک کے انوکھے شہزادے کی ماں کو نئے سرے سے شاپنگ کروائی جا رہی تھی اور وہ ایک ایک چیز میں ہزار کیڑے نکال نکال کر نخوت سے رد کرتی جا رہی تھی۔ کلیم صاحب نے داؤد کو کئی مرتبہ گھر بھیجنا چاہا لیکن وہ بھی ضد میں آ گیا تھا۔

''ہم بھی خوشی کی خاطر اعلیٰ سے اعلیٰ شاپنگ کرنے میں اسی طرح پوری مارکیٹ کو ناکوں چنے چبوا دیا کرتے تھے اور پھر فخر سے اپنی کارگزاری بیان کرتے تھے۔ ان محترمہ کی گود میں موجود بچہ بھی آپ خوشی جیسا ہی سمجھیں اور اب اس بلا کو میری زندگی کی سزا کے طور پر مجھے ہی جھیلنے دیں۔ یہ مشن اب میں ہی پورا کروں گا کیونکہ آپ لوگوں نے مجھے آل ریڈی بیوی کی صورت میں ایسا ہی بچہ تھمایا ہوا ہے اور آپ لوگ بھی ایسے ہی والدین بنے پھرتے ہیں۔'' دوٹوک انداز اور دبے دبے مگر سخت لہجے میں کہتا داؤد کلیم صاحب سمیت سبھی کو آئینہ دکھا گیا۔ پھر وہ کچھ نہیں بولے۔ پھر تین گھنٹے لگا کر داؤد نے ان محترمہ کو مطمئن کر کے شاپنگ مال کے دروازے تک رخصت کیا۔ وہ داؤد سے از حد امپریس ہو گئی تھیں اور جاتے جاتے اسے اپنے شہزادے کی برتھ ڈے میں انوائٹ کر گئی تھیں۔ جس کے سلسلے میں یہ سب کھڑاگ پھیلایا گیا تھا۔ داؤد نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے وہ آسمانی کارڈ پکڑا تھا اور گمان غالب تھا کہ وہ انہیں گاڑی تک چھوڑنے چلا جاتا تبھی ارحم نے اُس کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ لیا۔ وسیع و عریض پارکنگ میں کھڑی

اس عورت کی گاڑی ریورس ہو کر پارکنگ سے باہر نکلی اور داؤد نے وہ کارڈ ارحم کے ہاتھ پر پٹخا اور دھپ دھپ کرتا باہر نکل گیا۔

جس وقت وہ گھر پہنچا جملہ خواتین اُس کی نازک اندام سہانی خوشی کے آگے جوس سے بھرا جگ رکھے اسے پلانے پر مصر تھیں اور وہ ایک ایک گھونٹ پر نخرے کر رہی تھی۔ داؤد سُلگ اُٹھا۔ اسے دیکھتے ہی خوشی گلاس میز پر پٹخ کر تیزی سے آگے بڑھی اور اس کے بازو پکڑ کر بے چینی سے بولی۔

''آپ ٹھیک ہیں؟'' وہ اب اس کا چہرہ اور ہاتھ ٹٹول رہی تھی۔

'' آپ آئیں جوس پئیں آپ تو بالکل ایگزاسٹ ہو رہے ہیں۔ آئیں، آئیں نا۔'' وہ اسے کھینچتی ہوئی سینٹر ٹیبل تک لے آئی اور زبردستی صوفے پر بٹھا کر اپنا گلاس تھما دیا جس میں سے اس نے صرف ایک ہی گھونٹ بھرا تھا۔ خواتین نے اُٹھ جانا مناسب سمجھا۔ ان دونوں کی توجہ صرف ایک دوسرے پر تھی۔ تینوں آنٹیز یا ممیز مسکراہٹیں دباتی اِدھر اُدھر ہو گئیں۔

ٹھنڈے ٹھار فریش اورنج جوس کا بڑا سا گھونٹ بھرتے ہی داؤد کے اندر بھڑکتے الاؤ یکدم بجھ گئے۔ اردگرد گل و گلزار اُگ آئے۔ سامنے بیٹھی خوبصورت مگر متفکر سی اُس کی نصف بہتر...... اُس کی شکایتیں ہمیشہ کی طرح اندر ہی دم توڑ گئیں۔ پل میں اسے سمجھ آ گیا تھا کہ سب لوگ کیوں اسے اتنا چاہتے تھے۔ وہ تھی ہی ایسی، تو بس پھر...... سات خون معاف۔

پھر خوشی تو کہیں جانے پر راضی نہ تھی اُس کا اصرار تھا کہ داؤد اب ریسٹ کرے لیکن داؤد بضد تھا۔ سو وہ ڈنر کے لیے نکل پڑے۔ تب ہی داؤد کو شاپنگ مال میں ڈرامہ کرنے والی آنٹی بالکل حق بجانب لگی تھیں۔ اسے اپنا آپ بھی اس وقت بالکل آنٹی آنٹی لگ رہا تھا، اپنی شہزادی کی خوشی کی خاطر اتنے گھنٹوں کی خواری بھلائے ڈنر پر جاتے ہوئے وہ اب ان آنٹی کی فیلنگز بخوبی سمجھ رہا تھا۔

پھر جب انتہائی پُرتکلف ڈنر کے بعد اس نے خوشی کو سرپرائز گفٹ دیا...... وہ جڑاؤ کنگن جو اسے ایک دن ایک فیشن میگزین دیکھتے ہوئے پسند آیا تھا۔ وہ اس کی کلائی میں پہنا کر داؤد نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

''کیا ہوا؟ تمہیں پسند تھا نا یہ کنگن۔'' اور خوشی کے نین کٹورے جواہرات سے بھر گئے۔

''اگر آج کچھ ایسا ویسا ہو جاتا تو داؤد۔ یہ برتھ ڈے میری ساری عمر کے لیے ناقابلِ فراموش بلکہ عبرت انگیز بن جاتی۔'' داؤد خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

''یہ ڈنر، یہ گفٹ، یہ سارا ارینجمنٹ، کچھ بھی دل کو خوش نہیں کر پا رہا داؤد۔ آج پہلی بار مجھے احساس ہو رہا ہے کہ آپ کتنا صحیح کہتے تھے۔ یہ سب فضول رسمیں ہیں۔ اتنے ٹف دن کے بعد ابھی آپ کو ریسٹ کی ضرورت تھی لیکن آپ کو یہاں آنا پڑا۔ وجہ؟ یہی منحوس برتھ ڈے۔''

''منحوس تو نہ کہو میری خوشی۔'' داؤد کو برا لگا۔

''سچ ہے داؤد، آج اگر کچھ ہو جاتا تو یہ دن منحوس ہی لگتا نا سب کو۔ اور اگر یہ دن فکس نہ ہوتا تو ہم کل آ جاتے پرسوں آ جاتے۔''

''یہی بات...... بالکل یہی بات میری سویٹ ہارٹ وائف میں ہمیشہ سمجھانا چاہتا تھا کہ ہم نے برتھ ڈیز اور اینورسیریز کو اتنا اہم سمجھ لیا ہے کہ ایک دن آگے پیچھے ہو جائے تو اتنے پیارے رشتوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ میں نے ان باتوں پہ باقاعدہ طلاقیں ہوتی دیکھی ہیں۔ شوہر کسی مسئلے پر پھنس گیا اینورسری کے لیے پہنچ نہ سکا۔ بیگم صاحبہ نے گرینڈ فنکشن ارینج کر رکھا تھا۔ ان کا کپل مثالی تھا، حاسدین نے ہنسی اڑائی، اور بیگم صاحبہ نے بدگمانی کی انتہا کو چھوتے ہوئے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔'' خوشی آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

''یہ میرے دوست کی فیملی کا واقعہ ہے خوشی۔ گپ نہیں ہے۔ مغرب کی دان کردہ ان رسومات نے ہمیں ہمیشہ نقصان سے دوچار کیا ہے۔ سیلی بریشن ویسے بھی کی جا سکتی ہے جب دونوں فریقین کو سہولت ہو۔ وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے، برتھ ڈے ضروری نہیں۔ ہر برتھ ڈے اور اینورسری ہمارے ایک دوسرے کے ساتھ گزارے جانے والے برس گھٹاتی ہے۔ سیلی بریشن کسی اور چیز کی کرو۔ ان چیزوں کی نہیں جو ذرا سے مسئلے پر رشتوں میں دراڑیں ڈال دیں۔ تمہاری آنکھ میں آئے آنسوؤں پر تمہارے سرجی مجھ سے ناراض ہیں۔ سیلی بریشن ناراضی کو جنم دے تو ایسی سیلی بریشن کس کام کی۔'' خوشی خاموشی سے اسے سُن رہی تھی۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں داؤد۔ اور ان تمام چیزوں پر ہم کتنا روپیہ بھی خرچ کر دیتے ہیں۔ اللہ پاک ہم سے کتنا ناراض ہوتے ہوں گے نا۔ ہم اُس کا کوئی مثبت اور سودمند راستہ بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔ اس پیسے کو کسی ایسی جگہ لگا سکتے ہیں جس سے ہمیں دائمی سکون ملے، جو ہمارا صدقہ جاریہ بنے۔''

''میری خوشی بڑی ہو گئی۔'' داؤد نے نعرہ مارا۔ خوشی ہونق ہو گئی اور ہال میں موجود لوگ حیران۔

''اور آپ بچہ بن گئے۔'' وہ چڑ کر بولی۔ تو داؤد نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''اب میں بھی سہانی خوشی بن کے دیکھوں گا۔ اب تم داؤد بنو گی۔'' خوشی نے اسے یوں دیکھا گویا اُس کا دماغ چل گیا ہو۔ سب لوگ ان کی جانب متوجہ تھے۔

''داؤد۔'' وہ وارننگ والے انداز میں بولی۔

''جی میری سہانی خوشی۔'' داؤد شاہانہ انداز میں بولا تو سہانی خوشی کھلکھلا کر ہنس دی۔ ہال میں موجود بھی لوگ اس خبطی کپل کے ساتھ ہنس دیے۔

پھول، پتیاں، قہقہے، آسمان پر ٹکے تارے سب کھلکھلا دیے۔

زندگی کھلکھلا دی۔

سہانی خوشی نے زندگی کے قدم سے قدم ملا لیے۔ تاروں کی روشنی ماند لگنے لگی۔ سالگرہ یادگار ہو گئی۔

☆☆......☆☆

حبیبہ عمیر

پلکوں پر ٹھہرے خواب

خوبصورت جذبوں کی عکاسی کرتی

بے مثال تحریر جو اپنے پڑھنے والوں پر سحر طاری کر دے

قسط نمبر: 2

بھئی آگے کیا کرنا ہے تم نے عالی۔ چائے پر وقار صاحب نے پوچھا۔

''ابو سوچ رہا ہوں سی ایس ایس کا پیپر دے دوں۔''

''ہوں سوچ تو اچھی ہے مگر محنت بہت ہے بیٹا اس میں۔''

''جانتا ہوں ابو مگر مجھے یقین ہے کہ میں یہ کرلوں گا۔'' وہ عزم سے بولا۔

''کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے تم کوشش ضرور کرو۔ انہوں نے کندھا تھپتھپایا۔

عالی اب پڑھائی کو لے کر بہت سنجیدگی اختیار کر چکا تھا اور اس کا ثبوت اس کے گریجویشن کا شاندار رزلٹ تھا۔

آج چھٹی کا دن لہذا سب ہی گھر میں تھے۔ رقیہ بیگم نے وقار صاحب سے ولی اور شائلہ کے رشتے کی بات کی انہیں ذکیہ بیگم کا گھرانا کچھ خاص پسند نہیں تھا مگر چونکہ رقیہ بیگم کے پاس میکے کے نام پر صرف ایک بہن تھی لہذا وہ خاموش رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے ذکیہ بیگم فطرتاً ایک لالچی عورت ہیں اور مکار بھی۔ اسی لیے انہوں نے دبی دبی زبان میں انکار کیا جس سے رقیہ بیگم ناراض ہوگئیں۔

''بھئی برائی کیا ہے اس بچی میں دیکھی بھالی ہے۔ اور ویسے بھی یہ ولی کی بھی خواہش ہے۔''

''وہ چونکے کیا ولی بھی چاہتا ہے انہیں یقین نہیں آیا۔''

''ہاں تو اور کیا۔ اس سے پوچھ کر ہی تو بات کر رہی ہوں اچھا وہ سوچ میں پڑ گئے۔''

ابو آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔ عالی نے آ کر کہا۔

وہ اٹھ گئے۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو ایک بزرگ، ساتھ میں ایک ادھیڑ عمر مرد تھا۔

انہوں نے فوراً پہچان لیا یہ خالد کے والد اور بھائی تھا۔ خالد ودعیہ کے والد تھے۔

آپ؟ اتنے عرصے بعد وقار صاحب کو حیرانی

ہوئی۔

انہوں نے مصافحہ کیا۔ عالی بھی تھا مگر اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون ہیں۔

ہاں وقار ہم آئے ہیں۔

جی فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں وقار صاحب بیٹھتے ہوئے بولے۔

تم جانتے تو ہو میں خالد سے ناراض تھا کیونکہ اس نے اپنی مرضی سے میری ناراضگی کے باوجود تمہاری بہن سے شادی کی تھی مگر میں اس سے جتنا بھی ناراض رہتا بیٹا تو وہ میرا ہی ہے ناں اور وہ بہت جلد مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ بزرگ بولے۔

عالی کو ساری بات سمجھ آ گئی۔

تو اب آپ کیا لینے آئے ہیں اور آپ کو پتا کس نے دیا ہے یہاں کا؟ وقار صاحب حیران تھے۔

ہم نے تمہارے دفتر سے لیا ہے اس بار وہ مرد بولا۔

بولنے میں گاؤں کا رنگ نمایاں تھا۔ اور ویسے بھی بزرگ کا شملہ بتا رہا تھا کہ وہ زمیندار وغیرہ ہیں۔

ہم یہاں اپنی پوتی سے ملنے آئے ہیں اب تو وہ بالغ ہوگئی ہوگی ناں۔ ان کی آواز میں حیرت تھی۔ میرے خالد کی آخری نشانی ہے وہ کہاں ہے وہ بلاؤ اس کو ان کی آواز رندھ گئی۔

وقار صاحب نے عالی کو اشارہ کیا تو وہ اٹھ گیا۔

آپ کو اتنے سالوں بعد اس بچی کی یاد آئی ہے۔ وقار صاحب کی آواز میں افسوس تھا۔

ہاں وقار میں واقعی شرمندہ ہوں، اتنے سال تڑپتا رہا مگر آنے کی ہمت نہیں کی مگر اب حوصلہ نہیں رہا اس لیے آ گیا ہوں اور ایک اور بات...... وہ رُکے۔

وقار صاحب چونکے...... جی۔

پتا نہیں زندگی ساتھ دے نہ دے میں نے خالد کے حصے کی جائیداد اس کی اولاد کے نام کر دی ہے میری وفات کے بعد اسے مل جائے گی۔ وہ بولے جبکہ ساتھ آئے مرد نے اپنا پہلو بدلا جیسے اسے یہ بات بالکل پسند نہ آئی ہو۔

جی! اقار صاحب بس اتنا ہی بولے۔

عالی کے پیچھے ودعیہ داخل ہوئی وہ اس بات پر حیران تھی کہ آخر اس سے ملنے کون آیا ہے۔

بزرگ پر نظر پڑتے ہی اسے اپنے بابا کا گمان گزرا، وہ ہکا بکا دیکھ رہی تھی۔ وہ بزرگ اپنی چھڑی کی مدد سے اٹھے۔

میری بچی انہوں نے بانہیں پھیلائیں۔

ودعیہ بھی ان کو دیکھتی کبھی ماموں کو۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

بیٹا یہ تمہارے دادا ہیں وہ بولے۔

بزرگ آگے بڑھے اور اس کا چہرہ تھام لیا۔ میرے خالد کی نشانی میری پوتی انہوں نے بڑھ کر پہلے اس کا ماتھا چوما پھر سینے میں دبوچ لیا۔ اور رونے لگے۔

سینے کی گرمائش سے ودعیہ کو لگا کہ وہ اپنے باپ کے گلے لگ گئی ہے وہ بھی رونے لگی۔

آپ میرے دادا ہیں وہ بولی۔

ہاں میری بچی میں تیرا بدنصیب دادا ہوں۔ جو پہلی بار تجھ کو دیکھ رہا ہوں۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ودعیہ نے ہاتھ بڑھا کر ان کا چہرہ صاف کیا۔

مت روئیں دادا جی دیکھیں میں بھی نہیں رو رہی وہ اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔

اس نے ساتھ آئے مرد کی طرف اشارہ کر کے پوچھا یہ کون ہیں۔

یہ تیرے چاچا ہیں دادا بولے۔

وہ بے ساختگی سے ان کی طرف بڑھی بادل نخواستہ اس مرد نے ودعیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

کتنی ہی دیر وہ اپنے دادا سے باتیں کرتی رہی پھر اس نے وعدہ کیا کہ وہ ان سے ملنے جلد آئے گی۔

☆......☆......☆

آج وہ بے حد خوش تھی اپنے دادا سے مل کر۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سے ملنے آتے رہیں گے اور فون بھی کرتے رہیں گے۔

''ودعیہ سے ملنے کون آیا تھا۔'' جیسے ہی وقار صاحب کمرے میں داخل ہوئے رقیہ بیگم نے پوچھا۔

''اس کے دادا آئے تھے۔'' وہ بستر پر دراز ہوئے۔

''ہیں؟ بھلا انہیں اتنے سالوں بعد آئی ہے اس کی یاد۔ ہاں اب جوان ہو گئی ہے جب پالنے کی باری آئی تو اس کا منہ تک نہیں دیکھا اور آ گئے حق جمانے۔'' وہ دبا دبا غصہ کر رہی تھیں۔

''بھئی آخر کو ان کا خون ہے اب ہم منع کرنے سے تو رہے۔ وہ جب چاہیں آ سکتے ہیں اس سے ملنے۔''

''ساتھ کیوں نہیں لے جاتے اگر یاد آ ہی گیا ہے کہ ان کا اپنا خون ہے۔

انہیں اب بھی غصہ تھا۔

''تم بھی نہ بیگم بس کبھی کبھی حد کر دیتی ہو۔''

وقار صاحب نے غصے سے کروٹ بدل لی۔''
''ہونہہ، انہوں نے گردن گھمائی۔ بڑے آئے دادا۔'' رقیہ بیگم کا غصہ کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے آکر بیگ اتارا اور واش روم میں نہانے کے لیے گھس گئی۔
ابھی نکلی ہی تھی کہ عالی کی آواز رہی تھی۔
''ودعیہ نیچے آؤ جلدی۔''
''اب کیا مصیبت ہے آج ہی ٹیسٹوں سے فارغ ہوئیں ہوں سوچا کہ سوؤں گی مگر شاید قسمت میں میرے سونا لکھا ہی نہیں ہے۔'' وہ منہ بسور کے نیچے آئی۔
جی بھائی!
''کھانا دو مجھے بھوک لگی ہے۔ عالی ٹیبل پر بیٹھ گیا۔
''مامی کہاں ہے......؟'' اس نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔
امی اور ابو گئے ہیں فوتگی میں شیخوپورہ، جواب مختصر تھا۔
''کون فوت ہوا ہے......؟''
''وہ کوئی ابو کے کزن تھے شاید جمال انکل مجھے ٹھیک سے پتا نہیں بس امی نے فون پر اتنا ہی بتایا ہے۔''
''میرا خیال ہے جمال انکل ہی ہوں گے وہی بیمار تھے۔'' اس نے خود سے کلام کیا۔
اوہ! ''اناللہ وانا الیہ راجعون، وہ کہہ کر کچن میں چلی گئی۔''
توا رکھا اور رات والا سالن نکال کر اوون میں رکھ دیا۔
کھڑکی سے دیکھا تو کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔
ہائے اللہ اتنا اچھا موسم ہے مگر...... چلو چھوڑو جلدی سے اسے کھانا دوں پھر سوؤں گی۔ وہ جلدی جلدی پیڑے بنانے لگی۔
اللہ، پہلے ایپرن پہن لوں، ورنہ کپڑوں پر آٹا لگ جائے گا۔''
اس نے دوپٹہ دوازے پر ڈالا اور ایپرن پہن لیا۔
''حد ہے اتنی دیر لگتی ہے بھوک کے مارے میرا برا حال ہے صبح سے کچھ نہیں کھایا میں نے اور مہارانی صاحبہ سے روٹی جلدی نہیں بن رہی۔'' عالی کہتا ہوا کچن میں آ گیا۔
''بھائی بنا رہی ہوں ناں۔'' وہ ایک ہاتھ سے ماتھے پر آئے گیلے بال پیچھے کر رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے روٹی دیکھ رہی تھی۔
عالی یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا وہ پہلی بار کھلے بالوں میں دیکھ رہا تھا اسے۔ کالے گھنے بال جو کمر تک تھے صرف ایک کیچر میں قید کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔
بالوں سے پانی کی ننھی ننھی بوندیں قمیض میں جذب ہو رہی تھیں۔ کالی گھٹا باہر تھی اور بارش کی بوندیں اس کے بالوں سے ہلکے ہلکے برس رہیں تھیں۔
وہ ٹرے میں روٹی رکھ کر پلٹی تو اسے سامنے پایا۔
اس نے ٹرے کاؤنٹر پر رکھی اور بجلی کی تیزی سے دوپٹہ پکڑا۔
عالی نے نظریں چرائیں۔
''بھائی می...... میں لا رہی تھی ناں۔'' اس طرح اسے دیکھ کر وہ تھوڑا کنفیوژ ہوئی تھی۔
''ہوں۔'' وہ ٹرے لے کر پلٹ گیا۔

اس کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔ اس نے ولی کے لیے بھی روٹیاں پکائیں اور سونے چل دی۔

☆......☆......☆

وہ سو کر اٹھی تو باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی عصر نماز ادا کی اور کچن میں آ کر کچھ بنانے کا سوچنے لگی۔

آج مامی نہیں ہیں کیوں نہ پکوڑے بنالوں۔

اس نے بڑے دل سے پکوڑے بنائے اور املی کی چٹنی اور چائے کا گرما گرم کپ لے کر لاؤنج کے باہر ہی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بارش سے لطف اندوز ہونے لگی۔

عالی مین گیٹ سے بائیک اندر لے آیا تھا۔ تیز برستی بارش میں وہ بری طرح بھیگ گیا تھا۔

جاتے نومبر کے دن تھے اس لیے تھوڑی خنکی بڑھ رہی تھی۔

آچھوں...... آچھوں وہ دو تین بار اور چھینکا اور گیلی بازو سے ناک کو رگڑ ڈالا۔

پلیز مجھے بھی چائے دے دو۔ سردی لگ رہی ہے۔ وہ کہہ کر اندر چلا گیا۔

''تو کس نے کہا تھا کہ اتنی تیز بارش میں گھومیں۔'' وہ منہ چڑھا کر بولی۔ وہ اکثر عالی کے پیچھے ہی اسے باتیں سناتی تھی کیونکہ سامنے بولنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

کچن میں چائے بنا رہی تھی جب فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو۔'' اس نے ریسور اٹھایا۔

ودعیہ میں خالہ کے ہاں ہوں بارش رکے گی تو آؤں گا ٹھیک ہے۔

ولی نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔

اور وہ فون کو دیکھتی رہ گئی۔

وہ عالی کو چائے دینے کمرے میں گئی۔

''کس کا فون تھا؟'' وہ چینج کر چکا تھا اور تولیے سے بال رگڑ رہا تھا۔

''ولی بھائی کا تھا کہہ رہے تھے کہ خالہ کے ہاں ہیں اور بارش کے تھمنے پر آئیں گے۔'' اس نے تفصیل سے گوش گزار کر دی۔

بھائی کے کچھ زیادہ ہی چکر لگنے لگ گئے ہیں خالہ کے ہاں عالی بڑبڑایا۔

جی! ودعیہ نے سننے کی بھرپور کوشش کی مگر اس کی آواز باہر برسی بارش کی آواز سے مدھم تھی۔

''کچھ نہیں۔ اچھوں۔'' لگتا ہے نزلہ ہو گیا ہے وہ ناک ٹشو سے رگڑ کر بولا۔

ٹھیک ہے تم جاؤ اس نے چائے کا کپ لیا اور وہ کمرے سے نکل آئی۔

وہ عشاء پڑھ کر فارغ ہوئی اور T.V دیکھنے لگی باہر اب بھی تیز بارش ہو رہی تھی۔

عالی چادر اوڑھے نیچے آیا۔

اچھوں......اچھوں...... چھینکیں زوروں پر تھیں۔

وہ صوفے پر ٹک گیا۔

کھانا کھائیں گے؟ ودعیہ نے مختصراً پوچھا۔

نہیں...... بھائی آ گیا......؟''

ودعیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا عالی نے گھڑی پر نظر ڈالی تو 9 بج رہے تھے۔'' ابھی تک نہیں آیا۔'' وہ بڑبڑایا۔

ماموں کب آئیں گے؟ ودعیہ نے پوچھا۔

کل کا کہہ کر گئے ہیں وہ عالی نے بتایا اور صوفے پر دراز ہو گیا۔ پلیز کوئی کمبل وغیرہ دے دو ٹھنڈ لگ رہی ہے۔

ہوں وہ کہہ کر اٹھی اور اندر ماموں کے کمرے سے کمبل اٹھا لائی۔

''آپ اوپر جا کر آرام کریں میں نیچے بیٹھی ہوں۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر بولی۔ ناک چھینک چھینک کر لال ہو رہی تھی اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہوں میں یہاں پر بے آرام ہی رہوں گا، وہ بنا کسی بحث کے آمادہ ہو گیا۔

ودعیہ نے حیرت سے دیکھا یہ پہلی دفعہ تھا جب عالی نے اس کی کوئی بات مانی ہو۔

☆......☆......☆

رات کے بارہ بجے تھے اور ولی ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ودعیہ کا نیند کے مارے برا حال تھا۔ بارش اب بھی وقفے وقفے سے ہو رہی تھی۔

اس نے کچن میں آ کر دودھ گرم کیا اور عالی کو دینے چلی آئی۔

اس نے ناک کیا مگر جواب ندارد تھا۔

تیسری بار ناک کر کے وہ اندر داخل ہوئی اندر مکمل اندھیرا تھا اس نے لائٹ جلائی تو وہ بیڈ پر پڑا تھا۔

اس نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا تو اسے لگا کہ وہ کچھ بڑبڑا رہا ہے۔

اس نے کان قریب کیا۔

پانی ...... پانی ...... عالی بول رہا تھا جبکہ آنکھیں ہنوز بند تھیں۔ وہ پانی لے آئی۔

''بھائی پانی لے لیں۔'' اس نے عالی کو پکارا۔

بھائی...... بھائی اٹھیں وہ بولی مگر جواب ندارد تھا۔ عالی نے آنکھیں نہیں کھولیں البتہ اس کے پپوٹے ہل رہے تھے۔

اس نے عالی کا ہاتھ ہلایا تو اسے لگا کہ وہ دہک رہا ہے۔

اس نے جلدی سے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اسے جھٹکا لگا اسے تو بہت تیز بخار ہے وہ بولی۔

اب کیا کروں ولی بھائی بھی نہیں ہیں اور مامی ماموں بھی۔

ودعیہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے وہ عالی کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔

پانی عالی بڑبڑایا۔

ہا...... ہاں بھائی پانی پی لیں وہ اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

عالی نے آنکھیں بمشکل کھولیں۔

ودعیہ...... وہ بولا۔

''جی بھائی پانی لائی ہوں، وہ تھوڑا آگے جھکی۔''

عالی نے کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ودعیہ نے سہارا دے کر اس کا سر اٹھایا اور پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔

اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

''اور لاؤں۔'' وہ بولی۔

عالی نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ آہستہ آہستہ غنودگی میں جا رہا تھا وہ اٹھی اور فون کرنے چل دی۔ اس نے ولی کے سیل فون پر کال کی چوتھی بیل پر فون اٹھایا گیا۔

ہیلو ولی بھائی آپ جلدی گھر آ جائیں۔ اس نے گھبرا کر بات کی۔

ولی صبح آئے گا اب اچھا شمائلہ کی آواز آئی۔

مگر وہ ...... اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی کھٹاک سے فون بند کر دیا گیا۔

کس کا فون تھا۔ ولی نے پوچھا۔

ودعیہ کا تھا پوچھ رہی تھی کب آئیں گے میں نے کہہ دیا کہ اب وہ صبح ہی آئیں گے بھلا یہ کوئی

ٹائم ہے واپسی کا ساڑھے بارہ بجنے کو ہیں۔ شمائلہ نے ایک ادا سے کہا۔

میں نے ٹھیک کہا ناں، وہ آنکھیں جھکا کر بولی۔

آپ کبھی غلط ہوسکتیں ہیں کیا۔ ولی نے ہاتھ سے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا ولی کے چہرے پر دلفریب مسکراہٹ تھی جبکہ شمائلہ نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

''اب کیا کروں وہ ہاتھ مروڑ رہی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر دورائی تو 12 بج کر 40 منٹ ہو رہے تھے وہ کچن میں آئی اور دوا ڈھونڈنے لگی۔

اللہ اللہ کر کے اسے بخار کی گولیاں ملیں۔ اس نے توس گرم کیے اور عالی کے کمرے میں آ گئی۔

عالی بھائی! عالی بھائی اس نے کندھا ہلایا۔

ہوں...... وہ کسمسایا۔

''بھائی کچھ کھا لیں پھر دوا لے لیں۔ وہ بولی۔

''میرا دل نہیں کر رہا۔ اچھوں۔'' وہ اتنی زور سے چھینکا کہ پورا جسم لرز گیا۔

اف...... اس کے منہ سے بے ساختہ آواز نکلی اور دوسرے ہاتھ سے اس نے سر تھام لیا۔

''درد ہو رہا ہے......؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہوں۔''

میں تھرمامیٹر لاتی ہوں۔'' وہ کہہ کر اٹھی۔

جبکہ وہ اسے جاتا دیکھتا رہا۔

''104 بخار ہے آپ کو بھائی۔'' اس نے تشویش سے کہا۔

بھائی آپ کچھ کھا لیں ناں پھر دوا لے لیجیے گا۔ پھر ہی آرام آئے گا ناں اس نے ضد کی۔''

''نہیں عالی نے نفی میں سر ہلایا۔''

ودعیہ میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آئی تھی اس نے زبردستی اسے بٹھایا بیڈ سے ٹیک لگا کر اور دودھ اور توس عالی ٹرے اس کے سامنے کر دی۔

چلیں کھائیں وہ حکم دے کر بولی۔

''اچھوں ...... اچھوں ...... اچھوں۔'' عالی ایک دم چھینکا اور ٹرے میں پڑا دودھ کا گلاس چھلک گیا۔

ودعیہ نے جلدی سے بڑھ کر ٹرے سنبھالی۔

جبکہ عالی کی ناک اور آنکھیں دونوں بری طرح بہہ رہی تھیں۔

ودعیہ نے بڑی مشکلوں سے اسے خالی دودھ پینے پر راضی کیا اور پھر ٹیبلٹ دے دی اسے دوبارہ لٹا کر وہ برتن سمیٹ کر کچن میں آ گئی۔

برتن دھو کر وہ لاؤنج میں آئی۔ اس نے وہاں کی لائٹس آف کیں اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

گھڑی پر نظر دورائی تو 2 بج رہے تھے تھکن سے اس کا برا حال تھا مگر نیند دور دور تک آنکھوں میں نہیں تھی۔

''بھائی کو دیکھ تو لوں۔ شاید کچھ چاہیے ہو۔'' وہ خود کلامی کرتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔

وہ بیڈ کے قریب آئی تو عالی کے سو، سو کرنے کی آوازیں آ رہی تھی وہ بہت بے چین لگ رہا تھا۔

اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔

آپ کو اب بھی بہت تیز بخار ہے بھائی اس نے پریشانی سے کہا۔

میں ایسا کرتی ہوں ٹھنڈا پانی اور پٹیاں لاتی ہوں۔ وہ تیر کی طرح کمرے سے نکل گئی۔

جبکہ عالی ایک دفعہ پھر غنودگی میں جارہا تھا۔
وہ رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی پٹیاں کرتی رہی۔ پٹیاں کرتے کرتے وہ سوچ رہی تھی کہ اس شخص سے بات کرنے کو اس کا دل نہیں کرتا تھا مگر اب وہ اس کی اتنی دیکھ بھال کیوں کررہی ہے۔
ایک چبھن اب بھی اس کے دل میں تھی عالی کے لیے۔
فجر کے بعد جا کر کہیں اس کا بخار کم ہوا۔ تھکن سے ودعیہ کا برا حال تھا۔ وہ اٹھی اور نماز پڑھی۔
ابھی وہ لیٹنے لگی تھی کہ خیال آیا ایک نظر دیکھ لوں پھر سو جاؤں گی۔
وہ دوبارہ اس کے کمرے میں آئی تو وہ پر سکون سو رہا تھا۔
شکر اللہ کا...... اس نے بے اختیار شکر ادا کیا اور لائٹ آف کر کے نکل گئی۔
لیٹی تو عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ وہ عالی کو دیکھ کر کتنا گھبرا گئی تھی مگر آہستہ آہستہ گھبراہٹ ختم ہوئی تو وہ اسے سنبھالنے میں کامیاب رہی۔ یہ ہی سوچتے وہ نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

☆......☆......☆

اس کی آنکھ بیل کی کئی آوازوں سے کھلی۔
کیا گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔ ولی بائیک لے کر اندر آیا۔
آسمان پر اب بھی بادل تھے۔ مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔
12 بج رہے ہیں اور تم اب تک سو رہی تھیں، ولی کو حیرت ہوئی کیونکہ ودعیہ کبھی اتنی دیر تک نہیں سوئی تھی۔
''جی میں صبح ہی سوئی تھی۔''
''کیوں۔'' وہ حیرت سے بولا۔
''رات عالی بھائی کو بہت تیز بخار تھا اور گھر پر کوئی بھی نہیں تھا اس لیے ساری رات جاگتی رہی ہوں۔'' تم مجھے بتا دیتی۔
میں نے فون کر کے کہا تھا مگر شائلہ نے کہا کہ آپ صبح آئیں گے۔
اوہ...... وہ تمہارا فون تھا مجھے لگا شاید کسی دوست کا فون ہے۔ ولی شرمندہ ہوا اور وہ جھوٹ بول گیا۔
اب کیسا ہے وہ ولی نے خجالت سے کہا۔
''ٹھیک ہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔
ناشتہ کریں گے ودعیہ نے پوچھا۔
نہیں میں کر کے آیا ہوں خالہ ناشتہ کیے بغیر آنے ہی نہیں دے رہی تھیں۔ ولی کہہ کر اوپر چلا گیا۔
جبکہ ودعیہ افسوس سے اسے دیکھتی رہی۔
ودعیہ ناشتہ کر کے عالی کے کمرے میں آئی۔
وہ اب بھی سو رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔
کافی کم ہو گیا ہے بخار وہ بولی۔ آرام کرنے دیتی ہوں۔
اس نے کمرے کے پردے برابر کیے اور باہر نکل آئی۔
وہ کھانے کی تیاری کر رہی تھی جب عالی چادر لپیٹے نیچے آیا۔
وہ لاؤنج میں آ کر صوفے پر بیٹھا۔ کمزوری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ البتہ بخار کم ہو گیا تھا اور نزلہ زکام اب بھی ویسا ہی تھا۔
اچھوں...... وہ چھینکا۔
چھینک کی آواز سن کر ودعیہ کچن سے باہر آئی۔
آپ نیچے آ گئے ابھی آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا۔ وہ پریشانی سے بولی جبکہ وہ صرف

اسے دیکھ رہا تھا۔
عالی کو یاد تھا کہ رات ودعیہ تھی اس کے پاس اور اس نے ہی اس کا خیال رکھا تھا ویسے اسے بالکل امید نہیں تھی کہ ودعیہ اس کا خیال رکھے گی جبکہ وہ اس کے ساتھ ہمیشہ برا ہی کرتا رہا ہے مگر پھر بھی ودعیہ نے اس کا بہت خیال رکھا تھا جس کے لیے وہ واقعی شرمندہ تھا۔
آپ ناشتہ کریں گے۔ اس نے دوبار کہنے پر وہ چونکا۔
ہاں! اس نے سر ہلایا۔
اس نے ٹرے اس کے سامنے رکھی ابلا ہوا انڈہ تھا دودھ کا گلاس تھا اور جیم اور بریڈ تھی۔
وہ دوبارہ کچن میں آ گئی۔
کیسا ہے یار عالی؟ ودعیہ نے بتایا کہ تیری طبیعت خراب ہے۔ ولی نے بھائی سے پوچھا۔
ٹھیک ہوں اس نے ولی کو دیکھا وہ تک سک تیار تھا کہیں جانے کے لیے۔
''ودعیہ میرا کھانا نہ بنانا میں باہر کھا کر آؤں گا۔'' اس نے کھڑے کھڑے کہا۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے تو لے چلوں تجھے؟ اب وہ عالی سے مخاطب ہوا۔
''نہیں، میں پہلے سے بہتر ہوں اب۔'' مختصر جواب ملا۔
اوکے...... میں چلتا ہوں وہ کہہ کر نکل گیا۔
وہ ناشتہ کرنے لگا تب ہی فون کی گھنٹی بجی۔ عالی تو اٹھ نہیں سکتا تھا اس لیے ودعیہ نے اٹھایا۔
''ہیلو السلام وعلیکم ماموں۔''
''جی سب ٹھیک ہے جی ولی بھائی باہر ہیں اور عالی بھائی ناشتہ کر رہے ہیں جی دونوں بالکل ٹھیک ہیں کوئی بات نہیں جی ٹھیک ہے، جی۔'' اس نے فون بند کر دیا جبکہ عالی اس دوران اس کا بڑی سنجیدگی سے جائزہ لیتا رہا تھا۔ وہ بڑے تحمل سے بات کر رہی تھی۔
''تم نے بتایا کیوں نہیں کہ میں بیمار ہوں......؟'' چھوٹتے ہی سوال کیا۔
''کیا فائدہ بتانے کا مامی ماموں خامخواہ پریشان ہو جاتے وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئی بولی۔
''تمہیں بتانا چاہیے تھا۔'' اس نے ٹرے سے ہاتھ کھینچ لیے۔
''مامی آپ سے اتنا پیار کرتیں ہیں وہ بہت زیادہ فکر مند ہو جاتیں اور فوراً آ بھی نہیں سکتیں تھیں وہاں بھی بارش کی وجہ سے کافی برا حال ہے ماموں کہہ رہے تھے کہ انہیں آنے میں وقت لگے گا۔''
وہ ٹرے لے کر اٹھ گئی۔ اس نے پانی اور دوائی اس کے سامنے رکھی۔
یہ لے لیجیے گا، وہ کہہ کر رکی نہیں اور بے رخی سے چل دی۔
جبکہ عالی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی رات میں اس نے میری اتنی تیمارداری کی اور اب پھر وہ پہلے جیسی ہو گئی ہے۔
جو صرف اس سے ضرورتاً ہی بات کرتی تھی ورنہ اُسے مخاطب نہیں کرتی تھی۔''

☆......☆......☆

''تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟'' رقیہ بیگم نے بستر پر بیٹھ کر سوال کیا۔ کس بارے میں؟ وقار صاحب نے اخبار لپیٹ کر کہا۔
''ارے ولی کی شادی کے بارے میں اور کس بارے میں۔'' وہ برہم ہوئیں۔
بھئی بیگم اب میں کیا کہوں؟ سب کچھ تو تم نے طے کر رکھا ہے، پھر مجھ سے پوچھنے کا فائدہ۔ وہ عینک اتار کر دراز ہوئے۔

تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے نا۔ ان کی باچھیں کھل گئیں۔

''اگر ولی اور تمہاری یہ مرضی ہے تو ٹھیک ہے آگے اللہ بہتر کرے۔''

ٹھیک ہے تو پھر کل ہی باقاعدہ رشتہ لے کر چلیں گے۔ وہ خوشی خوشی کہنے لگیں۔

ہوں...... وقار صاحب نے کروٹ لی۔

''ارے ودعیہ کدھر دفعہ ہو گئی ہے؟'' رقیہ بیگم نے کچن میں جھانکا وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں یہ منحوس لڑکی کہاں چلی گئی ہے۔

''وہ سیڑھیوں کے پاس آ کر بولیں۔ ودعیہ او ودعیہ جلدی نیچے آ۔''

جی مامی وہ تقریباً دوڑ کر آئی۔

''کہاں مرگئی تھی منحوس۔'' تیور کافی خراب تھے۔

وہ صفائی کر رہی تھی میں اوپر کی۔ وہ ہاتھ دوپٹے سے صاف کر کے بولی۔

''ہوں...... وہ میرا سبز جوڑا اور اپنے ماموں کا جوڑا نکال کر استری کر دے ہم نے جانا ہے۔''

جی مامی وہ کہہ کر ان کے کمرے میں چلی گئی۔

کہاں جا رہی ہیں امی؟ عالی داخل ہوا۔

تمہاری خالہ کے ہاں جا رہے ہیں ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ولی کا رشتہ شمائلہ کے لیے لے جائیں وہ خوش ہو کر بتا رہی تھیں۔

''او...... عالی نے افسوس سے سر ہلایا۔ بھائی کو اور کوئی نہیں ملی تھی جو شمائلہ کو پسند کر لیا۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

کیا کہا تم نے؟ رقیہ بیگم نے کہا۔

کچھ نہیں۔ مبارک ہو آپ کو آپ کی بھانجی ہمیشہ ڈیرہ ڈالنے آ رہی ہیں۔ وہ مسکرا کر بولا۔

''ہاں بھئی مبارک کرے اللہ بھی۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولیں۔

لاؤنج سے آتی آوازوں کی طرف اس کا مکمل دھیان تھا لو اب تو خالہ اور ان کے خاندان کا ڈیرہ 24 گھنٹے یہاں ہی ہوگا۔ ولی بھائی بھی بس ناں اس نے سر ہلایا۔

شام کو وقار صاحب اور رقیہ بیگم جب ذکیہ کے گھر گئے تو ان کے سامنے بچھی بچھی جا رہی تھیں۔

''ارے آپا تم نے میری آدھی فکر ختم کر دی۔ اللہ تمہارا بھلا کرے۔'' وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر بولیں۔

''آپ کو تو اعتراض نہیں ہے نا انور صاحب۔'' وقار صاحب نے ذکیہ بیگم کے شوہر کو مخاطب کیا جو مسلسل خاموش تھے۔

''لو بھلا ان کے کیا اعتراض ہوگا، گھر بیٹھے بٹھائے اتنا بھلا رشتہ مل رہا ہے۔''

ذکیہ بیگم انور صاحب کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑیں۔

''نہیں بھائی صاحب اعتراض کیسا یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہماری بیٹی کا نصیب جاگا ہے اور وہ آپ کے گھر کی بہو بنی ہے۔'' انور صاحب نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ذکیہ بیگم کے مقابلے میں وہ کافی کم یا پھر ضرورت کی حد تک ہی بات کرتے تھے۔ گھر پر ذکیہ بیگم کا راج تھا۔ وہ بھلا مانس انسان بس خاموش ہی رہتا تھا۔

''ارے شمائلہ کو بلاؤ۔'' رقیہ بیگم نے کھڑے رضوان سے کہا۔

ہاں خالہ بلاتا ہوں وہ آستین سے پان والی لالی صاف کر کے بولا۔

''او شمائلہ ادھر آ۔ خالہ بلا رہی ہیں۔'' وہ وہیں سے ہانکنے لگا۔

''بیٹا اندر سے جا کر لاؤ۔'' وقار صاحب کی نا گواریت کو بھانپ کر انور صاحب بولے۔

''بلانا ہی ہے ناں، یہاں سے بلاؤ یا اندر جا کر کیا فرق پڑتا ہے۔''

رضوان ہاتھ نچا کر بولا۔ جبکہ انور صاحب کو خجالت نے گھیر لیا۔

لو آ گئی شمائلہ وہ اسے راستہ دے کر بولا۔

سلام خالہ، سلام خالو، وہ دونوں کو سلام کر کے بولی۔

جیتی رہ میری بچی جیتی رہ۔ آ اِدھر میرے پاس بیٹھ۔ رقیہ بیگم نے اپنے ساتھ جگہ خالی کی۔

''ذکیہ اب سے یہ ہماری بچی ہوئی۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پر چند بڑے نوٹ رکھ دیے اور سر پر پیار دیا۔ اس کا چہرہ شرم سے لال پیلا ہوئے جا رہا تھا۔ البتہ اس نے مٹھی کو زور سے بند کر لیا۔

''ہاں آپا کیوں نہیں۔'' ذکیہ بیگم نے کہا۔

اے لو نائلہ بھی لے آئی چائے۔ نائلہ ٹرے میں چائے اور دوسرے لوازمات لے کر آئی۔

ارے آپا پہلے تم منہ میٹھا کرو، ذکیہ بیگم ایک رس گلہ ان کے منہ میں ڈال کر بولیں۔ ہاں تم بھی کر لو۔ رقیہ بیگم نے بھی منہ میٹھا کروایا ذکیہ بیگم کا اور شمائلہ کا۔

ارے بھائی صاحب آپ بھی لیں انور صاحب پلیٹ وقار صاحب کے آگے کر کے بولے۔

جی شکریہ انہوں نے ایک گلاب جامن اٹھایا۔

ارے ابو مجھے بھی دو۔ رضوان ندیدوں کی طرح پلیٹ پر جھپٹا انور صاحب نے اسے گھورا مگر وہ نظر انداز کر کے کھانے لگا۔

بھائی صاحب یہ لیں، یہ سموسے میری بیٹی نے اپنے ہاتھ سے بنائے ہیں۔ ذکیہ بیگم نے بازاری سموسوں کو اپنی بیٹی کی مہارت کہہ کر پلیٹ آگے کرنے لگیں۔

نہیں منہ میٹھا کر لیا اب بس چائے پیوں گا۔ وقار صاحب نے معذرت کر لی۔

''تم تو لو آپا۔'' انہوں نے پلیٹ رقیہ بیگم کے آگے کی۔

رقیہ بیگم نے پلیٹ میں ایک سموسہ رکھ لیا۔

وقار صاحب کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھیں، انہیں ان کے گھر کا ماحول بالکل نہیں پسند تھا جہاں صرف عورتوں کی حکمرانی تھی جو مرد کو صرف پیسہ کمانے کی مشین سے زیادہ اہمیت نہیں دیتیں تھیں۔

ان کے نکلتے ہی نائلہ رضوان اور شمائلہ چیزوں پر ٹوٹ پڑے۔

''دیکھا رضوان کے ابا میری عقلمندی کو کیسے میں نے اپنی بیٹی کا رشتہ کروایا ہے۔'' ذکیہ بیگم بڑے فخر سے تخت پر پاؤں پھیلا کر بولیں۔

''ذکیہ یہ تمہاری عقل مندی نہیں ہے بلکہ اوپر والے کا فضل ہے ہم پر جو بیٹھے بٹھائے رشتہ آ گیا۔'' انور صاحب بڑے تحمل سے بولے۔

''ارے میں نے اور میری بیٹیوں نے بڑے پاپڑ بیلے ہیں آپا کو شیشے میں اتارنے کے لیے تمہیں کیا پتا بھلا۔'' وہ نخوت سے بولیں۔

''انور صاحب ایک تاسف بھری نظر ان پر اور پھر اپنے بچوں پر ڈال کر چپ چاپ کمرے سے نکل گئے۔

''ہونہہ ان کے بھروسے ہوتے تو ہو گیا تھا رشتہ۔'' وہ بولیں۔

لڑکیوں بس خود ہی کھانا مجھے نہ دینا۔ وہ

بولیں۔
لواماں یہ کام بھی ہوا میرا تو ہو گیا رشتہ۔ شمائلہ پلیٹ ذکیہ کے سامنے کر کے بولی۔
''ہاں ہو گیا تیرا رشتہ۔ اب بس یہ تیرا کام ہے کہ تو اپنی بہن کو اس گھر میں لے جائے۔'' وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔
''ہاں آپا مگر پہلے اس منحوس کو نکالیں مجھے وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ نائلہ بھی آ گئی۔
''ہاں پہلے تو اس منحوس ودعیہ کو نکالیں گے ایسا نہ ہو کہ دوبارہ پلٹ آئے۔'' ذکیہ بیگم ایک گلاب جامن منہ میں رکھ کر بولیں۔
بس اماں ایک بار جانے دو پھر اس کا ایسا جینا حرام کر دوں گی کہ خود ہی چلی جائے گی۔'' شمائلہ مستقبل کے منصوبے بنا کر بولی۔
''نئی تیرا بھائی کدھر گیا ہے۔'' ذکیہ بیگم نے رضوان کو نہ پا کر کہا۔
''گیا ہو گا کہیں لڑکیاں تاڑنے یا آوازیں کسنے۔'' نائلہ نے ہاتھ گھما کر کہا اور اندر چلی گئی۔
''یہ لڑکا بھی نا بس۔'' اماں اس سے کہو کے اب تو سدھر جائے محلے سے کتنی شکایتیں آ چکی ہیں اس کی۔ شمائلہ نے فکرمندی سے کہا۔
ارے رہنے دے یہ محلے والے ویسے ہی جلتے ہیں اس سے۔ ذکیہ بیگم نے حسب عادت اس کی طرف داری کی۔ شمائلہ چپ ہو گئی۔
☆......☆......☆
ولی بے تابی سے ٹہل رہا تھا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے ظاہر ہو رہی تھی۔
بھائی چائے ودعیہ نے کپ بڑھایا۔
بعد میں لوں گا ذرا امی ابو آ جائیں، ولی بار بار دروازے کو دیکھ رہا تھا۔
عالی نے ودعیہ کے ٹرے آگے کرنے پر کپ پکڑ لیا۔ بھائی بیٹھ جاؤ تمہارے پریڈ کرنے سے وہ جلدی نہیں آئیں گے وہ مذاق اڑا کر بولا۔
جب دل کی تمنا پوری ہو رہی ہوں ناں تو انسان کو اتنی ہی خوشی ملتی ہے تم کیا جانو۔ ولی نے صاف عالی کا مذاق اڑایا۔
جی بالکل ٹھیک فرمایا ابھی تک دل نہیں لگایا ناں ہم نے اسی لیے ایسی خوشی نہیں ملی۔ وہ چائے کا سپ لے کر بے اختیار ودعیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ جو دونوں کی گفتگو سے یکسر بے نیاز کچھ سوچ رہی تھی۔
ودعیہ کو نجانے کیوں اتنا دکھ ہوا تھا کہ ولی کی شادی شمائلہ سے ہو رہی ہے حالانکہ اس نے دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی صاف دیکھی تھی مگر نجانے کیوں وہ خوش نہیں تھی۔ وہ بچپن ہی سے ولی سے کافی اٹیچ رہی تھی اب جب سے وہ شمائلہ میں انوالو ہوا تھا تب سے وہ کافی بدل رہا تھا یا شاید اسے محسوس ہو رہا تھا۔
عالی نے چٹکی بجائی۔ کہاں گم ہو تم؟ عالی اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔
اس نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ گئی ابھی دو دن پہلے ہی تو ایک بار پھر عالی کی وجہ سے مامی نے اسے کتنا ڈانٹا تھا کتنا برا بھلا کہا تھا کہ اس نے بتایا ہی نہیں کہ عالی کو اتنا تیز بخار تھا۔
عالی نے اسے جاتا دیکھا اور افسوس سے گردن جھکا کر وہ پوری کوشش کرنے لگا تھا کہ اب اس کی وجہ سے کم از کم امی اسے نہ ڈانٹیں مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا تھا۔
امی ابو آ گئے ولی گاڑی کی آواز سن کر دروازے کی طرف گیا۔ امی کیسا رہا۔ ولی نے

رقیہ بیگم کے داخل ہوتے ہی بے تابی سے پوچھا۔ ارے پگلے اندر تو آنے دے پھر بتاتی ہوں۔ وہ خوشی خوشی بولیں۔

ارے ودعیہ کہاں ہے تو جلدی سے یہ مٹھائی پلیٹ میں ڈال کر لا۔ انہوں نے ودعیہ کو آواز دی۔

رقیہ بیگم نے ولی کا ماتھا چوما۔ مبارک ہو تجھے ہم تیرا رشتہ پکا کر آئے ہیں ساتھ ہی اس کا منہ میٹھا کیا گیا۔ ولی کو لگا کہ اسے دنیا کی سب سے بڑی خوشی مل گئی ہو۔ سچ امی اس کی آواز چہک رہی تھی۔ ہاں برخوردار وقار صاحب بھی اپنے بیٹے کی خوشی دیکھ کر کچھ مطمئن ہوئے۔

لو اب سکون آ گیا تمہیں بھائی۔ عالی اسے ساتھ لگا کر مبارکباد دے کر بولا۔

مبارک ہو بھائی۔ ودعیہ کی مسکراہٹ پھیکی تھی۔

ارے تم نے اتنی منحوس شکل کیوں بنائی ہوئی ہے تم کس چیز کا سوگ منا رہی ہو۔ رقیہ بیگم اس کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر مشکوک ہوئیں۔

کچھ نہیں مامی بس ذرا طبیعت ٹھیک نہیں وہ شرمندہ ہوئی۔

''ارے بیٹا زیادہ تو نہیں خراب طبیعت۔'' وقار صاحب فکرمند ہوئے۔

''ارے نہیں ماموں میں ٹھیک ہوں۔ وہ انہیں تسلی دے کر بولی۔' اچانک فون کی آواز کی طرف سب متوجہ ہوئے۔

میں سنتا ہوں عالی نے بڑھ کر ریسور تھام لیا۔

''ہیلو! جی ہے یہ لیں بات کریں۔'' اس نے مختصر گفتگو کے بعد ریسور ودعیہ کی طرف بڑھایا۔

''تمہارا فون ہے۔''

کس کا وہ بمشکل بول پائی۔ جبکہ رقیہ بیگم کے کان کھڑے ہو گئے۔

وہ جانتی تھی کہ اس حادثے کے بعد وہ اس پر کتنا شک کرنے لگی تھیں۔ اس نے بھول کر بھی کسی دوست کو اپنا نمبر نہیں دیا تھا۔ اب فون آنا حیرانی کا باعث تھا۔

''تمہارے دادا کا ہے۔'' عالی نے ریسیور تھما دیا۔

جبکہ اس کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔

وقار صاحب تو اٹھ گئے، البتہ وہ تینوں ودعیہ کی گفتگو سن رہے تھے۔ جی دادا میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟

اب وہ دوسری طرف کا جواب سن رہی تھی۔

جی سب ٹھیک ہیں آپ کب ملنے آئیں گے۔ وہ بے قراری سے بول رہی تھی۔

میں کیسے آؤں۔ وہ معصومیت سے بولی۔

شاید دوسری طرف سے اس کو آنے کا کہا گیا تھا۔

جی کوشش کروں گی جی۔ اچھا جی اللہ حافظ ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا اور آنکھوں میں امڈ آنے والی نمی کو اس نے دوپٹہ کے کونے میں جذب کر لیا اور چلی گئی۔

ہونہہ، سالوں سال خبر تک نہیں لی اب ہم نے پال لیا تو یاد آ گئی اور یہ بھی کتنی میسنی ہے جو بے قراری سے پوچھ رہی تھی کہ کب آئیں گے ہونہہ ڈرامے باز۔ رقیہ بیگم کا موڈ بہت بگڑ گیا تھا۔

جبکہ ولی موبائل پر مصروف تھا اور چہرے پر مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ دوسری طرف کون ہے جبکہ عالی افسوس سے گردن ہلاتا ہوا اٹھ گیا۔

☆......☆......☆

آج کل عالی کافی مصروف تھا۔ وہ سی ایس ایس کی تیاری کر رہا تھا جبکہ ودعیہ کے B-A کے پیپر سر پر کھڑے تھے۔

آج انور اور ذکیہ بیگم نے آنا تھا لہذا وہ کچن میں مصروف تھی۔ شامی تلے ساتھ ہی چائے دم پر رکھی۔ اس کے ساتھ اس نے چاٹ بھی بنالی تھی۔

گھنٹی بجی اس نے کھڑکی سے جھانکا انور صاحب، ذکیہ بیگم، نائلہ اور رضوان آئے تھے۔ رضوان کو دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو جاتا تھا۔

اس کے ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگے کیونکہ ان کے سامنے وہ مامی سے ڈانٹ کھانے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

سب لوگ ڈرائنگ روم میں باتوں میں مصروف تھے جب وہ ٹرالی سجا کر اندر داخل ہوئی۔

السلام وعلیکم! مدھم آواز میں اس نے سلام کیا۔

انور صاحب نے بلند آواز میں جواب دیا جبکہ ذکیہ بیگم نے اور سر ہلایا اور نائلہ نے سر ہلانے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی۔

خالہ عالی کہاں ہے؟ نائلہ نے اسے ناپا کر پوچھا۔

بیٹا اوپر ہے کمرے میں جاودعیہ بلا لا۔ رقیہ بیگم نے ودعیہ کو حکم دیا۔

ارے رہنے دیں خالہ میں چلی جاتی ہوں۔ نائلہ ایک ادا سے بولی اور نکل گئی۔

جبکہ ودعیہ چیزیں مہمانوں کے آگے رکھنے لگی۔

دروازے پر دستک ہوئی تو عالی نے کتابوں سے سر نکالا۔

کم آن۔

ہائے عالی، نائلہ نے شوخ آواز گونجی۔

ارے تم وہ ایسے بولا جیسے اس کو پتا ہی نہیں تھا کہ انہوں نے آنا ہے۔ جی ہاں ہم۔ رائل بلو کلر کے سوٹ میں بالوں کو کھولے اور تیز میک اپ میں وہ ذرا بھی عالی کو متاثر نہ کر سکی۔

کیا کر رہے تھے تم؟ وہ ٹیبل سے ٹیک لگا کر اس کے مقابل کھڑی تھی جھک مار رہا تھا وہ مسکرایا۔

ہاں...... ہا...... ہاہاہا اس کی ہنسی گونجی۔ تم بھی نہ عالی اس نے اس کے کندھے پر چپت لگائی۔ جسے اس نے ناگواری سے دیکھا۔

مگر وہ نظرانداز کر گئی۔

تم نیچے نہیں آئے وہ اپنے لمبے ناخنوں کو دیکھ کر بولی۔

نہیں آیا۔ جواب مختصر تھا اسے اس وقت نائلہ کا کمرے میں آنا اور بے فضول باتیں کرنا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ہم آئے تھے تم سے ملنے تمہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ ذرا جھکی تو سلک کا دوپٹہ سرک گیا اور گریبان کا راز کھولنے لگا مگر نائلہ نے نیاز بنی رہی۔

عالی نے نظریں چرالیں مجھے ابھی کام ہے تم چلی جاؤ پلیز۔ عالی نے صاف ریڈ سگنل دکھایا۔ اور کتابوں میں سر دے دیا۔

عالی کے رویے پر سبکی محسوس کرتی وہ نخوست سے سر جھٹکتی ٹک ٹک اپنی لمبی ایڑی والی جوتی کو زمین پر مارتی نکل گئی۔

کتنی فضول حرکتیں کرتی ہے یہ عالی نے تاسف سے سوچا اور کتابوں میں گم ہو گیا۔

وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو بڑے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ جبکہ نائلہ کے نقوش تنے ہوئے تھے جسے صرف ودعیہ نے محسوس کیا۔

بھائی صاحب میرا تو خیال ہے نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

ابھی بس رمضان آنے والا ہے اس میں میرا اور رقیہ کا عمرے کا پروگرام ہے۔ چھوٹی عید کے بعد منگنی کرلیں گے اور بڑی عید کے بعد شادی۔ موسم بھی ٹھیک ہوگا اس وقت۔ وقار صاحب بولے۔

بھائی صاحب یہ منگنی وگنی رہنے دیتے ہیں، سیدھا شادی کرلیں بڑی عید کے بعد۔ ذکیہ بیگم نے فٹ سے کہا کیونکہ منگنی پر ان کا پیسا خرچ ہونے کے زیادہ چانسز تھے۔

یہ بھی ٹھیک ہے ہمیں منظور ہے پھر بڑی عید کے بعد کوئی تاریخ رکھ لیں گے وقار صاحب بولے۔

آپ خیر سے عمرے سے آجائیں پھر تاریخ بھی رکھ لیں گے وہ نہایت ادب سے بولے۔

جی انشااللہ آپ بس تیاریاں رکھیں شادی کی۔

وقار صاحب نے خوشگوار موڈ میں کہا۔

چلو نائلہ سب کا منہ میٹھا کرواؤ۔ ذکیہ بیگم نے منہ بسوری نائلہ سے کہا وہ با دل نخواستہ اٹھ گئی۔

☆......☆......☆

آج وقار صاحب اور رقیہ بیگم کی فلائٹ تھی۔ سارے ایک بار پھر جمع تھے۔ ان کی فلائٹ رات 12 بجے تھی افطاری وغیرہ سے فارغ ہوکر سب اکٹھے بیٹھے تھے سوائے ودعیہ کے جو کچن میں حسب معمول مصروف تھی۔

بھائی صاحب آپ خیر سے واپس کب آئیں گے۔ ذکیہ بیگم نے پر تجسس، لہجے میں پوچھا۔

بس وہاں عید پڑھ کر اسی دن کی فلائٹ ہے واپسی کی، رقیہ بیگم نے جواب دیا۔

ویسے ہی آج تیرا روزہ ہے وہاں آج چودہ ہوگا۔ ہمیں صرف پندرہ دن ملے ہیں وقار صاحب نے کہا ویسے یہ بھی خدا کا خاص کرم ہے کہ آخری عشرہ گزارنے کو مل رہا ہے۔

ہاں بالکل بھائی صاحب آپ ہمارے لیے بھی ضرور دعا کریں کہ اللہ ہم جیسوں کو بھی اپنا گھر دکھائے۔ انور صاحب مؤدب لہجے میں بولے۔

”جی ضرور انشااللہ۔“ وقار صاحب بولے۔

رقیہ بیگم سب سے گلے لگیں اور شمائلہ کا تو خاص کر ماتھا چوما۔

مگر بد نصیب ودعیہ کی طرف تو انہوں نے دیکھا ہی نہیں۔ حالانکہ وہ سب کے درمیان کھڑی تھی۔ اسے نہایت سبکی محسوس ہوئی۔

یہ بات وقار صاحب نے نوٹس کی اور ان کے ماتھے پر شکن کا جال بچھ گیا۔ وہ خصوصاً ودعیہ کو گلے ملے اسکا ماتھا چوما۔ ”تم دونوں کا خیال رکھنا اور اپنا بھی اور گھر کا تو تم رکھتی ہی ہو، مجھے پتا ہے۔“ وہ اسے ہنسانے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

”جی ماموں۔“ وہ ہنس دی۔

شاباش میرا بچہ انہوں نے اسے سر پر پیار دیا۔ پھر سب سے ملے ان کے نکلتے 10 بج گئے۔

ذکیہ بیگم کا ارادہ صبح سحری کر کے ہی جانے کا تھا مگر انور صاحب نے ان کے ارادے پر پانی پھیر دیا اور جانے کا کہا۔ سب کو چارو نا چار جانا ہی پڑا اور ودعیہ نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

آج ماموں کو گئے 9 دن ہو گئے تھے۔ آج اسے زیادہ کام بھی نہیں کرنا پڑا تھا وہ کالج سے اپنی ڈیٹ شیٹ بھی لے آئی عید کے تھوڑے دنوں بعد ہی اس کے پیپر تھے۔ لہذا اب وہ پورے توجہ سے پڑھنا چاہتی تھی۔

اس نے گھڑی پر نظر دوڑائی تو 2 بج رہے

تھے۔ وہ کتابیں کھول کر بیٹھ گی۔ گھر پر صرف عالی تھا وہ بھی ابھی سینٹر سے واپس آیا تھا۔

دفعتاً بیل بجی وہ اٹھنا نہیں چاہتی تھی مگر مسلسل بیل کی وجہ سے اس کا تسلسل پڑھائی کا ٹوٹ چکا تھا سو چاروناچار اسے اٹھنا پڑا۔ گیٹ کھولتے ہی اس کے ماتھے پر آنے والوں کو دیکھ کر واضح شکن نمودار ہوگئی۔ اس نے راستہ چھوڑ دیا۔

شمائلہ، نائلہ اور رضوان داخل ہوئے ہاتھ میں بیگ اس بات کا واضح اشارہ تھے کہ وہ رہنے کی نیت سے آئے ہیں۔

سب کہاں ہیں شمائلہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

عالی اوپر ہوں گے، ولی بھائی آفس میں وہ مختصر سا جواب دے کر خاموش ہوگئی۔

عالی اوپر ہے؟ پھر وہ نیچے کیوں نہیں آیا کیا اسے پتا نہیں کہ ہم آئے ہیں۔ نائلہ نے حیرت سے پوچھا۔

پتا نہیں۔ ودعیہ نے کندھے اچکائے اور اٹھ گئی۔

آج غیر معمولی طور پر ولی افطاری پر موجود تھا۔ ورنہ وہ افطاری پر موجود نہیں ہوتا تھا۔

ودعیہ کا کام پھر سے بڑھ گیا تھا، کہاں وہ اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی کہ کام کم ہے اب وہ آرام سے کتابوں کو ٹائم دے پائے اور کہاں تینوں کی آمد اوپر سے فرمائشیں ایسی جیسے ہوٹل میں آئے ہوں۔

ودعیہ پلیز فروٹ چاٹ چٹ پٹی بنانا۔ شمائلہ نے کہا اور ہاں میرا حلق سوکھ جاتا ہے اس لیے شربت میٹھا اور ٹھنڈا ہو۔

پکوڑوں میں پیاز ذرا زیادہ ڈال لینا پھولے پھولے اچھے لگیں گے۔

نائلہ نے فٹ سے اپنی ہانکی۔ کافی دن ہوگئے ہیں دہی بڑے نہیں کھائے آج افطاری میں بن جائیں تو مزہ آجائے گا۔ رضوان کب پیچھے رہ سکتا تھا۔

اور ودعیہ صرف منہ لٹکائے سب سن رہی تھی۔ وہ بے چاری کچھ بول بھی نہیں سکتی تھی۔ بولنے کا مطلب مامی کے آتے ہی شامت۔

اس نے ولی کو دیکھا مگر شاید اسے شمائلہ کے علاوہ کسی میں دلچسپی نہیں تھی اور عالی کے بارے میں اسے کوئی خوش فہمی نہیں تھی سو چاروناچار وہ کچن میں گھس گئی۔ جبکہ پیچھے سے ہنسی اور قہقہے اس کا خون جلا رہے تھے۔

رضوان چلا گیا مگر شمائلہ اور نائلہ کا ارادہ رہنے کا تھا۔

☆......☆......☆

تین دنوں میں اس کی عقل ٹھکانے آگئی تھی۔ سحری میں فرمائش دونوں بہنیں سحری میں 2 یا تین پراٹھوں سے تو انصاف کرنا فرض سمجھتی تھیں۔ کہاں وہ بے چاری صرف چار پراٹھے بناتی تھی۔ ولی بھائی دو کھاتے تھے عالی ایک اور ایک اپنا اور کہاں سات، سات آٹھ، آٹھ پراٹھے۔ اور افطاری میں الگ فہرست تیار ہوتی تھی۔

آج وہ بے حد تھک گئی تھی۔ کچن سے فارغ ہوکر ابھی اس نے پہلے زینے پر قدم ہی رکھا تھا کہ نائلہ کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

ودعیہ ذرا چائے ہی بنادو موڈ ہو رہا ہے۔

ہاں میرا بھی دل کر رہا ہے شمائلہ نے اپنی لٹ کو انگلی میں گھما کر کان کے پیچھے کیا۔ اور ولی آپ بھی لیں گے ناں، انتہائی پیار بھرا لہجہ تھا۔

اگر آپ کہیں گی تو ضرور لے گے۔ ولی نے بھی جی حضوری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

تم بھی لو گے۔ یقیناً عالی نائلہ نے ایک ادا سے کہا۔
عالی نے ودعیہ کا چہرہ دیکھا۔ تھکن سے واضح آثار اس کے چہرے پر تھے۔ اور مایوسی کی لہر بھی اٹھ رہی تھی۔ اس نے کچن کی طرف قدم بڑھایا۔
کبھی تم اپنی ہاتھ کی بھی چائے پلاؤ ہم تو ترس گئے تمہارے ہاتھ کی چائے پینے کو۔ روزانہ ایک ہی ہاتھ کی چائے پی پی کر دل اچاٹ سا ہو گیا ہے۔
اس نے اپنی آواز میں شرینی گھولی اور نائلہ کو دیکھ کر کہا۔

ودعیہ کے قدم تھم گئے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آنکھوں میں کیا تھا وہ سمجھ نہیں پایا۔
ہاں کہہ تو صحیح رہے ہو۔ اس نے طنز کا تیر ودعیہ پر چلایا۔ اب تم نے کہا ہے تو ضرور، ساتھ ہی عالی کا شیریں لہجہ اس کے سر سے پاؤں تک شاد کر گیا۔

''تم جاؤ ودعیہ اپنے کمرے میں نائلہ بنا دیتی ہے۔ عالی نے ودعیہ سے کہا اور وہ پلٹ گئی۔
عالی آہستہ آہستہ پٹری پر آ رہا تھا یانی چڑھاتے ہوئے نائلہ کے چہرے پر فتح کی مسکراہٹ تھی۔

ادھر شائلہ اور ولی ایک دوسرے میں اتنے مگن تھے کہ انہیں کچھ ہوش نہیں تھی۔
ایک تو گدھوں کی طرح کام کرو اوپر سے سو سو باتیں سنو۔ ودعیہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی اسے اپنی عزت افزائی پر رونا آ رہا تھا۔ میں کیوں رو رہی ہوں؟ عالی سے کوئی امید نہ میں نے کبھی رکھی تھی اور نہ رکھوں گی۔ اس نے الٹے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑ ڈالیں مگر اس کو اپنے آنسو پر قابو ہی کہاں تھا۔

☆......☆......☆

وہ نوٹ کر رہی تھی جب سے شائلہ آئی ہوئی ہے تب سے ولی کی افطاری گھر پر ہوتی ہے اور پھر دونوں اکٹھے بیٹھے پتا نہیں کون سے وفاؤں کے وعدے کرتے رہتے ہیں جو ختم ہی نہیں ہوتے اگر نائلہ پاس بیٹھی بھی ہو تو وہ ایسے ہی بے نیاز دکھتی ہے جیسے یہاں ہے ہی نہیں۔ جبکہ عالی کی اس نے کبھی پروا نہیں کی تھی کہ وہ کب آتا ہے اور کب جاتا ہے؟ اور کیا کرتا ہے......؟''
وہ واحد فرد تھی جو نماز اور تراویح پڑھ لیتی تھی جبکہ باقی سارے اس فرض کو یکسر بھولے ہوئے تھے۔
وہ کچن میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔ صرف دو تین روزے ہی رہ گئے تھے اور اس نے اپنے عید کے جوڑے کو بھی سینا تھا۔ اسے وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ صبح وہ کتابیں لے کر بیٹھ جاتی اور دوپہر اور ساری رات کچن کی نظر ہو جاتی فرمائشی پروگرام پورا کرتے کرتے۔ اس کی نیند بھی ٹھیک سے پوری نہیں ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی اسے اپنی بے بسی پر شدید غصہ آتا اور کبھی کبھی رونا۔ مگر وہ بچپن ہی سے مامی کے زیر تسلط رہنے کی وجہ سے کافی ڈرپوک تھی اور اتنا حوصلہ نہیں رکھتی تھی کہ ان کے مخالف جائے۔
اس نے اپنا دوپٹہ جو نماز کے لیے باندھا تھا کھولا اور کپ میں چائے نکال رہی تھی جب اس نے کھڑکی سے عالی بھائی کو دیکھا جو اندر آ رہے تھے گیٹ سے اندر آئے ہی انہوں نے اپنے سر کی ٹوپی اتاری اور جیب میں رکھ لی۔
''اوہ تو یہ نماز پڑھتے ہیں۔'' اس نے زیر لب کہا۔ مجھے کیا جو بھی کریں ساتھ ہی ازلی بے نیازی امڈ آئی وہ کندھے اچکا کر اپنے اسٹور نما کمرے میں گھس گئی۔

اس دلچسپ ناولٹ کی اگلی
قسط پڑھنا مت بھولیے گا

محبتوں سے گندھی تحریر کا دوسرا حصّہ

داخلی دروازے پر کھڑی مہمان خواتین کو سونف کھلاتی اُم لیلیٰ کو دیکھ کر وہ خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوگیا تھا کیونکہ اُس سے یہاں ملاقات کی بالکل بھی امید نہ تھی اور وہ اُسے تقریباً ڈھائی ماہ بعد دیکھ رہا تھا۔ گہرے پیلے رنگ کے شیفون جارجٹ سوٹ میں جس پر وائٹ پرل خوبصورتی سے جڑے ہوئے تھے، لائٹ نیچرل میک اپ، ہاتھوں میں صرف گجرے پہنے، لانبے بال شانوں پر بکھرائے، مسکراتی ہوئی وہ اُسے مبہوت کرگئی تھی اُس نے اب تک سادے کاٹن کے سوٹ میں دھلے ہوئے منہ کے ساتھ ہی، سیدھی مانگ کی چٹیا میں ہی اُسے دیکھا تھا۔

اسد کے ٹھوکا دینے پر وہ چونک کر میکانکی انداز میں آگے بڑھا تھا، ہانی کی بات کا جواب دینے کو اُس نے گردن موڑی تھی اور اُسی کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے بھرا ہوا چمچہ آگے کیا تھا۔ بات مکمل کر کے اُس طرف مڑی تھی تو ملک زونیر عباسی کو دیکھ کر چمچہ ہی نہیں پلیٹ بھی ہاتھوں سے چھوٹ گئی تھی۔

اُس کی نگاہوں میں وارفتگی سی تھی اور لیلیٰ کی کاجل سے بھری گہری براؤن آنکھیں اپنے اندر غصہ وناپسندیدگی جمع کرتی جھک گئی تھیں اور وہ کسی کو بھی دیکھے بنا اندر کی طرف قدم بڑھا گئی اور ہانی اُس کے پیچھے لپکی تھی۔

''دیکھو ابھی کسی کو کچھ خبر نہیں ہے، تم کیوں اس طرح سب کو خبر کرنے پر تلی ہو۔'' لیلیٰ کمرے میں آکر جانے کی تیاری کرنے لگی تھی تب ہانی غصہ سے بولی۔

''مجھے کسی کی پروا نہیں ہے، میں اُس جگہ نہیں رُک سکتی جہاں وہ گھٹیا شخص ہے۔'' وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنا سارا سامان بیگ میں ڈال رہی تھی۔ اور اُس کو بے قابو ہوتے دیکھ کر ہانی نے فون کر کے ساری صورت حال سبحان کو بتادی تھی۔

''تمہیں میری قسم لیلیٰ تم وہاں سے اس طرح نہیں آؤ گی۔'' سبحان نے فقط اتنا ہی کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔

''تم سب لوگوں کو میں اس سب کے لیے معاف نہیں کروں گی، تم لوگ میرا ساتھ دینے کے بجائے اُس کی حمایت کرتے رہتے ہو۔'' اُس نے سینڈلز پٹختے ہوئے کہا۔

''مجبور ہیں ہم جو ہوا اُسے بدل نہیں سکتے زونیر بھائی تمہیں چھوڑنے کو راضی نہیں ہیں، مصالحت آمیز رویہ تو اپنانا ہی ہوگا کہ اب انہیں نہ برا بھلا کہہ سکتے ہیں نہ جان سے مار سکتے ہیں۔''

''مجھے ہی جان سے مار دو نا تاکہ مصیبت سے ہی چھٹکارا مل جائے۔'' وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ باتھ روم میں گھس گئی۔

''تم دونوں کیا کمرے میں گھس کر بیٹھ گئی ہو، رسمیں شروع ہو رہی ہیں، مما بلا رہی ہیں۔'' انوشے کو اُس نے آنے کا کہا تو وہ واپس پلٹ گئی۔ انوشے اور ولید دو ہی بھائی بہن تھے، ولید کی شادی تھی اور ولید کی شادی اسد کی بہن سے ہو رہی تھی اسی لیے ملک زونیر عباسی لڑکی والوں کے ساتھ آیا تھا کہ وہ اسد کو انکار نہیں کر سکا تھا۔

''ارے یار! وہ یہاں کچھ بھی نہیں کہہ سکیں گی، اور اس طرح ملنے کے تمہیں مواقع ملیں گے تب ہی تو، تُو اُن کے دل میں محبت کا بیج بو سکے گا۔ اس لیے جانے کی بات ہی نہ کر کہ حوصلہ آزمانے کا موقع تو دے تاکہ آج چند گھنٹے برداشت کریں گی تو ہی ساری عمر تجھے برداشت کر سکیں گی، اسی لیے تو میں اس بات کے بھی خلاف تھا کہ تو یونیورسٹی آنا چھوڑ دے۔'' زونیر نے اسد سے جانے کی بات کی تھی تو اُس نے ایک لمبا لیکچر دے ڈالا تھا۔ اس لیے اس نے ارادہ بدل تو دیا لیکن جب وہ کچھ دیر بعد گلابی آنکھوں کے ساتھ پنڈال میں آئی تو اُس سے برداشت نہ ہوا اور وہ جانے لگا۔

ان دونوں کی باتیں ہانی نے سُن لیں اور اُس نے بھی نہ جانے کو ہی کہا۔

''آپ بالکل ہی منظر سے ہٹ جائیں گے تو بہت مشکل ہو جائے گی کہ آپ سامنے آئیں گے تو وہ ناراضگی کا اظہار کرے گی اور ناراضگی، ناگواری ظاہر کرے گی تو ہی دل کی کدورت نکلے گی۔'' وہ کہہ کر رُکی نہ تھی۔

''دیکھا، میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا کہ بالکل لاتعلق ہو جانا بھی دانشمندی نہیں ہے۔'' اسد اُسے لیے اسٹیج پر آ گیا تھا کہ اُس نے اُم لیلیٰ کو وہاں جاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جو ولید کا منہ میٹھا کروا رہی تھی اُس کو اسٹیج پر چڑھتے دیکھ کر بڑے ضبط سے رسم ادا کر کے اٹھی تھی۔

''ہائے واٹ آ پلیزنٹ سرپرائز' آپ اور یہاں؟'' اسد نے کمال کی اداکاری کی تھی، اسٹیج پر موجود ہانی انوشے اور ولید بری طرح چونک اٹھے۔

''اسد بھائی، آپ اُمِ لیلیٰ کو جانتے ہیں؟'' یہ انوشے تھی جس نے بظاہر نارمل لہجے میں ہی کہا تھا مگر وہ یہ سب حسد میں جل کر بولی تھی کیونکہ وہ اگر اس پوری دنیا میں کسی سے نفرت کرنے پر خود کو مجبور پاتی تھی تو وہ صرف اُم لیلیٰ ہی تھی کیونکہ وہ عباد سے محبت کرتی تھی اور عباد اُم لیلیٰ سے محبت کرتا تھا اور عباد کی محبت نے اُسے اُمِ لیلیٰ سے بدگمان کر دیا تھا۔

''ہاں، ہم یونیورسٹی فیلو ہیں۔ آپ سنائیے اُمِ لیلیٰ کیسی ہیں آپ؟'' وہ اُس کو جواب دے کر برے برے منہ بناتی وہاں سے بھاگنے کو پر تولتی اُمِ لیلیٰ کو مخاطب کر گیا تھا۔

''آئی ایم فائن......'' مارے مروت کے

بولی تھی اور بڑی تیزی میں گزرنے لگی تھی کہ اسد نے برابر کھڑے ملک زونیر عباس کو پُش کیا تھا اور وہ تیزی سے گزرتی اُم لیلیٰ سے بری طرح ٹکرایا تھا کہ وہ اس افتاد پر ڈس بیلنس ہوگئی تھی اور گرتی کہ بازو پکڑ کر گرنے سے اُسے بچایا تھا کہ وہ اس کے حصار تلے آگئی تھی۔ اُس کو جیسے کچھ ہوش نہ رہا تھا وہ اُس کے نازک وجود کو حصار میں لیے اُسے یک ٹک دیکھ رہا تھا اور وہ بدحواس ہوتی مچل کر اُس کا حصار توڑ کر نکلی اور جانے کو قدم بڑھائے، کچھ دور جا کر ہی کسی سے بری طرح ٹکرائی، نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو زمین وآسمان گھومتے محسوس ہوئے جبکہ نوواردنے دلکش سی مسکراہٹ اُس کی جانب اُچھالی تھی۔ ''اندازہ نہ تھا کہ تم یوں شاندار استقبال کروگی۔'' نہایت دلکش انداز میں جملہ ادا کر کے لیلیٰ کے پتھرائے ہوئے چہرے کو ہلکے سے

چُھوا تھا اور اُس کے لمس پر لیلیٰ کے سارے احساسات بیدار ہوگئے تھے۔ آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے تھے۔

''ارے آپ رونا نہیں، اب تو میں آ گیا ہوں نا۔'' جیسے ہی اُس کا سرد ہاتھ تھاما تو اُس کے آنسو گرنے لگے تھے اور اُس کے سمجھنے تک وہ بلک اُٹھی تھی۔ رشتے دار ہی نہیں ملک زونیر عباسی کے ساتھ عباد رضوی بھی اُس وقت متحیر رہ گیا جب وہ روتے ہوئے اُس کے سینے سے جا لگی۔

''تم کہاں چلے گئے تھے عباد؟ میں تمہارے بغیر کتنی اکیلی ہوگئی تھی، مجھے تمہاری بہت ضرورت تھی عباد۔'' وہ ہچکیوں کے درمیان بول رہی تھی۔

''تم ٹھیک ہو نہ لالی؟'' وہ پریشان ہوا تھا اور سب کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے نرمی سے اُسے خود سے الگ کیا۔

''میں ٹھیک نہیں ہوں عباد، میں تمہاری لالی، تمہارے بغیر بہت اکیلی پڑ گئی تھی۔ بابا، بابا مجھے چھوڑ گئے، سب کچھ ختم ہو گیا عباد، سب کچھ، تم مجھ سے دور کیا گئے میں نے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہی کھو دیا۔''

''ایسے کیوں بول رہی ہو؟ کیا ہوا ہے بتاؤ مجھے۔'' اُس کے لرزتے وجود کو نرمی سے حصار میں لیے پریشانی سے بولا تھا کہ اُسی وقت اُمِ ہانی چلی آئی اور وہ ہانی کے سینے سے لگتی ہچکیوں سے رونے لگی۔

''ریلیکس لیلیٰ سنبھالو خود کو، سب حیرانگی اور سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔'' اُس نے سرگوشی کی تھی اور وہ خود کی جانب اُٹھی نگاہوں کو نظر انداز کرتی وہاں سے نکلتی چلی گئی۔

''عباد بھائی، وہ بڑے پاپا کی ڈیتھ کے سانحے کو ابھی تک قبول نہیں کر سکی ہے اسی لیے آپ کو اچانک کافی عرصے بعد دیکھ کر کنٹرول نہ کر سکی، آپ پریشان نہ ہوں۔'' ہانی نے عباد رضوی کو تسلی دی تھی۔ وہ کمرے میں آ کر بری طرح روتے ہوئے سجان کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

''پلیز، سجان بھیا مجھے اپنی قسم سے آزاد کر دیں، مجھے واپس آنے کا کہہ دیں ورنہ میں مرجاؤں گی، میں عباد کا سامنا نہیں کر سکتی، مجھے......''

سجان جو اُس کا رونا تڑپنا برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ بے طرح چونک اٹھا۔ ''سجان بھیا، عباد واپس آ گیا ہے اور مجھ میں اُس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ میں اُسے خود پر گزری قیامت بتا نہیں سکوں گی، نہ اُس سے بے رخی برت سکوں گی نہ ہی اُس کی بے رخی برداشت کر سکوں گی۔'' لیلیٰ ہمت سے کام لو حقیقتوں سے نظر نہیں چرائی جا سکتی۔ اب تک صرف تمہاری اور مما کی وجہ سے کہ مما عدت میں تھیں اِن ایشوز کو نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ ہم خاموش تھے، مگر اب یہ بات چھپا نہیں سکتے، عباد کو حقیقت کبھی نہ کبھی پتا چلے گی ہی تو آج ہی کیوں نہیں۔'' وہ دکھی ہونے کے باوجود سختی سے بولا تھا کہ آج صبح ہی تو زونیر کے بڑے بھائی کا یہ پوچھنے کے لیے فون آیا تھا کہ وہ رخصتی کی تاریخ کب لینے آئیں؟ اور اُس نے جلد رابطہ کرنے کا کہہ کر فی الحال بات ٹال دی تھی کیونکہ اُمِ لیلیٰ کو بھی تو راضی کرنا تھا۔

میں نہیں بتا سکتی ہوں حقیقت اُسے کیسے بتاؤں کہ ہمارے راستے جدا ہو گئے ہیں، میں نے اُسے کھو دیا ہے، میں اُسے کبھی نکاح کے بارے میں نہیں بتا سکوں گی۔'' کمرے کے باہر کھڑی انوشے دھک سے رہ گئی تھی۔ جبکہ اُس نے فون بند کر دیا اور اسلام آباد سے کراچی کی فلائٹ کی ٹائمنگ اور سیٹ کنفرم کروا کے مڑی تھی کہ انوشے اُس کے سامنے آ گئی۔

''تم نے نکاح کر لیا لیلیٰ، مگر ہمیں بُلانا تو دور بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔'' اُس کی بات پر وہ ہی نہیں ہانی بھی متحیر رہ گئی۔

''بتاؤ نہ لیلیٰ تم نے کب اور کس سے شادی کی؟'' انوشے بڑے استہزائیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''میں نے کسی سے شادی نہیں کی ہے سمجھیں تم؟'' وہ بھڑک کر چیخی تھی اور اندر داخل ہوتا عباد اُس کی غیر متوقع بات پر شاکڈ رہ گیا۔

''تم نے ابھی سجان بھیا سے کہا تھا فون پر کہ تم عباد کو کبھی اپنے نکاح کے بارے میں نہیں بتا سکو گی۔'' انوشے جو برسوں سے ایک آگ میں جل رہی تھی آج اُسے سرد کرنے کا موقع ملا تھا تو

وہ اگنور نہیں کرسکتی تھی اس سچائی کو کہ عباد اُس سے نہیں بلکہ لیلیٰ سے محبت کرتا ہے۔ وہ اُس کا کبھی نہیں ہوسکتا مگر اب اُسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اپنی محبت کو حاصل کرسکتی ہے اسی لیے اُس کا دماغ بہت تیزی سے کام کررہا تھا کہ اگر وہ اُن کو جدا کرنے کے لیے پلاننگ کرتی بھی رہی تھی تو عمل کبھی نہیں کرسکی تھی۔ مگر آج عمل کرنے کا بہت آسان موقع تھا کہ اُس نے بھڑکتی ہوئی آگ کو شعلے دکھانے تھے۔

''لالی، یہ سب کیا ہے؟ یہ انوشے کیا کہہ رہی ہے؟'' عباد حواس باختہ دروازے پر کھڑا لیلیٰ سے پوچھ رہا تھا۔

''انوشے کس کے نکاح کی بات کررہی ہے۔'' وہ چند قدم چلتا اُم لیلیٰ کے سامنے مجسم سوال بنا کھڑا تھا۔ لیلیٰ نے بڑی بے چارگی سے اُسے دیکھا اور اُس کے رونے میں بھی اضافہ ہوگیا ایسے میں حوصلہ کرکے ہانی ہی آگے بڑھی کیونکہ اُس کی حالت تو ایسی لگ ہی نہیں رہی کہ وہ کچھ بھی کہہ سکے۔

''عباد بھیا، سچائی آپ کو میں بتاتی ہوں۔'' وہ اُس کی جانب گھوم گیا انوشے بھی متوجہ ہوگئی تھی۔

''ملک زونیر عباسی یونیورسٹی میں ہمارا کلاس فیلو ہے اُسے اُم لیلیٰ سے محبت ہوگئی تھی۔ اُس نے پروپوزل بھی بھیجا تھا، مگر اُس کی محبت اور پروپوزل ریجیکٹ کردیے گئے تھے۔

''تم یہ کیا فضول کی داستان سنا رہی ہو، صاف سیدھی طرح سے بتادو کہ اُم لیلیٰ نے ملک زونیر سے نکاح کرلیا ہے۔'' انوشے کو جیسے ہی محسوس ہوا کہ وہ ایک ایک بات ایمانداری سے بتا رہی ہے اور اُسے دھڑکا سا لگ گیا اور وہ درمیان میں بول پڑی۔ ہانی نے اُسے گھورا تھا اور اُس کو کچھ کہتی کہ عباد رضوی بول پڑا۔

''ہاں، صاف بتاؤ نہ کہ لالی کہہ رہی تھی کہ اُس نے مجھے کھو دیا ہے، اس کا مطلب تو یہی ہے کہ لالی نے اُس شخص سے نکاح کرلیا ہے۔''

''ہاں، عباد بھیا، لیکن آپ نہیں جانتے کہ وہ سب کن حالات میں ہوا، اسی لیے تو میں آپ کو بتانا......'' مگر اُس کا جملہ مکمل نہ ہوا۔

''بس، رہنے دو ہانی، وجوہات جان کر میں کیا کروں گا؟ اور تم، تم سے مجھے یہ امید نہیں تھی کہ تم مجھ پر کسی کو بھی فوقیت دو گی، تم مجھ سے کہتی رہیں کہ تم ماسٹرز کرنا چاہتی ہو۔ میں انتظار کروں۔ نہیں کرنی تھی مجھ سے شادی تو صاف کہہ دیتیں، میں نے کون سا تم سے زبردستی نکاح پڑھوالینا تھا۔ انتظار، انتظار کی دہائی دیتی رہیں اور خود انتظار نہ کرسکیں۔'' وہ سچائی جانے بغیر اُس پر الزامات کی بوچھاڑ کررہا تھا اور اُس کو شہہ دینے کو انوشے بھی موجود تھی۔

''پلیز عباد! ایک دفعہ میری بات......'' وہ ملتجی انداز میں بولی مگر اس کا جملہ مکمل سنے بغیر عباد چیخا۔

''اب تمہاری بات سُن کر کیا کروں؟ میں اتنی دور سے صرف تم سے ملنے آیا ہوں' میں ہر وقت تمہارے لیے بے قرار رہا اور تم مجھ سے جھوٹی وفائیں اور جھوٹے وعدے کرتی رہیں، کچھ ماہ سے تم نے کوئی میل، کوئی کال نہ خود کی نہ میری ریسو کی، میں یہ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ تم خالو جان کی موت سے ڈس ہارٹ ہوگی، ایگزامز کی وجہ سے میں مما کی طبیعت کی وجہ سے آ نہیں سکا اور اب آیا تو مجھے تمہارے نکاح کی خوشخبری مل رہی ہے۔ بے وفائی کرنی تھی تو وفا کا راستہ کیوں

دکھایا تھا؟“

راستے بدل رہی تھیں تو بتا دیتیں میں اپنی بیمار ماں کو تو چھوڑ کر نہ آتا۔ کیا غلطی ہوئی مجھ سے، کیا کمی رہ گئی تھی میرے پیار میں جو تم نے مجھ سے بے وفائی کی؟“ وہ اُس کو شانوں سے تھامے بے اعتباری کی منزل پر کھڑا دکھ اور افسردگی سے جھنجوڑ رہا تھا کہ اُس نے اُس کے ہاتھ جھٹکے اور چیخ پڑی۔

”میں نے کوئی بے وفائی نہیں کی ہے عباد، میں نے بے وفائی نہیں کی ہے۔ میں بے وفا نہیں ہوں، میری قسمت نے مجھ سے بے وفائی کر کے مجھے بے وفا بنا دیا ہے۔ میں کل بھی تم سے محبت کرتی تھی آج بھی میری محبت تم ہو، میں نے صرف تمہارے ساتھ کی دعا کی تھی اور جو شخص میرا بن گیا ہے، وہ نہ کبھی میری دعاؤں میں تھا، نہ ذہن و دل میں تھا۔ وہ صرف مجبوری میں میرا بن گیا ہے۔ میرے پاس تمہارے پاس لوٹنے کا راستہ کھلا تھا مگر بے آبروئی کے ساتھ اور میں نے آبرو کے لیے اپنی سب سے قیمتی متاعِ حیات کھو دی کہ میں بے روح ہو کر نہیں جی سکتی تھی اور یہ سب جان کر بھی لگتا ہے کہ میں نے بے وفائی کی ہے تو ٹھیک ہے میں ہوں بے وفا، کہ مجھے بے وفا کہلوانا بہ نسبت اس بات کے مناسب لگا کہ کوئی مجھ پر انگلی اٹھائے کہ میں نے نکاح صرف اپنی نسوانیت کی بقا کے لیے کیا کہ محبت تو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر مل جاتی ہے (یا ایک نئی محبت ہو جاتی ہے) مگر عزت چلی جائے تو ساری زندگی کے لیے دامن داغدار ہو جاتا ہے کہ کھوئی ہوئی عزت زندگی کے کسی موڑ پر نہیں ملتی۔“ لیلیٰ نے سختی سے اپنی آنسوؤں سے تر آنکھوں کو رگڑا بیگ اُٹھا کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی چند ثانیے عباد کے چہرے کو دیکھا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

”الوداع عباد!“ اور تیزی سے نکلتی چلی گئی۔

عباد بت بنا کھڑا رہ گیا اُس نے اُسے روکنے کو ہاتھ بڑھایا، پکارنے کو لب تھرتھرائے، ہاتھ اُٹھا ہی رہ گیا اور لب محض کانپ کر رہ گئے اور وہ اُس کو روک نہ سکا اور وہ چلی گئی۔

آنے والے دنوں میں وہ خاموش ہو گئی تھی اُس نے نہ رخصتی سے انکار کیا نہ ہی کوئی واویلا مچایا اور خاموشی سے ایک اَن چاہے شخص کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ عباد واپس چلا گیا، انوشے نے اس سے محبت کا اظہار کر دیا اور اُس نے سوچنے اور دل کو سمجھانے کے لیے وقت مانگا تھا۔ دل میں دکھ آنکھوں میں بے بسی لیے اُس ملک میں کبھی نہ لوٹ آنے کے فیصلے کے ساتھ چلا گیا۔ انوشے کے سجدے اور دعائیں لمبی ہو گئی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کا رب اُس کی سن لے گا۔

اُمِ لیلیٰ کی رخصتی بڑی خاموشی سے ہوئی تھی اور ساتھ ہی ہانی کی بھی رخصتی عمل میں آ گئی تھی اُسے تو محض ایک کمرے سے دوسرے کمرے کا سفر کرنا تھا مگر وہ دوست کی افسردگی و دکھ کو محسوس کرتی اپنی زندگی کے اہم دن پر بھی خوش نہ تھی۔

☆......☆......☆

سفر کی تھکان کے ساتھ ذہنی تھکان بھی تھی اُس سے وہاں بیٹھا تک نہیں جا رہا تھا مگر وہاں کسے پروا تھی نہ جانے کہاں کہاں کی کون کون سی رسمیں ادا کی جا رہی تھیں اور اُس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا، اس کے چہرے پر گھونگھٹ گرایا ہوا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے اس کڑی منزل سے گزر رہی تھی کہ اُس کے کانوں میں آواز گونجی تھی۔

”ساری رسمیں ہو گئیں اب، منہ دکھائی کی رسم ہو گی، مردان خانے سے زونیر کو بلا لو۔“ اور

وہ خود کو نئے امتحان کے لیے تیار کرنے لگی تھی۔ وہ غالیچے پر نیچے ہی بیٹھی ہوئی تھی، اُس کے عین سامنے ملک زونیر عباس کو بیٹھنے کو کہا گیا تو زونیر کو لگا کہ اب اُس کا بھی امتحان شروع ہو چکا ہے اور وہ یہی سب سوچتے اُس کے سامنے جا بیٹھا۔

رسم کے مطابق دلہن کا گھونگھٹ اوپر کر دیا تھا، رخساروں پر بہتے موتی، بند لرزتی پلکیں، کپکپاتے لب وہ بے خود ہو گیا تھا اور وہ ساری عورتیں متحیر سی دیکھ رہی تھیں کہ گھونگھٹ الٹے جانے کے بعد روتی ہوئی دلہن پہلی ہی دفعہ دیکھی تھی اور اُس کی بے انتہا خوبصورتی، ملک زونیر عباسی کی پسند کی وہ سب دل ہی دل میں تو زبان سے بھی داد دینے لگی تھیں۔ وہ یک ٹک اُس کے حسین چہرے کو دیکھ رہا تھا جو بگڑے میک اپ اور آنسوؤں میں بھی اُس کے ہوش اڑا رہی تھی۔ وہ مبہوت تھا کہ شاہ تاج کی آواز پر چونکا۔

''زونی بیٹا، اپنی دلہن کو بعد میں دیکھتے رہنا، سب منتظر ہیں، دلہن کی چوڑیاں اُتارو تا کہ آگے کی رسمیں پوری کی جاسکیں۔'' وہ بری طرح جھینپ گیا تھا کہ اس وقت کمرے میں رشتے دار اور گاؤں کی ہر عمر کی خواتین موجود تھیں۔ اُس نے آواز پر جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور وہ اُن بھیگی آنکھوں میں ڈوبنے لگا تھا کہ اُن میں ہلکورے لیتی نفرت نے سارے احساسات پر مٹی ڈال دی۔

''ہاتھ آگے کرو زونی کی دلہن۔'' بی بی شاہ تاج اپنے مخصوص سخت انداز میں کہا مگر وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملتی بری طرح گھبراہٹ کا شکار تھی تبھی بی بی شاہ تاج کے ایک اشارے پر بڑے بھائی کی بیوی اُس کے برابر آ بیٹھی اور دونوں ہاتھوں کو الگ کر کے سیدھا ہاتھ ملک زونیر کے آگے کیا تھا اور کچھ دیر کی ہچکچاہٹ کے بعد اُس کا کانپتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

''زونی بیٹا، ایک چوڑی بھی ٹوٹنی نہیں چاہیے۔'' شاہ تاج اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولیں۔ ماں کی بات پر وہ ہولے سے مسکرایا اور بہت نرمی سے درجنوں چوڑیاں اُتار کر ماں کے دیے خاندانی دو کنگن سیدھی کلائی میں اور سونے کی 4 چوڑیاں بائیں کلائی میں چڑھا دی تھیں۔

''زونی پاؤں آگے کر دو، اور زونیر کی دلہن اپنے مجازی خدا کے پاؤں چھو کر کھڑی ہو جاؤ۔'' اگلا حکم صادر ہوا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ لیلیٰ کی نگاہوں میں بے شمار شکوے تھے جنہیں محسوس کر کے زونی ماں سے بولا۔

''بے بے ان سب فضول رسموں......'' مگر اُس کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ شاہ تاج نے دھیمی مگر سخت آواز میں اُسے ٹوکا۔

''بس آگے ایک لفظ نہیں، جو کہا جا رہا ہے دونوں خاموشی سے عمل کیے جاؤ۔'' اُن کے ڈپٹنے پر وہ خائف ہو گیا تھا اور لیلیٰ نے میکانیکی انداز میں اُس کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور کھڑی ہو گئی پھر کمرے میں موجود تمام خواتین کے پاس باری باری جا کر دعائیں لیں۔ اس سارے عمل میں شاہ بانو نے اُس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ ان زبردستی کی رسموں سے اب لیلیٰ پر ذہنی اور جسمانی تھکن بڑھنے لگی تھی۔

تبھی نیا حکم جاری ہوا کہ وہ باورچی خانے میں جائے اور جا کر سوجی کا حلوہ بنا لائے، اس پر تو وہ جگہ سے ہل بھی نہ سکی اور بی بی شاہ تاج کے دوبارہ کہنے پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی تو اُن کو غصہ سا آ گیا۔

''کچھ کہا جا رہا ہے زونیر کی دلہن یہ ہمارے

ہاں کی رسم ہے، باورچی خانے میں بھیجنے کو ہی تو چوڑیاں اُتارنے کی رسم ادا کی گئی تھی۔'' جاؤ بڑی دلہن دیورانی کو باورچی خانے تک لے جاؤ۔

''مم...... مجھے حلوہ بنانا نہیں آتا۔'' وہ ضبط کرتے ہوئے بھی رو پڑی تھی اور زونی بے بسی سے اُس کو دیکھ رہا تھا جس کی بات سُن کر عورتوں کے منہ کھل گئے تھے تو کچھ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

''حلوہ نہ سہی، میٹھے میں جو بنانا آتا ہے وہی بنالو کہ رسم تو ہر حال میں ہی کرنی ہے۔''

''مجھے کچھ بھی بنانا نہیں آتا۔'' وہ بے حد شرمندگی سے بولی اور اب اُسے شدت سے ماں یاد آنے لگی جو اُس کو گھر داری پر توجہ دینے کو کہتی تھیں مگر اُس نے کچن میں کبھی قدم رکھا ہی نہ تھا، چائے، جوس جیسی چیز بھی کبھی اُس نے نہیں بنائی تھی جبکہ اُس کے برعکس اُم ہانی گھر داری کے ہر ایک کام میں طاق تھی، چھٹیوں میں وہ کوکنگ، بیکنگ، سلائی وغیرہ کے ہی کورس کرتی تھی اُسے ان سب چیزوں کا شوق تھا اور لیلیٰ کمپیوٹر کورسز ہی کرتی تھی اُسے اُسے ان کاموں اور چیزوں سے کبھی دلچسپی نہ تھی۔ ماں کہتی تھی کہ شادی کے بعد کیا کرو گی؟ تو وہ جب سر پر پڑے گی تو کرلوں گی کہہ کر جان چھڑا لیتی تھی کہ کہاں اندازہ تھا کہ قسمت ہر موڑ پر ہی اُس کو جھکانے والی ہے۔ سسرال میں قدم رکھے محض ڈیڑھ گھنٹہ ہی ہوا تھا اور اُسے کچن میں بھیجا جارہا تھا۔ اُس کی بات پر عورتیں بھن بھن کرنے لگی تھیں۔

''لو پہلی ہی عورت دیکھی ہے جسے کھانا ہی بنانا نہیں آتا۔'' دور پرے کی ایک عمر رسیدہ خاتون بولی تھیں۔

''ارے اصغری خالہ شہر کی کڑی ہے، سارا وقت تعلیم اور فیشن میں ہی برباد کیا ہوگا، فرصت ہی نہ ملی ہوگی کہ اِس طرف بھی دھیان دے، ہماری بچیوں کی طرح تھوڑی کہ 9 برس کی عمر سے ہی گھر کے کام کاج سکھانے شروع کردیے جاتے ہیں تاکہ بیٹی جب بہو بن کر سسرال میں قدم رکھے تو سسرالیوں کا پہلے ہی قدم پر دل جیت لے۔ مگر اسے زمانے کی اونچ نیچ کی خبر نہ تھی تو اُس کی ماں نے بھی کچھ نہ سکھایا۔'' وہ اُس اجنبی عورت کی باتیں سر جھکائے بڑے صبر سے سُن رہی تھی مگر اپنی ماں کے بارے میں ایک لفظ نہ سُن سکی۔

''آپ کو میری مما کے بارے میں کچھ بھی کہنے کا حق نہیں ہے۔'' روانی سے بہتے آنسو پونچھے تھے۔

''شہری کڑیوں میں یہی برائی ہوتی ہے، بڑوں کی عزت تک کرنے کے آداب سے ناواقف ہوتی ہیں۔'' سسرال میں آئے چند گھنٹے ہی ہوئے ہیں اور زبان درازی کا عالم، اللہ اللہ، شاہ تاج تم تو بری پھنسیں ساری عمر خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

وہی خاتون طنزیہ لہجے میں بولی تھیں۔ جو ملک زونیر عباسی کے والد کی چچازاد بہن تھیں اور انہیں پوری امید تھی کہ ان کی اکلوتی بیٹی خوبرو ملک زونیر عباسی کی دلہن بنے گی کہ ایک انہی کی بیٹی ملک زونیر عباسی کے جوڑ کی تھی۔

''ہاں، ہم نے بھی سمجھایا تھا کہ غیر برادری کی لڑکی نہ لاؤ۔'' ملک زونیر عباسی کی نانی نے بیٹی کو گھورا تھا۔ لیلیٰ کی ہمت اب جواب دے رہی تھی۔ پھر سر درد نے اسے بالکل نڈھال کردیا تھا تب اسے ان سب لوگوں میں زونی ہی اپنا نظر آیا اور اس نے دھیرے سے اُسے مخاطب کیا۔

''ملک زونیر میں بہت تھک گئی ہوں، آرام

کرنا چاہتی ہوں۔'' ایک لمحے کے لیے ملک زونیر بھی اس نئی صورت حال پر دم بخود رہ گیا اور وہاں موجود عورتیں مارے حیرت کے دانتوں تلے انگلیاں داب گئی تھیں کہ اتنی بے تکلفی سے شادی کے سالوں بعد بھی انہوں نے اپنے شوہر کو مخاطب نہ کیا تھا اور نہ ہی اتنی بے باکی سے نام لیا تھا۔ شاہ تاج غصے سے بھڑکتی کچھ کہنے لگی تھیں کہ ملک زونیر نے آگے بڑھ کر اُن کا ہاتھ تھام لیا اور آنکھوں میں التجا لیے انہیں دیکھا تھا۔

''رفیہ، دلہن کو کمرے میں لے جاؤ۔'' انہوں نے اس کی التجا نظر انداز نہ کی تھی کہ ویسے بھی وہ مزید تماشا نہیں لگانا چاہتی تھیں۔ دلہن کے منظر سے ہٹتے ہی مہمان عورتیں ایک ایک کر کے چلی گئیں۔

''خیر تو ہے تاجی ساری زنانیاں چلی گئیں۔ رسمیں اتنی جلد ختم ہوگئیں۔'' بڑے ملک نے کمرے میں آتے ہی سوال کیا۔

''خیر سے تماشا بن گیا ہے سب برادری والوں کے سامنے ہمارا۔'' وہ تو بھری بیٹھی تھیں جو ہوا تھا سب بتا دیا۔ بڑے ملک کے اعصاب تن گئے۔

''یہ گُڈی نے اچھا نہیں کیا برادری کا معاملہ تھا۔'' انہوں نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

''آئندہ ایسی کوئی بات ہوئی تو اُسے جان سے ماردیں گے۔ بیٹے کی محبت میں روایات توڑیں، ذلت برداشت کی بس اتنی ہی برداشت تھی ہماری۔'' شاہ تاج نے کچھ کہنا چاہا مگر اُن کو خاموش رہنے کا اشارہ کر کے وہ کھڑے ہوگئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے وہاں سے چلے گئے۔ شاہ تاج کی فکروں میں مزید اضافہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

''آپ کو مجھ پر غصہ ہے، مجھ سے نفرت ہے تو اظہار بھی مجھ سے کیجیے، سزا دینی ہے تو سزا دیں، یوں سب رشتے داروں کے سامنے آپ کو تماشا نہیں لگانا چاہیے تھا۔'' وہ کمرے میں آیا تو لیلیٰ واش روم سے نکل رہی تھی۔

''تماشا میں نے نہیں لگایا، آپ سب نے مل کر مجھے تماشا بنا دیا ہے، میں نے اپنے مزاج اور غصہ کے باوجود وہ سب صبر سے برداشت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اپنی مما کے بارے میں ایک غلط لفظ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے مجھے بولنا پڑا، اور یہ سب آپ سے نفرت کے اظہار کے لیے نہیں اپنی مما کے دفاع کے لیے کیا تھا آپ سے نفرت کا اظہار کرنا ہوتا تو نہ چاہتے ہوئے بھی رسمیں ادا نہ کرتی، وہاں کس طرح بیٹھی رہی تھی یہ تو بس میں ہی جانتی ہوں۔'' آنسو آنکھوں میں جمع ہونے لگے تو وہ خاموش ہوگئی اور ضبط کے باوجود اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ زونی ایک ٹک دشمن جاں کو تکتا رہ گیا۔

وہ اُس کی نگاہیں خود پر محسوس کرتی جزبز ہوگئی تھی اور پلٹی تھی کہ وہ اُس کی کلائی تھامتا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ نے کنگن کیوں اتار دیے؟ ہمارے ہاں شگن کے کنگن سہاگنیں نہیں اُتارا کرتیں۔'' وہ اس کے نرم ہاتھ تھامے جذبوں سے چور لہجے میں بولا تھا۔ اور وہ بری طرح گڑبڑا گئی تھی۔

''ہا، ہاتھ چھوڑیں میرا......'' وہ منمنائی تھی مگر اُس نے کلائی کو یوں جھٹکا دیا تھا کہ وہ اُس کے سینے سے آ لگی تھی۔

''آئی لو یو اُم لیلیٰ......'' اُسے حصار میں لیتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

''بٹ آئی کانٹ...... لیوی۔'' وہ بری طرح

مچلی تھی۔
''اُم لیلیٰ میں چاہتا ہوں گزری ہر تلخی کو بھلا کر ہم ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کریں۔'' اُسے حصار سے آزاد کر کے بولا تھا۔
''میں اپنی بے وقعتی اتنی آسانی سے نہیں بھول سکتی، ہاں کوشش ضرور کروں گی۔'' وہ نگاہ چرا کر بولی۔
''تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے، زندگی کیسے گزرے گی؟'' وہ بے حد تلخ ہو رہا تھا۔ لیلیٰ جواب دیے بغیر جانے لگی تھی کہ اُس نے جارحانہ انداز میں اُس کا بازو جکڑ لیا تھا۔
''کچھ پوچھا ہے میں نے......''
''میں جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی، آپ ہاتھ چھوڑیں میرا۔ مجھے آپ کا چھونا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'' وہ اُس سے زیادہ تلخی سے بولی تھی۔
''کیوں اچھا نہیں لگ رہا ہے؟ یہ مت بھولو نکاح میں ہو میرے۔'' اور یہ بات لیلیٰ کو تیر کی طرح لگی۔
''جانتی ہوں یہ تلخ اذیت ناک حقیقت بتانے کی ضرورت نہیں ہے اور جو کرنا چاہیں کر سکتے ہیں کہ میں یہ تو بھول ہی گئی تھی کہ زبردستی نکاح پڑھوایا ہی کیوں گیا تھا۔ آپ اپنا حقِ ملکیت جتا سکتے ہیں۔ مگر یاد رکھیے گا ملک زونیر عباسی کہ آپ ہمیشہ صرف مجھے مجبور کر سکتے ہیں میرے دل میں کبھی کوئی مقام نہیں پا سکتے۔ رشتہ نباہنے کے لیے مجھے مجبور کر سکتے ہیں، رشتے کو اہمیت دینے کے لیے نہیں کہہ سکتے کہ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں اتنی نفرت کے یہاں تک کا سفر کرنے سے قبل خودکشی کے ہزار منصوبے بنائے مگر عمل نہ کر سکی، اور آپ کو تو صرف میرے جسم تک رسائی ہی حاصل کرنی ہے نہ تو کر لیجیے کہ میں کم ہمت نہ ہوتی تو خود کو آپ کے سپرد کرنے سے قبل موت کو گلے لگا لیتی لیکن مجھے حرام موت مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اس لیے ہوں میں آپ کے سامنے آپ اپنی ہر ایک خواہش پوری کر لیں۔'' لیلیٰ کی بات پر وہ پھٹ پڑا۔
''جسم کی چاہ نہیں ہے مجھے، وگرنہ نکاح کا تردد ہی نہ کرتا، محبت کی ہے، عزت بنایا ہے اسی لیے اب تک آپ کی ہر کڑوی ہتک آمیز گفتگو برداشت کرتا رہا ہوں، مگر میں آپ کے احترام میں خاموش ہوں۔ آپ پر ہوئے ظلم کا ازالہ چاہتا ہوں، اس لیے نرمی برت رہا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ حد سے گزر جائیں، میری توہین کریں، میری انا و غیرت کو للکاریں، مجھے بدکرداری و ہوس پرستی کا طعنہ دیں کہ اگر آپ اپنے کردار اور عزت کی بقا کے لیے ایک اَن چاہے رشتے میں بندھ سکتی ہیں تو میں بھی اپنی مردانگی و غیرت کی حفاظت کے لیے ہر حد سے گزر سکتا ہوں۔'' وہ اُس کے بے لچک انداز اور سرخ آنکھوں سے سہم سی گئی تھی۔
''آپ تلخیوں کو بھلا کر جئیں یا سینے سے لگا کر آئی ڈونٹ کیئر۔ آپ بس یہاں سے نہیں جا سکتی ہیں۔ جس حد تک گر سکتی ہیں گر جائیں۔ مجھے اور میرے گھر والوں کو تماشا بنا دیں۔ مگر رہنا پھر بھی ملک زونیر عباسی کی بیوی بن کر ہی ہوگا، ہاں چاہے نام نہاد بیوی ہی سہی، رشتوں اور روایتوں میں جکڑا ہوا ہوں اس لیے مجبور ہوں وگرنہ میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں، اس لیے اطمینان رکھیے گا اور جو گھٹیا سوچ لفظوں سے بیان کی ہے پہلی و آخری بار تھی کہ میں جب آپ کی عزت کے لیے اپنے بھائی سے لڑ سکتا ہوں تو اپنی غیرت کے لیے آپ سے بھی لڑ سکتا ہوں۔'' ملک زونیر نے ایک

نظر اُس کے لرزتے وجود پر ڈالی اور تکیہ اُٹھا کر صوفے پر ڈالا اور لیٹ گیا۔ اُس کا دماغ بری طرح کھول رہا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ کیا سے کیا کر جاتا اور وہ دھیمے سے مزاج کے ملک زونیر عباسی کا جارحانہ سخت روپ دیکھ کر ڈر گئی تھی۔

لرزتے قدموں سے بیڈ تک گئی تھی مگر نیند تھی کہ مہربان نہ ہوئی تھی اور یہی حال زونی کا بھی تھا کہ اُس کے الزام پر وہ تڑپ اٹھا ہے کہ اُس نے اُمِ لیلیٰ سے پاک کچی محبت کی تھی۔

''بڑے لالہ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ آپ کے ایک قدم نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے، میری محبت، میری بیوی، مجھ سے بدگمان ہے، مجھے لوز کریکٹر سمجھ رہی ہے، میں جس نے کبھی باپ دادا کی روش اختیار نہ کی، عورتوں سے راہِ رسم تو کیا بات چیت کی حد تک بھی تعلق نیں رکھا اور میری ہی بیوی نے جو آج جوتا مارا ہے۔ اُس کی تکلیف مجھے ساری زندگی چین نہیں لینے دے گی۔ آپ نے میری محبت میں مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔'' وہ بڑے بھائی سے بدگمان ہونے لگا تھا کہ ان کی ضد نے ہی اُسے یہ دن دکھایا تھا۔

''اُمِ لیلیٰ آپ اب ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گی جو میرے لیے باعث شرمندگی ہو۔'' وہ نہا کر واش روم سے نکلا تھا۔ بنا دیکھے لیلیٰ کو تنبیہ کی اور کمرے سے نکل گیا۔ اُس کے جاتے ہی بڑے بھائی کی بیوی آ گئی تھی۔

''السلام علیکم!'' اُس نے بستر سے اُٹھتے ہوئے سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام، تم نے کپڑے نہیں پہنے، جلدی سے تیار ہو جاؤ، گھر کے مرد منہ دکھائی کی رسم نہیں کر سکے تھے، وہی رسم ہو گی، اُس کے بعد ناشتہ کیا جائے گا۔'' اُس نے خاموشی سے کپڑے اٹھائے اور واش روم میں گھس گئی۔

سرخ رنگ کی گھیر والی فراک اور کھلے پائنچوں کی شلوار اُس پر کافی سوٹ کر رہی تھی۔ بھاری بھاری جیولری اس نے بہت خاموشی سے پہن لی تھی جبکہ وہ کافی نازک اور نفیس جیولری پہننے کی عادی تھی۔

''زونیر کی دلہن تم نے کنگن کیوں اتار دیے؟ ہمارے ہاں دولہا کے پہنائے کنگن دلہن کبھی نہیں اُتارتی۔'' شاہ تاج نے اُس کے خالی ہاتھ دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کیا۔

''آئی ایم سوری! مجھے پتا نہیں تھا جیولری کے ساتھ اُتار دیے تھے، میں دوبارہ پہن لیتی ہوں۔'' رات ایسا ہی کچھ تو ملک زونیر عباسی نے بھی کہا تھا۔ اس لیے وہ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ ملک زونیر کو آتا دیکھ کر شاہ تاج کھڑی ہو گئی اور بولی۔

''میں چلتی ہوں۔ زونی تم دلہن کو کنگن پہنا دینا، اِس کو پتا نہیں تھا تو تم تو بتاتے......'' وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔

''آپ نہ جائیں کہ بڑے سب رسم کے لیے آ رہے ہیں۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

شاہ تاج نے کنگن لیلیٰ کے ہاتھ میں دیے اور زونی کی جانب اشارہ کیا۔ یہ لمحہ لیلیٰ کے لیے بہت مشکل تھا۔ وہ کیسے ملک زونیر سے کہے کہ اُس کو کنگن پہنا دے۔ بہر حال یہ معرکہ تو طے کرنا ہی تھا۔ شاہ تاج کی موجودگی اُسے پریشان کر رہی تھی۔ ذرا سا جھک کر صوفے پر آنکھیں موندے زونی کا کاندھا ہلایا۔

تو اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تک سک سے تیار ڈری جھجکی اُمِ لیلیٰ سامنے کھڑی تھی۔ وہ سیدھا ہوا اور اُس نے کنگن اُس کے سامنے کر دیے تھے۔ زونی نے خاموشی سے اُس کے

ہاتھ سے کنگن لیے اور اُس کا ہاتھ تھام لیا اُس کو لگا جیسے کوئی گرم شے اُسے چھوگئی ہو، وہ اُس کو دیکھنے لگی مگر وہ اُسے نہیں دیکھ رہا تھا، سنجیدگی سے کنگن اُس کی کلائی میں چڑھا دیے تھے۔

''آئی تھنک، آپ کو فیور......'' ابھی لیلیٰ کا جملہ مکمل نہ ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی اور وہ پہلی فرصت میں اُس کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ ملک زونیر عباسی کے والد، چچا اور کزن آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوگئے۔ جن کو اُس نے سلام کیا تھا۔ وہ ایک ایک کے سامنے جا کر سلام کرتی رہی اور سب نے ہی سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے دعائیں دی تھیں۔

''بڑے لالہ کہاں ہیں بے بے، وہ نہیں آئے؟'' اُن چاروں میں زونیر کو بھائی کی کمی کھلی تھی۔

''اُسے آنے کا کہہ دیا تھا، لیکن آیا کیوں نہیں، جاؤ دلہن اپنے سر کے سائیں کو بلا لاؤ۔'' بڑی بہو خاموشی سے باہر نکل گئی۔ تبھی بڑے ملک نے لیلیٰ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تم اس حویلی کے سب سے لاڈلے فرد کی بیوی ہو، یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، اور تم نے یہاں کے لوگوں کو اپنا سمجھنا ہے، ہماری روایات کو سمجھنا اور اُن پر چلنا ہے، ہمیں امید ہے ہمارے زونیر کی دلہن ہمیں مایوس نہیں کرے گی۔'' انداز دھیما مگر اٹل تھا۔ جیسے وہ اُسے بتا نہیں بلکہ وارننگ دے رہے ہوں۔ اتنے میں زونی کے بڑے بھائی بھی کمرے میں داخل ہوئے۔ تبھی زونی نے لیلیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اُمِ لیلیٰ، بڑے لالہ کو سلام کیجیے۔'' اُس کے بے لچک لہجے پر لیلیٰ نے بے بسی سے اُسے دیکھا تھا اور اُس کے غیر معمولی سنجیدہ چہرے سے نگاہ ہٹا کر بہت آہستگی سے سلام کیا۔ اندر کا غصہ اور بے زاری انداز اور لہجے سے عیاں تھی۔

''جھک کر بڑے لالہ سے دعائیں لیں اُمِ لیلیٰ۔'' اُس نے نیا حکم جاری کیا تھا اور اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی آگے بڑھ کر سر تھوڑا سا جھکا دیا تھا اور انہوں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''سدا خوش رہو، سدا سہاگن رہو۔ ہو سکے تو ماضی کی تلخیوں کو بھلا دینا تم اب ہماری عزت ہو اولاد کی طرح عزیز ہو۔ جو کچھ ہوا وہ میں نے کیا زونی کو تو علم بھی نہیں تھا۔''

''لالہ یہ آپ کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے آپ بھی پرانی باتوں کو بھول جائیں آپ میرے لیے قابل احترام ہیں۔''

''چلیں مجھے بھوک لگی ہے ناشتہ کرتے ہیں چل کر۔'' اور وہ دونوں بھائی ہنستے مسکراتے بڑے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اور اُمِ لیلیٰ نے کمرہ خالی ہو جانے پر دوپٹا سر سے اُتار کر صوفے پر ڈالا اور خود بستر پر گر سی گئی۔

ملازمہ اُس کو ناشتے کے لیے بلانے آئی تھی مگر اُس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ انداز کھلی بغاوت تھا۔ جو اب زونی کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ تبھی اُس نے بڑے ملک سے کہا۔

''ابے میں اُسے شہر لے جانا چاہتا ہوں۔ بے لگام گھوڑی اور ضدی گھمنڈی عورت کو لگام ڈالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے اور یہاں رہ کر وہ تماشا لگائے، برادری والوں کے سامنے آپ سب کو شرمندگی اٹھانی پڑے اُس سے قبل ہی مجھے اُسے شہر لے جانا چاہیے۔'' وہ ناشتہ کیے بغیر اٹھا تھا اور غصے سے کھولتے باپ سے بولتا اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔

''رفیہ، اُمِ لیلیٰ کا سامان گاڑی میں فوراً رکھوا

دو۔'' وہ باپ کے انکار و اقرار کو سُنے بغیر فیصلہ صادر کرتا روم میں آ گیا وہ بیڈ پر اوندھی پڑی سسک رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر سیدھی ہوئی تھی مگر اُس نے اُس کی طرف دیکھا تک نہیں، شہر لے جانے والا ضروری سامان بیگ میں ٹھونسا اور اس کام سے فارغ ہو کر اُس نے ہچکیوں سے روتی اُم لیلیٰ کو مخاطب کیا۔

''آپ یہاں میرے رشتوں کے ساتھ رہنے کے قابل ہی نہیں ہیں، مس اُم لیلیٰ، اُٹھیے میں آپ کو شہر لے جا رہا ہوں۔'' وہ رونا بھول کر اُس کو دیکھنے لگی، مگر جب وہ پانچ منٹ تک ٹس سے مس بھی نہ ہوئی تو اُس نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو جکڑا۔

''بھول رہی ہیں آپ شاید کہ سیدھی انگلیوں سے نہ سہی ٹیڑھی انگلیوں سے گھی مگر خوب نکالنا آتا ہے ہمیں۔'' اُس کے بازو پر گرفت مضبوط کر کے بہت کچھ باور کروایا اور اُسے تقریباً گھسیٹتا ہوا باہر نکلا۔ ہال میں سب ہی موجود تھے مگر کوئی کچھ نہیں بولا اور وہ اُسے لیے گیراج تک آ گیا گاڑی کے اندر دھکیل کر بازو آزاد کیا اور گاڑی لاکڈ کر دی۔ ملازمہ سے سارا سامان منگوایا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ بڑے ملک نے زونی کے بڑے بھائی کو اشارہ کیا اور وہ لپک کر اُس کے پیچھے آئے۔

''یار یہ تو کیا کر رہا ہے اس گھر کی عزت کو کہاں لے جا رہا ہے۔''

''بڑے لالہ، مجھے نہ روکیں میں کچھ ہی دنوں بعد چکر لگاؤں گا۔ ابے سے کہیے گا میں رات سے اب تک جو ہوا اُس کے لیے شرمندہ ہوں اور اُن کی مرضی کے بغیر جانے پر معذرت خواہ ہوں، اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر اُس نے بڑی تیزی سے گاڑی نکالی تھی۔

بڑے ملک اور گھر کی خواتین کے تیور بہت ہی خراب تھے۔ بڑے ملک تو اس شادی کے ہی خلاف تھے وہ نکاح کے حق میں ہرگز نہ تھے۔ مگر بڑے بیٹے کی بات ماننی پڑی تبھی وہ گویا ہوئے۔

''مجھے تمہاری بات ماننی ہی نہیں چاہیے تھی؟ زونی رو دھو کر چپ کر جاتا، عورت کو جتنی عزت دو وہ اتنا ہی سر پر سوار ہو جاتی ہے۔ دیکھ لی نہ اُس کی ہمت ساری برادری میں تماشا بنوا دیا۔''

''ابے، میں زونی کا منہ دیکھ کر چپ رہا ورنہ پیار سے نہ سہی غصے سے بات منوا لیتا، میں نے نرمی دکھائی تو صرف زونی کی وجہ سے، خیر وہ ابھی چلا گیا ہے کچھ دنوں میں وہ سیٹ ہو جائے گی ورنہ پھر کچھ سوچیں گے۔'' اُن کا گرم خون کھول رہا تھا کہ وہ بھائی کی محبت میں خود کو کافی ڈی گریڈ کر چکے تھے۔ مگر اب مزید جھکنے کا اُن کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔

☆......☆......☆

''اُمِ لیلیٰ تمہاری تذلیل کی گئی تھی، تمہاری مجبوری سے فائدہ اٹھایا گیا تھا، تم نے اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر سارے حساب بے باق کر دیے ہیں۔ تم نے میرے والدین کی، میرے عزیز و اقارب کی، اپنے سب سے بڑے مجرم میرے بھائی کی بہت اچھے سے تذلیل کی ہے اور رہ گیا میں جس کے سبب تمہاری تذلیل کی گئی تھی، تو مجھ سے بھی تم اپنا بدلہ لے چکی ہو۔ میں اب بدلہ لینے پر آؤں تو بات بہت بڑھ جائے گی اور تمہاری سوچ کی پاسداری کرنے لگوں تو اپنے مقام سے تو گروں گا ہی لوگوں کا محبت سے بھی اعتبار اُٹھ جائے گا۔ میری خاموش محبت کو رسوائی سے بچانے کی ادنی سی کوشش ہے ورنہ ملک

زونیر عباسی اتنا بھی بے غیرت اور نامرد نہیں ہے جتنا کہ تم نے سوچ سمجھ لیا ہے۔ جسم تک رسائی ہی حاصل کرنا ہوتی تو اغواء کے بعد تم ہمارے رحم و کرم پر تھیں۔ لیکن میرے نزدیک مردانگی عورت کو جھکانے میں نہیں نفس کو قابو میں رکھنے میں ہے اور تمہیں مجبور کر کے جھکنے پر مجبور کیا گیا تھا اس لیے میں جھکتا رہا۔ ہر تلخ بات و رویہ برداشت کیا، مگر اب سارے حساب بے باق ہو گئے ہیں۔ میں اب نہ اپنوں کی نہ اپنی تذلیل برداشت کروں گا۔ تمہیں میرے ساتھ نہیں رہ کر بھی رہنا ہوگا کہ ہمارے ہاں کا مرد کبھی منگیتر نہیں چھوڑتا اور تم تو پھر میری بیوی ہو، کاغذی ہی سہی، یہاں رہوں یا وہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی، کاغذی رشتے کو روح عطا کرنا چاہو گی تو میں ہر تلخی بھلا کر تمہاری خواہش کا احترام کروں گا اور کاغذی رشتے کو ہی برقرار رکھنا چاہو گی تو یہ تم سے ایک مرد کا وعدہ رہا اُم لیلیٰ اس میں کمی بیشی نہ ہوگی، سامنے کمرہ ہے جا کر آرام کر لو، فی الحال یہاں کوئی نوکر نہیں ہے۔ مجھے آتے وقت دھیان نہ تھا۔ رات تک حویلی سے ملازم آ جائیں گے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کہہ دینا۔'' وہ اُسے اپنے شہر والے گھر میں لے آیا تھا پورے راستے خاموش رہا تھا اور اب بہت رسان سے اسے سمجھا رہا تھا۔

اور حیران و ششدر بنی اُم لیلیٰ اُس کو کمرے سے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت لاتعلق ہو گئے تھے، ناشتہ، کھانا ساتھ بیٹھ کر ایسے کھاتے جیسے اکیلے ہی کھا رہے ہوں، اُس دن کے بعد اُس نے اُم لیلیٰ کو خود سے مخاطب نہ کیا تھا نہ ہی اُس نے یہ تردد کیا تھا۔ وہ دونوں اجنبی بن کر گونگے بہروں کی طرح رہ رہے تھے۔

رفیہ اور اُس کی ماں رجو گاؤں سے آ گئی تھیں اور وہ دونوں خاندانی ملازمائیں تھیں اگر ان دونوں کو ایک دوسرے سے کچھ کہنا ہوتا تو رفیہ ہی پیغام رسائی کرتی جیسے وہ رفیہ کے ذریعے ہی میکے جانے کا پیغام پہنچا دیتی تھی اور اُسی کے ذریعے یونیورسٹی جوائن کرنے کا اُس نے عندیہ دیا تھا اور اُس نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ایک ماہ پلک جھکتے میں گزر گیا اور اُس کے امتحانات شروع ہو گئے۔ جبکہ وہ خود تو یونیورسٹی جا ہی نہیں رہا کہ فرسٹ سمسٹر کے پیپر بھی نہیں دیے تھے۔ نئے سال پر فرسٹ سمسٹر کی نئے سرے سے کلاسز لے کر ایگزامز دینے کا ارادہ تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ ہی جامعہ چلی جاتی تھی، آج اُس کا پہلا پیپر تھا اور وہ سادگی سے گلابی کاٹن کے سوٹ میں بڑی عجلت میں ڈائننگ ہال میں آئی تھی اور بیٹھے بغیر جوس کا گلاس اُٹھا کر غٹا غٹ چڑھا گئی تھی۔

''آپ کہیں جا رہی ہیں۔'' رفیہ نے لیلیٰ کو بیگ اٹھائے دیکھ کر پوچھا۔

''جامعہ جا رہی ہوں، پیپر ہے میرا۔ وحید سے کہو گاڑی نکالے میں آل ریڈی لیٹ ہو چکی ہوں۔ گلاس واپس رکھتے ہوئے بولی۔

''بیگم صاحبہ! ایا تو نہیں ہے۔'' رضیہ منمنائی۔

''کیا مطلب نہیں ہے۔ کیا اُسے پتا نہیں ہے کہ مجھے جامعہ جانا ہوتا ہے کہاں چلا گیا ہے وہ۔''

زونی جو واک کر کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ شور سن کر دروازے پر ہی رک گیا اُس کے لال بھبھوکا چہرے پر نظر پڑی تو معاملہ سمجھ گیا تبھی نرمی سے بولا۔

''رجو رات سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے اسی لیے وحید ہاسپٹل میں ہے۔'' چلو میں چھوڑ دیتا ہوں یہ کئی دنوں کے بعد ان کے

درمیان پہلی بات ہوئی تھی۔ زونی نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ اور وہ بھی بیگ اور فائل اٹھاتی باہر نکل آئی۔ پورے راستے اُن کے درمیان خاموش رہی جامعہ پہنچ کر وہ شکریہ کہہ کر تیزی سے گاڑی سے اتر گئی۔

کچھ دور جا کر زونی کی نگاہ فائل پر پڑی۔ جو وہ گاڑی میں ہی بھول گئی تھی۔ کچھ دور جا کر لیلیٰ کو فائل کا دھیان آیا اور وہ اپنا سر پیٹ کر رہ گئی۔ اتنے میں سامنے سے ہانی آتی نظر آئی اور وہ لیلیٰ کی روتی شکل دیکھ کر گھبرا گئی۔

''کیا ہوا لیلیٰ؟''

''یار میں فائل گاڑی میں بھول گئی۔ سرتو پیپر شروع ہونے سے پہلے اسائنمنٹ لیتے ہیں، بعد میں تو وہ کسی قیمت پر نہیں لیں گے۔'' اُس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''گاڑی میں ہی بھولی ہو نہ، زونیر بھائی کو فون کر کے کہہ دو، وہ دے جائیں گے۔'' اُس کی پریشانی اُس کی تو سمجھ سے باہر تھی۔

''مجھے اُن کا نمبر نہیں معلوم۔'' ہانی حیران ہی رہ گئی۔

''کیا تمہیں زونیر بھائی کا سیل فون نمبر تک نہیں معلوم، گھر پر ہی کال......''

''مجھے گھر کا بھی نمبر معلوم نہیں ہے۔'' اسائنمنٹ جمع نہیں کروایا تو میں تو فیل ہی ہو جاؤں گی۔'' ہانی کو اُس کی شادی شدہ زندگی میں گڑبڑ تو لگتی تھی مگر وہ اس موضوع پر بات ہی نہ کرتی تھی اور ابھی تو ان باتوں کے لیے نہ وقت تھا نہ جگہ ہی مناسب تھی۔ سر کو آتے دیکھا تو اُس کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

''فیل تو ہونا ہی ہے میں پیپر بھی نہیں دے رہی۔'' وہ تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں سے نکلی تبھی سامنے سے زونیر آتا نظر آیا اس کے ہاتھ میں لیلیٰ کی فائل تھی۔ آگے بڑھ کر لیلیٰ کو فائل تھمائی اور تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ لیلیٰ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ تشکر بھی تھا جو زونیر نے محسوس کیا مگر انجان بنا رہا۔

وقت بہت تیزی سے گزرا تھا، ہانی نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اسی خاموشی اور لاتعلقی میں 7 ماہ گزر گئے تھے۔ وہ گزرے ماہ میں 3 سے 4 بار حویلی کا چکر لگا آیا تھا۔ نہ لیلیٰ سے چلنے کو کہا تھا نہ کوئی خواہش تھی۔ بڑے ملک نے بہو کے بارے میں دریافت کیا تھا تو وہ بولا۔

''وقت جیسا گزر رہا ہے گزرنے دیں، ایک وقت ایسا آئے گا وہ خود چل کر یہاں آئے گی۔ بس آپ لوگوں سے التجا ہے کہ اُس کی ہر بدتمیزی کو معاف کر کے کھلے دل سے اُسے صرف میری اور میری خوشیوں کے لیے قبول کر لیجیے گا وہ جیسی بھی ہے میری محبت، میری بیوی ہے اور میں اُس کا کبھی برا نہیں چاہوں گا نہ ہی اُسے دکھی دیکھ سکتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ میری خوشی کا خیال رکھیں گے۔'' اُس نے وقت سے پہلے ہی باپ اور گھر والوں کو بہت کچھ باور کرا دیا تھا۔

لیلیٰ آج کل میکے میں تھی اور زونیر باپ کی خرابی طبیعت کا سُن کر کل سے ہی گاؤں گیا ہوا تھا اُس نے سُسر کی ناسازیٔ طبیعت کا سُن کر بھی جانے کو نہیں کہا اُس کی بے حسی پر تاؤ تو آیا مگر بولا کچھ نہیں تھا۔

وہ تقریباً ایک ہفتہ بعد گاؤں سے آیا تھا کہ اُس کی یونیورسٹی کا حرج ہو رہا تھا ایک سال پہلے ہی ضائع ہو چکا تھا اس لیے وہ باپ کی طبیعت سنبھلتے ہی آ گیا تھا۔ دو دن اُم لیلیٰ اور ہانی یونیورسٹی نہیں آئیں

تو اُسے تشویش ہوئی اور اُس نے ملازمہ سے کہا کہ وہ اُم لیلیٰ کو فون کرکے گھر آنے کا کہہ دے۔ رفیہ نے فون کیا تو پتا چلا کہ لیلیٰ کی والدہ بیمار ہیں، ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔ زونیر اُن کی عیادت کے لیے اسپتال پہنچ گیا۔ ہانی بہت مشکور تھی۔

''تم سے تو اچھے زونیر بھائی ہیں تائی امی کی طبیعت کا سُن کر خیریت معلوم کرنے چلے آئے، جبکہ تم زونیر بھائی کے بابا کو دیکھنے نہیں گئیں۔ مانو نہ مانو زونیر بھائی بہت اعلیٰ ظرف ہیں جو تمہاری نافرمانیاں برداشت کررہے ہیں۔

''وہ مجھے اپنے حوصلے یا اعلیٰ ظرفی کی وجہ سے برداشت نہیں کررہے، یہ اُن کی مجبوری ہے کہ وہ مجھے چھوڑ نہیں سکتے کہ یہ اُن کی غیرت کو گوارہ ہی نہیں ہوگا کہ وہ مجھے آزاد کردیں۔

وہ اپنی مجبوریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ میرے لیے اُس نے کچھ نہیں کیا ہے۔ اور میں چاہتی بھی نہیں ہوں کہ وہ میرے لیے کچھ کریں کہ مجھے اُس سے کل بھی نفرت تھی آج بھی نفرت ہے۔'' وہ ضد اور انا کی ڈور میں آج تک اُلجھی ہوئی تھی۔ زونی جتنی درمیانی راہ نکالنا چاہتا تھا یہ اتنے ہی برے تیور دکھاتی تھی یہ اونٹ نہ جانے کس کروٹ بیٹھے گا؟'' ہانی کو بہت پریشانی تھی تبھی اُس نے زونیر کو فون کردیا۔

''زونیر بھائی لیلیٰ کی خودسری میں کہیں نہ کہیں آپ کی نرمی کا بھی ہاتھ ہے، مگر زندگی اس طور نہیں گزرا کرتی وہ آپ کو سزا دینے کے چکر میں خود کو بھی سزا دے رہی ہے اور ایسا کرتے کرتے وہ ٹوٹ جائے آپ اُسے سنبھال لیں مجھے لگتا ہے کہ یہ جمود کچھ سالوں چلا تو رشتے اور محبت بھی اس جمود کا شکار ہوجائے گی۔ اپنی محبت کو پانے کی کوشش کریں آپ کا ساتھی کم عقلی و نا سمجھی دکھا رہا ہے۔ تو آپ تو عقلمندی کا ثبوت دیں وگرنہ آپ محبت ہی نہیں لیلیٰ کو اور خود کو بھی کھو دیں گے۔'' ہانی پورے خلوص سے زونیر کو سمجھا رہی تھی وہ لیلیٰ کو بہت اچھی طرح جو جانتی تھی۔ زونیر نے بہت غور سے ہانی کی باتیں سنی تھیں۔ وہ صحیح کہہ رہی تھی وہ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ کیا ہانی کی باتوں پر ردِعمل دیا جائے یا خاموش رہا جائے اور پھر اُس کے ذہن میں یہی آیا کہ وہ اپنی محبت جیت کر دکھائے گا، اُس کی محبت اتنی بے مول بھی نہیں ہے کہ ایک نفرت سے ہار جائے گا اُس نے نفرت کو شکست دینی ہی ہے کیسے یہ اُس نے بہت اچھی طرح سے سوچ لیا تھا۔ بس اب عمل کرنے کی دیر تھی۔

☆......☆......☆

''ابے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں حویلی میں مستقل قیام کروں۔'' وہ اُس کو دیکھنے لگی تھی وہ یہ سب اُس سے کیوں کہہ رہا تھا وہ یہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

''اس لیے میں کل گاؤں جارہا ہوں، کب لوٹوں گا یہ فی الحال کہہ نہیں سکتا، یہاں ملازم ہوں گے۔ تمہیں کسی چیز کی پریشانی نہ ہوگی، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو تم فون کرکے کہہ دینا، خود نہ کہنا چاہو تو رفیہ کو کہہ دینا۔''

وہ اکیلے رہنے کے خیال سے ہی پریشان ہوگئی۔ ٹھیک ہیں ان کے تعلقات آپس میں بہت اچھے نہیں تھے مگر یہ تقویت تو تھی کہ وہ گھر میں موجود رہتا ہے۔ میں اکیلے یہاں نہیں رہوں گی اپنے گھر چلی جاؤں گی وہ ازلی ہٹ دھرمی سے بولی۔

''مسز ملک زونیر عباسی آپ کا گھر یہی ہے، میری موجودگی سے جب کوئی فرق نہیں پڑتا تو غیر موجودگی سے تو پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' جب تم کوئی ریلیشن مانتی ہی نہیں ہو تو میرے

جاتے ہی میکے جانا چہ معنی وارد؟'' وہ سوالیہ نگاہوں سے اُم لیلیٰ کو دیکھ رہا تھا۔

''میں آپ کی باتیں سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔''

''ہاہاہا...... سیدھی سی تو بات ہے، میاں کی غیر موجودگی میں تو میکے وہ بیویاں جاتی ہیں جو میاں کی ذرا سی پرواہ کر رہی ہوتی ہیں، میری موجودگی میں لاتعلق ہی رہتی ہو تو میری غیر موجودگی میں یہاں سے جانے کا کیا مطلب نکلتا ہے؟'' اُس کے چہرے پر خفت کی سرخی چھا گئی تھی۔ مگر جب بولی تو اپنے بھرپور اعتماد کے ساتھ ہی بولی تھی۔

''مجھے اکیلے رہنے کی عادت نہیں ہے، مجھے ڈر محسوس ہوتا ہے اس لیے میں......'' زونیر نے اُس کا جملہ مکمل ہی نہیں ہونے دیا اور ہنس کر بولا۔

''واٹ آ گڈ جوک، تمہیں اکیلے رہنے کی عادت نہیں ہے اور اکیلے کیسے رہا جاتا ہے؟'' اُس نے گہرے طنز سے کہا تھا اور وہ لب کچلنے لگی۔

رشتوں کے ہوتے ہوئے ضد وانا اور غصے میں خود کو اکیلا کر لیا ہے اور کہتی ہو کہ اکیلے رہنے کی عادت نہیں ہے۔ خیر جو بھی ہو، اب وغیرہ کے بہت چاہنے کے باوجود میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا کہ تم میرے اپنوں کے درمیان رہنے کے قابل ہو بھی نہیں۔ تم میکے میں رہو یا یہاں مجھے فرق نہیں پڑتا۔'' وہ اُس کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو دیکھتا لب بھینچا نکلتا چلا گیا وہ اپنی ہر بدتمیزی کے ساتھ آج بھی اُس کے دل کی سب سے اونچی مسند پر بیٹھی تھی۔ زونیر حویلی چلا گیا اور وہ اپنے گھر آ گئی، مگر ایک ہفتہ میں ہی وہ بری طرح عاجز آ گئی تھی کیونکہ ماں جی کا صبح وشام یہی ایک سوال تھا کہ وہ اُسے ساتھ کیوں نہیں لے گیا؟ فون کیوں نہیں کرتا؟ وہ یہاں کب تک رہے گی؟ جب سسر کی طبیعت خراب ہے تو اُسے گاؤں جانا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ وہ اب تک اپنا بھرم رکھے ہوئے تھی کیونکہ شادی کے بعد وہ محض تین دن کے لیے ہی حویلی گیا تھا کبھی چار دن بھی نہ ہوئے تھے اور وہ میکے اُسے خود ہی چھوڑتا اور خود ہی پک کرتا تھا۔ لیلیٰ رفیہ کے ذریعے آنے جانے کا پروگرام بتا دیتی تھی۔ اس لیے سب اچھا ہے پیش کرنے میں دشواری نہ ہوئی تھی اس لیے اُس کی آدھی ادھوری زندگی کا میکے میں کسی کو علم نہ تھا سوائے ہانی کے کہ وہ ہانی سے کچھ چھپا نہیں پائی تھی اوپر سے اُس کا یونیورسٹی میں روا رکھا جانے والا رویہ وہ اُلجھ گئی تھی مگر صاف اُسے کچھ نہیں بتایا تھا۔

''ماں جی کو میرا یہاں آنا، پسند نہیں ہے تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔'' وہ ماں کی باتوں اور تشویش بھری نگاہوں سے اُلجھی بیٹھی تھی اسی لیے ہانی کی ہمدردی پا کر رونے لگی۔

''تم یہ سب تماشے کب تک جاری رکھو گی؟ تمہیں نہ اپنی پرواہ ہے نہ اپنوں کی اور نہ ہی زونیر بھائی کی، تائی اماں کے سوالوں سے تم ایک ہفتہ میں ہی گھبرا گئیں۔ تم نے سوچا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو کیسے مطمئن کرتے رہے ہوں گے؟ تمہارے نہ جانے کا کیا ریزن دیا ہوگا؟ تم جو ڈیڑھ سال تک من مانیاں کرتی رہیں پھر بھی اچھی کی اچھی رہیں تو صرف زونیر بھائی کی وجہ سے انہوں نے تمہاری ہر بدتمیزی کے باوجود بھی تمہارا بھرم تمہارے میکے میں رکھا تم نے اُن کے اپنوں کو مان وعزت نہ دیا لیکن انہوں نے تمہارے لیے تمہارے اپنوں کو عزت دی۔ تم اب تک تائی اماں کے سوالوں سے اسی لیے محفوظ رہی تھیں نہ کہ وہ خود تم کو یہاں چھوڑ جاتے اور لے جاتے تھے۔

(باقی اگلے ماہ، پڑھنا نہ بھولیے گا)

تھا خواب میں، خیال کو

مذاق سے قطع نظر یہ سچ ہے کہ کلامِ اقبال فطرتِ انسانی پر گہرے نقش ثبت کرتا ہے اور شاید اُن لوگوں پر نہیں ہوتا ہوگا کہ جن کے خمیر میں قدرت نے چکنی مٹی استعمال کی ہو۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ شاعر کے اعتراف کا مجھے صحیح طور پر ادارک اب تک یوں نہ ہو سکا کہ......

کہتے ہیں، جیسی صحبت، ویسا اثر، انسان جس قسم کے لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے، اُس کا اثر لامحالہ اُس کی طبیعت پر بھی ہوتا ہے۔ خواتین کی صحبت میں رہ کر لڑکا بیگم نوازش علی جیسا بن جاتا ہے اور لڑکوں میں کھیلنے کودنے والی لڑکی بڑی ہو کر ہنٹر والی ٹائپ کی بن جاتی ہے۔ سیاست دانوں کی صحبت میں رہ کر انسان ٹھگ اور ٹھگوں کے ساتھ رہ کر انسان سیاست دان بن جاتا ہے۔ قوالوں کی سنگت میں رہنے والا بھانڈ اور ان بھانڈوں کی صحبت میں رہنے والا پاپ سنگر بن جاتا ہے۔ طبیعت پر اثر انداز ہونے کا یہ فارمولا مطالعے پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

انسان جس قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اس کا اثر کسی نہ کسی طرح اس کی شخصیت پر بھی ہوتا ہے۔ رومانوی شاعری پڑھنے والوں کو اکثر خواتین کے ہاتھوں پٹتے ہوئے اور صوفیانہ کلام کے عادی لوگوں کو بھنگ کوٹتے دیکھا گیا ہے۔ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ تین دوست آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ پہلے نے کہا کہ جن دنوں اُس کی بیگم امید سے تھی، وہ ایک ننھی شہزادی کی کہانی پڑھ رہی تھی۔ قدرت نے انہیں ایک بیٹی عطا کی۔ دوسرے نے کہا کہ جن دنوں اُن کی زوجہ محترمہ اچار اور چٹنیوں کی بوتلوں کی بوتلیں خالی کر رہی تھیں، ان دنوں انہوں نے دو جڑواں بھائیوں کی کہانی پڑھی تھی۔ بعد میں اُن کے ہاں دو جڑواں لڑکے پیدا ہوئے۔ یہ سُن کر تیسرے شخص نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اُس نے بتایا کہ ان دنوں اُس کی بیوی علی بابا اور چالیس چوروں کی کہانی پڑھ رہی ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ وہ امید سے ہے۔

ایک شاعر نے مطالعے کا اثر انسان کی شخصیت پر کس قدر گہرا اور اس کے اثرات کس قدر دیرپا ہوتے ہیں، کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے۔

اقبال تیرے عشق نے سب کس بل دیے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

بلاشبہ حضرت علامہ اقبال کی شخصیت اور اُن کا کلام انسانی فطرت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کلامِ اقبال کا مطالعہ کرنے والوں پر جو ایک خاص قسم کی وجدانی

کیفیت طاری ہوسکتی ہے اور جس طرح اس کی خودی بلند ہوسکتی ہے اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جو کلامِ اقبال کا روح کی گہرائیوں سمیت ڈوب کر مطالعہ کرتے ہیں۔ بقول شاعر......

ہم نے اقبال کا کہا مانا!
اور فاقوں کے ہاتھوں مرتے رہے
جھکنے والوں نے رفعتیں دیکھیں
ہم خودی کو بلند کرتے رہے

مذاق سے قطع نظر یہ سچ ہے کہ کلامِ اقبال فطرتِ انسانی پر گہرے نقش ثبت کرتا ہے اور شاید اُن لوگوں پر نہیں ہوتا ہوگا کہ جن کے خمیر میں قدرت نے چکنی مٹی استعمال کی ہو۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ شاعر کے اعتراف کا مجھے صحیح طور پر ادارک اب تک یوں نہ ہوسکا کہ میرے ناقص ذہن میں یہ عقدہ حل نہیں ہو پایا کہ شاعر موصوف کے کس بل نکال کر انہیں سیدھا کس نے کیا؟ اقبال نے یا عشق نے؟ خیر اس فروعی مسئلے پر بعد میں بھی غور کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مطالعہ بھی صحبت کی طرح انسانی شخصیت، اس کی نفسیات پر اثر ڈال سکتا ہے۔

غالب ہی کو لے لیجیے۔ ان کے کلام کا مطالعہ اب بھی لوگوں پر اثر انداز ہونے کی لافانی صلاحیت رکھتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک صاحب ذوق دوست سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا۔

''مطالعہ جاری ہے؟'' میں نے کہا۔

'وہ تو ضروری ہے۔'' فرمانے لگے۔

''غالب کو پڑھا؟'' میں نے اتراتے ہوئے جواب دیا۔

''کب کا۔'' مسکرا کے پوچھا۔

''کب؟'' میں نے فخر سے جواب دیا۔

''جب آتش جواں تھا۔ کالج کے دنوں میں۔''

اس پر انہوں نے فرمایا۔

''اب ایک بار پھر پڑھیں۔'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''وہ کیوں؟'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولے۔

''کلامِ غالب کو سمجھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا عورتوں کی نفسیات کو سمجھنا۔'' میں نے بھولپن سے کہا۔

''تو کیا غالب کا کلام پڑھنے سے خواتین کی نفسیات سمجھ میں آجائے گی؟''

میرے اس معصومانہ بلکہ احمقانہ سوال پر انہوں نے مجھے کچھ اس طرح گھورا کہ مجھے خود پر شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ اس لیے خجل سا ہوکر جلدی سے کہا۔

''آپ فرما رہے ہیں تو ایک بار پھر کلامِ غالب کا از سرِ نو مطالعہ کروں گا۔'' یہ وعدہ میں نے شرمساری مٹانے کی بجائے اس لالچ میں کیا کہ کم از کم خواتین کی نفسیات سمجھ میں آجائے گی۔ خیر اس کے بعد میں نے غالب کو پھر سے پڑھنا شروع کیا۔ اس حقیقت کا اعتراف میں ضرور کروں گا کہ جوانی میں غالب کے کلام کو جس سطحی انداز میں سمجھا تھا۔ اب پڑھنے پر اس کی گہرائی کا اندازہ ہونے لگا۔ کئی دنوں تک غالب کا مطالعہ جاری رہا، بلکہ یوں کہیے کہ غالب ہمارے اعصاب پر کچھ اس طرح مسلط ہوئے کہ سوتے میں بھی ان کے اشعار ذہن میں چکرانے لگے۔ واقعی غالب کا جواب نہیں۔

ایک رات دیوانِ غالب کا مطالعہ کرتے کرتے اور کلامِ غالب پر سوچتے سوچتے نیند آگئی۔ صبح آنکھ کھلی تو ایک عجب منظر تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میں بجائے اپنے کمرے کس کسی اور جگہ ہوں۔ در و دیوار کی خستگی اور حالت دیکھ کر صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ کوئی قدیم طرز کا مکان ہے۔ فرش پر ایک سالخوردہ قالین بچھا ہوا ہے۔ اِدھر اُدھر چند گاؤ تکیے بکھرے پڑے ہیں۔ سامنے کونے میں ایک خالی بوتل اور اس کی ہمراہی میں ایک خالی جام الٹا پڑا ہے۔ میں

آنکھیں ملتا ہوا ہڑ بڑا کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دل میں خیال آیا۔ ''یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ میں یہاں کیسے آ گیا؟'' چند ثانیوں میں ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو میری نظر ایک بزرگوار پر پڑی جو مجھ سے بھی زیادہ حیرت زدہ سے نظر آئے۔ مجھے ہوش و حواس میں دیکھ کر وہ ذرا مطمئن سے نظر آئے۔ مجھے وہ بزرگوار کچھ جانے پہچانے سے محسوس ہوئے۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دے کر ان کے بارے میں سوچا لیکن میرا ذہن پہلے ہی سے اُلجھن کا شکار تھا اس لیے میں اس کے سوا کچھ اور نہ کرسکا کہ اپنے دماغ کو مزید اُلجھن میں ڈال دیا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں جو یقیناً تحت الشعور یا پھر لاشعور کا حصہ رہا ہوگا۔ اس خیال نے جنم لیا کہ اس قسم کے حلیے والے ایک بزرگ کو میں کہیں دیکھ چکا ہوں۔ نہ جانے کیوں مجھے وہ ٹی وی ڈرامے اور فلمیں یاد آنے لگیں جو مشہور شاعر مرزا غالب کی زندگی کے بارے میں تھیں۔ میں نے سوچا کہ کہیں یہ صاحب مرزا غالب تو نہیں؟ مگر خود ہی اپنے اس احمقانہ خیال سے دستبردار ہوگیا کہ مرزا غالب تو قریباً ڈیڑھ سو سال پہلے وفات پا چکے ہیں۔ لہٰذا اس گومگو والی کیفیت سے نجات پانے کے لیے میں نے ان سے پوچھا۔

''حضرت! آپ کون ہیں؟''

''محترم پہلے تو آپ اپنا تعارف کرائیں کہ آپ کون ذات شریف ہیں اور میرے غریب خانے میں کس طرح تشریف لے آئے؟'' ساتھ ہی انہوں نے شعر پڑھا۔

وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

بزرگوار کا شعر سنتے ہی مجھے یقین ہوگیا کہ ہو نہ ہو، یہ حضرت مرزا غالب ہی ہیں۔ میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُن سے پوچھا۔

''حضرت آپ مرزا اسد اللہ خاں غالب تو نہیں؟''

وہ کچھ حیران اور کچھ پریشان سے ہو کر بولے۔ ''محترم، آپ اس بندہ عاجز کو پہچانتے ہیں۔'' پھر ذرا تردد سے بولے۔

''سچ فرمایئے آپ کون ہیں؟ ہمارے کسی حریف کے فرستادہ تو نہیں؟ آپ کے ارادے کہیں خطرناک تو نہیں؟''

ارادے کیا خطرناک ہوتے، میرا خود یہ عالم تھا کہ اس عجیب و غریب صورتِ حال جو خطرناک بھی تھی، برا حال تھا۔ مجھے چکر سے آنے لگے اور دل ڈوبنے سا لگا کہ اگر یہ بزرگوار سچ مچ مرزا غالب ہی تھے تو میں اپنے زمانے سے مراجعت کرکے ماضی میں کیسے آ گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔'' حضرت میں کہاں ہوں، یہ کون سا شہر ہے؟''

''جناب آپ اس وقت میرے غریب خانے میں تشریف فرما ہیں اور شہر کا نام دِلّی ہے۔''

''دِلّی!'' میری چیخ نکل گئی۔ بڑبڑاتے ہوئے ہم کلام ہوئے۔ ''اب مارے گئے، یہ تو دہلی ہے۔''

''جی جناب، یہ دِلّی ہے، اس میں حیرانی والی کیا بات ہے؟''

''جناب، حیرانی کی بات یہ ہے کہ میں کراچی میں رہتا ہوں۔''

''کراچی!'' وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔'' میاں، یہ کس چڑیا کا نام ہے۔ دِلّی میں تو ایسا کوئی علاقہ ہم نے دیکھا نہ سنا۔''

''جناب، کراچی پاکستان میں ہے۔''

''پاکستان؟ یہ کیا شے ہے؟'' میں نے ان کے سوال کو نظر انداز کیا اور پریشانی کے عالم میں بولا۔

''اب کیا ہوگا! یہ کس مصیبت میں پھنس گیا۔ نہ میرے پاس پاسپورٹ ہے نہ ویزا۔''

''کراچی، پاکستان، ویزا، پاسپورٹ!'' وہ

حیرانگی سے بولے۔

''میاں یہ سب کیا ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، خدانخواستہ دشمنوں کو ہذیان تو لاحق نہیں ہوگیا۔'' ساتھ ہی ایک شعر موقع محل کی مناسبت سے ارشاد فرمایا۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

میں نے جب انہیں اپنے بارے میں بتایا کہ کس طرح ملک پاکستان کے ایک شہر کراچی سے سوتے میں یہاں آ پہنچا ہوں تو وہ دیر تک مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ انہیں میری ذہنی صحت پر شک سا ہورہا تھا۔ وہ اپنی خشخشی داڑھی پر انگلیوں سے خلال کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

''میاں، سچ بتائیں، رات کتنی پی تھی؟''

''ایک پیالی۔'' میں نے سادگی سے جواب دیا۔

''صرف ایک پیالی۔''

''جی ہاں، صرف ایک پیالی۔''

''لگتا ہے، بہت تیز تھی۔''

''جی ہاں، ایک دم سے کڑک۔''

''میاں، ہم نے تو رات پوری بوتل ختم کی تھی۔'' انہوں نے کونے میں دھری خالی بوتل اور خالی جام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر ہمیں تو اتنی نہیں چڑھی۔ واللہ سچ فرمایئے، کون سی تھی؟''

''محترم آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے یہ خانہ خراب نہیں پی تھی۔ زندگی میں کبھی نہیں پی۔ البتہ رات کو چائے پی تھی۔'' پھر مصطفےٰ قریشی والے انداز میں کہا۔

''کڑک چائے کا مزہ، لپٹن کا مزہ۔''

''چائے! صاحب یہ کوئی نئی خانہ خراب ہے؟'' کیا یہ بھی چڑھ جاتی ہے؟''

''مجھے تو یہی چڑھ جاتی ہے۔'' میں رو دینے والے انداز میں بولا۔

''لگتا ہے یہ کوئی بہت ہی تیز شے ہے۔'' وہ بولے۔

''حیرت ہے، ایک پیالی اس قدر زوداثر ہوتی ہے کہ صبح تک اس کا خمار باقی رہتا ہے۔'' وہ کچھ دیر خاموشی سے کچھ سوچتے رہے پھر رازدارانہ انداز میں بولے۔

''محترم، کبھی ہمیں بھی پلوایئے گا۔ ویسے یہ کیا شے ہے؟''

''اس کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''یہ فرنگیوں کی سوغات ہے۔''

''ہاں، میاں سچ کہتے ہو۔ یہ اہلِ فرنگ بھی خوب ہیں۔ ویسے کب تک اس نئی شے کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

میں نے جب انہیں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قائم ہونے اور مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے متعلق بتایا تو وہ بے حد ناراض ہوئے، کہنے لگے۔

''صاحب دیکھیے خللِ دماغ کا یہ مطلب بھی نہیں کہ بندہ جو جی میں آئے، بک دے۔ پاک پروردگار ہمارے شہنشاہ کا سایہ ہمارے سر پر سلامت رکھے، یہ آپ کیا واہی تباہی بکنے لگے ہیں۔''

میں نے جب انہیں برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کے متعلق بتایا تو وہ مزید حیران سے ہوکر رہ گئے۔ لیکن وہ اسے میرا دیوانہ پن ہی سمجھتے رہے۔ اِدھر میں بھی انہیں مستقبل میں ہونے والے واقعات اختصار کے ساتھ بتانے پر تلا بیٹھا تھا۔ جنہیں سن کر وہ کبھی ہنس دیتے تو کبھی گھبرا جاتے اور منہ پر ہاتھ رکھ لیتے۔ ایک آدھ بار انہوں نے زبان باہر نکال کر دونوں کانوں کی لوئیں پکڑ کر باقاعدہ توبہ بھی کی۔ اِدھر میں نے ذرا احتیاط سے کام لینا شروع کیا کہ ابھی تو یہ صرف توبہ استغفار تک محدود ہیں، جلال آ گیا تو میرا کام بھی تمام ہوسکتا ہے۔ ویسے بھی مغل بچہ جس سے

پیار کرتا ہے، اسے مار دیتا ہے۔ جب میں خاموش ہوا تو انہوں نے بزرگانہ شفقت سے پوچھا۔

''میاں، یہ تو بتائیں رات کو کچھ کھایا بھی تھا، یا یوں ہی پی لی تھی؟'' ان کے پوچھنے پر مجھے اچانک یاد آیا کہ رات چکن برگر کھایا تھا۔ اب اگر انہیں بتاتا کہ چکن برگر کھایا تھا تو وہ اس کے بارے میں استفسار کرتے، میں بھلا انہیں چکن برگر کے متعلق کیسے بتاتا اور ان کے مزید سوالات پر انہیں کیا سمجھاتا کہ چکن برگر اور فاسٹ فوڈ خود میری سمجھ میں اب تک نہیں آئے۔ بہرحال مجھے بھوک کا احساس ہونے لگا کہ رات جو چکن برگر کھایا تھا وہ تو نہ جانے کب کا ہضم ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے کہا۔

''جی، بس، یونہی تھوڑا بہت کھایا تھا۔''

''جبھی تو کم بخت سر پر چڑھ گئی ہے۔''

''حضرت، بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کو ملے گا۔''

''سردست تو دال حاضر کر سکتا ہوں۔'' وہ بولے۔

''دال!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''صبح ناشتے میں دال؟''

''جی ہاں دال۔'' وہ ذرا شرمندہ سے ہو کر بولے۔

''رات ظلِ الٰہی نے از راہِ بندہ پروری بھجوائی تھی۔ اسی میں سے کچھ بچ رہی ہے۔ کہیں تو پیش کروں۔'' پھر حسب روایت اور حسب مناسبت ایک شعر ارشاد فرمایا۔

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

''واہ، واہ! سبحان اللہ مرزا صاحب! لگتا ہے۔ یہ شعر آپ نے ہماری مدح سرائی میں فی البدیہہ فرمایا ہے۔'' میں خوش ہو کر بولا۔

''جی نہیں!'' وہ ذرا چڑ سے گئے۔

''شعر تو ہم نے کسی اور کے لیے کہا ہے۔ موزوں لگا تو بس یونہی سنا دیا۔'' انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ مرزا صاحب کہنا چاہ رہے تھے کہ یہ منہ اور مسور کی دال۔ لیکن انہوں نے وضع داری میں ایسا نہیں کہا بلکہ عاجزی اور انکساری سے کام لیتے ہوئے فرمایا۔ ''حکم ہو تو دال پیش کروں۔''

''لایئے صاحب! کھالیں گے۔'' میں نے مجبوری کے عالم میں کہا۔ رات جو چکن برگر کھایا تھا تو وہ سلاد اور چٹنی سمیت نہ جانے کب کا ہضم ہو چکا تھا اور پیٹ میں چوہے جنگِ عظیم سوم کی مشقیں کر رہے تھے۔ مرزا صاحب اندر تشریف لے گئے اور تھوڑی ہی دیر میں ظلِ سبحانی کی طرف سے آئی ہوئی دال اور ایک عدد خمیری روٹی لے کر حاضر ہو گئے۔ میں نے جلدی سے روٹی کا نوالہ توڑا، دال میں بھگویا اور منہ میں خوشی خوشی ڈالا کہ زندگی میں پہلی بار یہ موقع نصیب ہوا تھا کہ شاہی دال ڈائریکٹ فرام کچن آف لال قلعہ کھانے کو ملی تھی۔

لیکن پہلے ہی نوالے کے ساتھ میرا منہ بن گیا کہ اگر یہ شاہی دال تھی تو کراچی کے علاقے حسین آباد میں اوکھائی میمن والوں کی دال اس کے مقابلے میں قورمہ تھی۔ لیکن بھوک چونکہ زیادہ تھی اس لیے شاہی دال کی ہجو کرنے سے بہتر میں نے یہ سمجھا کہ اسے کسی نہ کسی طرح زہر مار کرلیا جائے۔ مرزا صاحب اس عرصے میں میری طرف انتہائی تشویشناک انداز میں دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر میں جب میں شاہی دال کو اور شاہی دال مجھے بھگتا چکی تو سخن طراز ہوئے۔

''کہیے صاحب! پسند آئی آپ کو شاہی دال، کیسی تھی؟''

''بس، ٹھیک تھی۔'' کم بخت سچ بولنے کی عادت واقعی بری شے ہے۔ لوگ بگڑی ہوئی نہاری کو کتا گوشت کہہ کر چٹخارے لیتے ہیں۔ کسٹرڈ اور کھیر کی

دوغلی اولاد کولب شیریں کا نام دے کر ہڑپ کر جاتے ہیں۔ لیکن سچ کہنے کی عادت ہی کچھ ایسی ہے کہ لاکھ احتیاط کے باوجود میں بھی زہر ہلاہل کو کہہ نہ سکا قند والی صورتِ حال سامنے آجاتی ہے۔ میری صاف گوئی سے پریشان ہو کر مرزا غالب تعجب سے بولے۔

''کیا فرما رہے ہیں آپ؟ جناب یہ شاہِ عالم فخرِ جہاں، ظلِ سبحانی، حضرت بہادر شاہ ظفر کی طرف سے آئی ہے۔ یہ شاہی دال ہے۔''

''ہوگی شاہی دال، بس رہنے دیجیے۔ کبھی کراچی تشریف لائیں۔ آپ کو کھلائیں گے دال اور یہ جو آپ لوگوں نے دِلّی کی ذائقہ دار نہاری کا ڈھونگ رچا رکھا ہے تو وہ بھی صرف کراچی ہی میں ملتی ہے۔ یہ دہلی والوں کے چٹخارے بھی نام نہاد دعوے ہیں۔ دِلّی میں تو بدمزہ اور پھیکا پکوان ہی ملتا ہے۔'' میں چڑ سا گیا۔

''لگتا ہے، رات کی چڑھی اب تک اتری نہیں۔ میاں، اب بھی آپ نہ جانے کس کراچی کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ میاں یہ کراچی ہے یا طلسم ہوشربا کا کوئی شہر ہے؟'' مرزا غالب کو شاید اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ میں مستقبل سے سفر کر کے ماضی میں آیا ہوں۔ مجھے لگا کہ اول تو انہیں یقین دلانا ضروری ہے۔ ورنہ یہ مجھے دیوانہ قرار دلوا کر دِلّی کی سڑکوں پر لونڈے لپاڑوں کے آگے ڈال دیں گے کہ سنگ دیکھ کر سر یاد آیا۔ اس لیے میں نے ان کا وہ قطعہ پڑھا جو انہوں نے اس دال کی شان میں کہا تھا۔

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاں نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ یہ دال
یہ شاہ پسند دال ، بے بحث وجدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

اب معاملہ یہ تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں (میرے نہیں، مرزا غالب کے) وہ بھونچکے سے رہ گئے۔ آنکھیں پٹ پٹانا بھول گئے۔ دیر تک سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ ہوش میں آئے تو گھبرا کر بولے۔

''یہ قطعہ...... یہ قطعہ...... تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ ہم نے آج رات ہی کہا ہے۔ ابھی ظلِ سبحانی کی خدمت میں بھی عرض نہیں کیا۔ کسی کو نہیں سنایا۔ پھر یہ آپ کو کیسے یاد ہے؟''

''مرزا غالب صاحب! یہ میں نے آپ کے دیوان میں پڑھا ہے۔''

''مگر ابھی تک تو میرا دیوان شائع نہیں ہوا۔''

''محترم میں آپ کے وہ اشعار بھی سنا سکتا ہوں جو آپ نے اب تک نہیں کہے۔'' میں نے تیر نشانے پر لگتے دیکھ کر کہا۔

''کہیں تو ایک آدھ غزل سنا دوں۔''

یہ سن کر وہ گھبرا کر بولے۔ ''ناں، میاں ناں، رہنے دیں۔ اگر تم نے ابھی سے سنا دیں تو ہم خاک شعر کہیں گے اور کہہ بھی دیے تو وہ کب ہمارے ہوئے؟''

''پھر آپ بھی مان لیجیے کہ میں ملک پاکستان کے شہر کراچی سے زمانہ ماضی میں وارد ہوا ہوں۔'' میں نے انہیں بلیک میل کیا۔ ''ورنہ میں آپ کے تمام اشعار سنا دوں گا جو آپ نے اب تک نہیں کہے۔''

''اچھا، بابا میں مانتا ہوں کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں۔ وہی سچ ہے۔ گو دل نہیں مانتا مگر اقرار کیے بغیر چارہ نہیں۔'' مرزا غالب نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

میں نے اس کے بعد کئی دن مرزا غالب کے دولت خانے پر ان کی معیت میں گزارے۔ وہ مجھے دِلّی کی سیر کراتے رہے۔ کئی لوگوں سے ملاقات بھی کروائی بلکہ وہ تو اس بات پر بھی مصر تھے کہ شاہی دربار میں بھی پیشی کروادی جائے۔ مگر میں نے انکار کر دیا کہ ڈر تھا کہ کہیں کم بخت زبان پھسل نہ جائے اور مستقبل میں کیا ہونے والا ہے وہ نہ اگل دے اور پھر شاہی عتاب نہ نازل ہو جائے کہ بجائے بادشاہ

سلامت کے اس بندۂ عاجز کو ہی رنگون کی ہوا کھانی پڑ جائے۔ لہٰذا کچھ تو منت سماجت کر کے اور کچھ یہ کہہ کر بلیک میل کر کے کہ حضرت آپ کے تمام ان کہے اشعار سب کو سنادوں گا۔ مرزا غالب کو ان کے ارادے سے باز رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ ان چند دنوں میں مرزا غالب کرید کرید کر مجھ سے مستقبل کا حال معلوم کرتے رہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بادہ نوشی کے عذر کی وجہ سے ان تمام معلومات کو شعری جامہ نہ پہنا سکے۔ خود ان کا ایک شعر اس کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فرماتے ہیں۔

یہ مسائل تصوف ، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے ، جو نہ بادہ خوار ہوتا

غلطی سراسر مرزا غالب کی ہے کہ میں مستقبل کے بارے میں جو کچھ بتاتا رہا۔ اسے وہ کشف پر محمول کرتے رہے، کئی بار تو مجھے شبہ ہوا کہ وہ مجھے کوئی صوفی بزرگ سمجھتے رہے کہ جو بھیس بدل کر ان سے ملنے آیا ہو۔ یا پھر تماشۂ اہلِ کرم دیکھنے آیا ہو۔

ایک رات وہ بے حد موج میں تھے کہ کہیں سے ایک بوتل مل گئی تھی۔ مجھے بھی ایک آدھ چسکی لینے کی آفر کی۔ مگر میرے انکار پر بظاہر ناراض اور بباطن خوش ہو کر اپنی کئی غزلیات سناڈالیں۔ جو کہ میں پہلے ہی ان کے دیوان میں پڑھ چکا تھا۔ مگر جناب، کلامِ شاعر بزبانِ شاعر سننے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جب وہ اچھی طرح مدہوش ہو گئے اور میں ان کی غزلیں سُن سُن کر تقریباً نڈھال ہو گیا تو وہ خود بھی ایک طرف لڑھک گئے اور میں بھی اَدھ مرا ہو کر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

آنکھ کھلی تو عجیب معاملہ تھا۔ نہ وہ گھر تھا اور نہ مرزا غالب تھے۔ میں اپنے ہی گھر میں اپنے بیڈروم میں تھا۔ آنکھیں مل کر اٹھا۔ کلینڈر دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تمام ماجرا صرف ایک رات میں پیش آیا تھا۔ شاید یہ سب کچھ میرا خواب تھا۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا، نہ سود تھا

میں ایک لحاظ سے خوش تھا اور خود کو خوش قسمت تصور کر رہا تھا کہ سستے میں جان چھوٹی۔ یہ سب محض ایک خواب تھا۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو میری جانِ ناتواں کو نہ جانے کن عذابوں سے گزرنا پڑتا۔ ممکن ہے غدر کے ہنگاموں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کسی فرنگی بہادر کی گولی کا نشانہ بننا پڑ جاتا۔ میں موت سے نہیں ڈرتا کہ یہ برحق ہے۔ لیکن خوامخواہ بیٹھے بٹھائے زمانۂ ماضی میں جا کر یوں ہی فضول میں مرنا قطعی ناپسند ہے۔ لیکن میری یہ خوشی تادیر قائم نہ رہ سکی کہ ایک اور مصیبت میری راہ تک رہی تھی۔ واضح رہے کہ میرا اشارہ بیگم صاحبہ کی طرف ہرگز نہیں کہ یہ مستقل میں اور خود میری خواہش کا شاخسانہ ہیں۔ یہ شاید ہر شوہر کی داستان ہے۔ بقول منیر نیازی......

کچھ مجھے مرنے کا شوق بھی تھا

ہوا یوں کہ میں حسب معمول اپنے کلینک پر مریضوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک مریض کے زخم کی ڈریسنگ کرتے ہوئے میں ڈسپنسر سے کہا۔

''ذرا تھوڑا سا پنبہ لے آؤ۔''

''جی کیا دوں؟'' ڈسپنسر ہونقوں کی طرح میرا منہ تک کر بولا۔

''پنبہ دو بھئی۔'' میں نے ذرا تیز آواز میں کہا۔

''جی! یہ کیا ہوتا ہے؟'' وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔

مجھے احساس ہوا کہ قصور خود میرا ہے۔ غریب ڈسپنسر کو کیا پتا کہ پنبہ کیا ہوتا ہے۔ شاید وہ اسے کوئی خاص سرجیکل اوزار سمجھ رہا تھا، جس سے اب تک اس کی شناسائی نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''کاٹن دو...... روئی۔''

''جی ابھی دیتا ہوں۔'' ڈسپنسر نے کچھ اس طرح

کہا کہ جیسے کہنا چاہتا ہو کہ ''یوں بولیں ناں۔'' جلدی سے کاٹن لاکر دیا اور پوچھا۔
''سر کیا کاٹن کو پنبہ بھی کہتے ہیں؟''
''ہاں، کہتے ہیں۔'' میں شرمسار سا ہو کر بولا۔ اور سوچنے لگا کہ یہ پنبہ نہ جانے کہاں سے آن ٹپکا۔ خیر کچھ دیر تک پنبہ میرے ذہن میں چکراتا رہا لیکن پھر مصروفیت کے باعث اسے بھول گیا۔ مگر لگتا تھا کہ مصیبتوں نے شاید میرا گھر دیکھ لیا تھا۔ اس لیے کچھ دیر کے بعد میرا قلم کہیں گم ہو گیا۔ شاید میں نے ہی اِدھر اُدھر رکھ دیا تھا۔ نسخہ لکھنے کے لیے میں نے اُسے تلاش کیا، مگر وہ میری نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ میں نے گھنٹی بجائی تو ڈسپنسر حاضر ہو گیا۔
''جی سر!'' اس نے پوچھا۔
''بھئی میرا خامہ یہیں کہیں کھو گیا ہے، ذرا ڈھونڈ کے دو۔''
''جی!'' ڈسپنسر حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر بولا۔
''ارے میرا مطلب ہے، میرا کِلک کھو گیا ہے۔'' میں نے اپنے تئیں لفظ خامہ کی درستگی کرتے ہوئے کہا۔
''سر! یہ کیا ہوتا ہے؟'' وہ غریب ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔
''قلم!'' میں نے کہا۔ ''میرا پین۔''
میرا قلم وہیں میز پر کاغذوں کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ خیر اس نے قلم دیتے ہوئے کہا۔
''سر، آپ پین کہیے ناں۔ یہ نامہ اور کلنک میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' اس نے خامہ کو نامہ اور کِلک کو کلنک کرتے ہوئے کہا۔ میں اسے کیا کہتا کہ خود مجھے ان لفظوں کی بے وجہ ادائیگی نے پریشان کر رکھا تھا۔ روئی کو پنبہ اور قلم کو خامہ یا کِلک کہنا کم از کم خود میرے لیے حیران کن تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں ایسا تو ہرگز نہ تھا۔

کلینک آف کر کے گھر پہنچا تو بیگم صاحبہ نے کھانا لگوانا شروع کر دیا۔ مجھے بالکل ہی بھوک نہیں تھی۔ ذہن اب بھی ان غیر معروف اور متروک الفاظ کی ادائیگی پر حیران و پریشان تھا۔ شاید اسی ذہنی خلجان نے بھوک کا قلع قمع کر دیا تھا۔ بیگم نے کھانا لگا لیا تو میں نے کہا۔
''بھئی آج بالکل بھوک نہیں۔'' بیگم بولیں۔
''آج تو میں نے آپ کی پسندیدہ ڈش بنائی ہے۔'' ساتھ ہی انہوں نے گول مٹول کوفتوں کی طرف اشارہ کیا۔ جو بڑی معصومیت سے میری راہ تک رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف حسرت بھری نظر ڈالی اور کہا۔
''ٹھیک ہے، لیکن بس دو چار طعمے ہی لوں گا۔''
''طعمے! سر تاج میں نے کوفتے بنائے ہیں۔''
''ہاں، ہاں مجھے بھی نظر آ رہے ہیں۔ لیکن میں دو چار طعمے ہی لوں گا۔''
''پھر وہی طعمے، حضور یہ کوفتے ہیں۔'' بیگم ہنس کر بولیں۔
''ویسے یہ طعمہ کیا بلا ہے؟''
''اُف!'' پریشانی میں ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا۔
''بیگم میرا مطلب ہے کہ دو چار لقمے کھاؤں گا۔''
''تو لقمے کہیے ناں! یہ طعمے کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔'' بیگم فکر مند ہو کر بولیں۔
''خدانخواستہ طبیعت تو خراب نہیں؟ بخار تو نہیں؟'' وہ میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔
''نہیں، بخار نہیں، طبیعت بھی ٹھیک ہے مگر نہ جانے زبان کو کیا ہو گیا ہے۔ بولنا کچھ چاہتا ہوں اور منہ سے نکلتا کچھ اور ہے۔''
''اے ہے، یہ تو فکر والی بات ہے۔'' بیگم سچ مچ گھبرا گئیں۔ پریشان ہو کر بولیں۔
''یہ کوئی اچھی علامت نہیں۔ دماغ کے ڈاکٹر کو

دکھانا پڑے گا شاید۔''
''نہیں، اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔'' میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔
''اصل میں طعمہ کا مطلب لقمہ ہی ہوتا ہے۔''
''اطالوی زبان میں!''
''ناں بھئی، اردو میں۔''
''بس تو پھر اسے لقمہ یا نوالہ ہی رہنے دیں۔ طعمہ کم بخت مارا حلق میں پھنس بھی سکتا ہے۔'' بیگم مسکرا کر بولیں۔

رات ایک پرانے دوست سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہمارے ایک پرانے واقف کار کی شکایت کر رہے تھے اور اس ضمن میں ان کے تمام باطنی عیوب کو طشت ازبام کیے دے رہے تھے۔ میں بھی بڑی دلچسپی سے ان کا ہم نوا بنا ہوا تھا۔ غیبت اور عیب جوئی لاکھ بری بات سہی، لیکن سچ پوچھیں تو اس میں بڑا لطف آتا ہے۔ خواتین کا تو یہ من پسند مشغلہ ہے۔ لیکن مرد حضرات بھی اس معاملے میں کچھ کم نہیں، خصوصاً صحافی حضرات۔ میرے دوست فرمانے لگے۔ ''اب آپ ہی بتائیں کہ ایسے شخص کا میں کیا کروں؟''
''وہ بہت عربدہ انسان ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑنا ہی زیادہ بہتر ہے۔''
لیکن وہ کوئی عرب ورب نہیں، بلند شہر کا ہے۔'' میرے دوست نے ترشی سے کہا۔
''کم بخت بڑے حجتی ہوتے ہیں۔''
''مجھے بھی پتا ہے کہ وہ بلند شہر کا ہے، لیکن صاحب، ہے بڑا عربدہ قسم کا آدمی۔'' میں نے کہا تو میرے دوست نے مجھے مشکوک انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''یہ عربدہ کیا ہوتا ہے؟''
''بھئی، عربدہ اس کو کہتے ہیں، جو خوامخواہ دنگا فساد کرتا ہو۔ فسادی کہہ لیجیے۔''
''تو یوں کہو ناں کہ وہ جھگڑالو ہے۔''

''ہاں، کچھ یہی مطلب تھا میرا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ میرے دوست کافی دیر تک مجھے مشتبہ انداز میں دیکھتے رہے۔ منہ سے تو کچھ نہ کہا۔ لیکن آنکھوں سے صاف پتا چل رہا تھا کہ انہیں میری ذہنی صحت پر شک سا ہو گیا ہے۔ اِدھر میں خود پریشان تھا کہ یہ مجھے کیا ہو گیا رہے۔
اگلے دن چھٹی تھی۔ میں بستر پر پڑا اپنے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ اچانک مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا اور بار بار اپنے آپ کو دلاسا دے رہا تھا کہ یہ کوئی خطرناک نفسیاتی بیماری نہیں۔ کہتے ہیں مصیبت اکیلے نہیں آتی۔ ایک تو پریشانی، اوپر سے گرمی کہ اچانک بجلی بھی چلی گئی۔ بدن سے پسینہ بہنے لگا۔ میں نے بچی کو آواز دے کر بلایا۔
''جی ابو۔'' بچی نے ادب سے پوچھا۔
''بیٹا، ذرا مروحہ تو لے آنا۔'' میں نے کہا تو بچی بیچاری پہلے تو گنگ سی کھڑی رہی، پھر اچانک بھاگتی ہوئی گئی اور اپنی امی کو بلا لائی۔
''جی کیا چاہیے آپ کو۔'' گرمی سے پریشان بیگم مزید پریشان ہو کر گویا ہوئیں۔
''مروحہ چاہیے۔ گرمی بہت ہے۔'' میں نے کہا۔
''مروحہ! مگر اس نام کا کوئی مشروب نہیں آتا۔'' بیگم بولیں۔
''روح افزا تو نہیں مانگ رہے آپ۔''
''روح افزا نہیں بھئی مروحہ چاہیے۔''
''لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیں کہ یہ مروحہ کس بلا کو کہتے ہیں۔'' بیگم تندی سے بولیں۔
''میرا مطلب ہے دستی پنکھا۔'' میں نے کہا۔ ساتھ ہی شرمندگی سے مزید پسینے پسینے ہو گیا۔
''اچھا، دستی پنکھا۔'' بیگم سمجھنے والے انداز میں بولیں اور پھر بیٹی سے بولیں۔ ''جاؤ بیٹا ذرا دستی پنکھا لے آنا۔''
''دستی پنکھا!'' اب بچی کے حیران ہونے کی

باری تھی۔
''ارے وہ ہاتھوں سے جھلنے والا فین لے آؤ۔''
بیگم نے اسے سلیس اردو میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی ہاتھوں کے اشاروں سے بھی سمجھایا کہ شرح صدر ہوجائے۔ بیٹی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''اچھا وہ ہاتھ سے چلانے والا فین۔'' پھر اس نے اپنی والدہ کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔
''یوٹو بروٹس۔''
خیر ذرا ہی دیر میں پنکھا لاکر مجھے دے دیا۔ پھر اپنی امی سے رازدارانہ انداز میں کہنے لگی۔
''امی، امی لگتا ہے ابو کو Languagitis ہوگیا ہے۔''
''ہائے یہ کیا ہوتا ہے۔'' بیگم صاحبہ حواس باختہ ہوگئیں۔ بلکہ انہوں نے باقاعدہ آنسوؤں سے رونا شروع کردیا۔
''امی زبان کا بخار۔'' بچی نے صراحت کرتے ہوئے کہا۔ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ اپنی طویل طبی زندگی میں بڑی بڑی مشکل اور پیچیدہ بیماریوں کے نام سنے ہیں، لیکن یہ نام خود میرے لیے بھی نیا تھا۔ یہ Terminology میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔
اِدھر صورت حال یہ تھی کہ اپنی ہونہار بیٹی کی بتائی ہوئی میڈیکل ہسٹری کی نو دریافت بیماری یعنی Languagitis کے طفیل اپنی پُراسرار بلکہ کسی حد تک نفسیاتی بیماری کا سراغ مل گیا تھا۔ چنانچہ اپنے 'زبان کے بخار' کی وجہ جو یقیناً مرزا غالب سے خواب وخیال والی ملاقات تھی، سمجھ میں آچکی تھی۔ مگر پھر بھی اس پر قابو پانے میں مزید چند روز کھپ گئے۔ اس عرصے میں بے شمار لوگ میری اس زبان دانی سے متاثر ہوتے رہے۔ مثلاً ان ہی دنوں میں اپنے واقف سے ملنے ان کے دولت خانے پر گیا۔ یہ صاحب شکار کا شوق فرماتے ہیں۔ اس لیے مجھے بٹھا کر اپنے شکار کے قصے سنانے لگے کہ کس طرح انہوں نے ایک گولی سے چار ہرن مار گرائے تھے۔ نہ جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں ان سے پوچھ بیٹھا۔
''جناب! یہ تو بتایئے کہ آپ نے کبھی پلنگ کا شکار کیا ہے؟'' ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ تھوڑی دیر اسی مضحکہ خیز صورت میں رہنے کے بعد انہوں نے اپنے سر کو ذرا سا جھٹک کر کہا۔
''پلنگ کا شکار!'' وہ یقیناً یہی سمجھے تھے کہ میں ان کے شکار کے قصوں کا مذاق اڑا رہا ہوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
''جی پلنگ کا شکار۔'' اب کی بار وہ ذرا کسمسائے۔ جز بز ہوکر بولے۔
''پلنگ کا شکار کون کرتا ہے بھلا! جب ضرورت پڑے فرنیچر مارکیٹ سے لے آؤ۔'' وہ اپنی جگہ بالکل صحیح تھے۔ مگر غلط میں بھی نہ تھا۔ چیتے کو اردو میں پلنگ بھی کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن میں بھلا ان سے کیا کہتا، اس لیے ہنس کر بات ٹال دی۔ اگلے چند روز یہ تماشا جاری رہا۔ کبھی دست آور دوائی کو مسہل کہتا رہا تو کبھی شہد کو انگبین کے نام سے پکارتا رہا۔ پھلوں کے رس کو افشردہ اور ریشمی کپڑے کو پرنیاں کہتا رہا۔ اسی طرح چغل خورے کو نمام کہہ کر بلاتا رہا۔ اور لوگوں کو محظوظ کرتا رہا۔
انتہا تو اس وقت ہوئی جب علاقے کے ناظم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ علاقے کی صفائی ستھرائی کے متعلق بات چھڑی تو میں نے کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے متعلق شکایت کی۔ لیکن طرفہ تماشہ یہ رہا کہ میں کوڑے کرکٹ کے لیے بار بار لفظ گلخن بولتا رہا۔
ادھر ناظم صاحب شاید اسے گلقند سمجھ رہے تھے۔ اس لیے وہ بھی منہ میں پانی بھر کر اس کا لطف لیتے رہے۔
☆☆......☆☆

اسماءاعوان

حمد باری تعالیٰ

یارب نبیؐ کے قرب کی سوغات ہو نصیب
ہو جس میں اُن کا ذکر وہی بات ہو نصیب
بسیرت پہ اُن کی میں کچھ ایسے عمل کروں
مجھ کو بھی اُن کی معرفت ذات ہو نصیب
عشق عمرؓ ہو صدقِ ہو صدیقؓ کی مثال
حُب علیؓ کی مجھ کو ہر ایک بات ہو نصیب
آنکھوں کو اُن کی صورت انور کی ہے طلب
اِک بار خواب میں ہی ملاقات ہو نصیب
تو اور تیرے نبیؐ کا کروں ذکر صبح و شام
محسن کو اپنے در سے وہ دن رات ہو نصیب
شاعر: محسن علوی / مرسلہ: نگہت غفار۔ کراچی

اقوال حضرت علی

☆...... شروع سردی میں احتیاط کرو اور آخر میں اِس کا خیر مقدم کرو کیونکہ سردی جسموں میں وہی کرتی ہے جو وہ درختوں میں کرتی ہے کہ ابتداء میں درختوں کو جھلسا دیتی ہے اور آخر میں سرسبز و شاداب کر دیتی ہے۔

☆...... جسے اپنے چھوڑ دیتے ہیں اُسے پرائے مل جاتے ہیں۔

☆...... کسی کو تم دل سے چاہو اور وہ تمہاری قدر نہ کرے تو یہ اُس کی بدنصیبی ہے تمہاری نہیں۔

☆...... مذہب دل میں ہوتا ہے سجدوں میں نہیں۔

☆...... اُس سے ضرور معافی مانگو جسے تم چاہتے ہو۔

☆...... اُسے کبھی مت چھوڑو جو تمہیں چاہتا ہے۔

☆...... لوگوں کو اُسی طرح معاف کرو جیسے تم خدا سے اُمید رکھتے ہو کہ وہ تمہیں معاف کر دے گا۔

مرسلہ: معصومہ رضا۔ کراچی

لاجواب

پوتا: ''دادا جان! آپ اپنے زمانے میں ٹیکنالوجی، اسمارٹ فون، انٹرنیٹ اور الیکٹرونک چیزوں کے بغیر کیسے جیتے تھے۔''

دادا: ''بیٹا جیسے تم لوگ محبت، سچائی، وفاداری اور انسانیت کے بغیر جی رہے ہو بس اُسی طرح ہم بھی جیتے تھے۔''

مرسلہ: رازِ عدن۔ بحرین

سالگرہ

سالگرہ کی شام مبارک
شام کے لب پر
میری یاد
مچلتی رہے دنیا
اپنے حصے کی سب شمعیں

گل کر دینا...... لیکن
میرے نام کی آدھی شمعیں
جلتی رہنے دینا۔
شاعر: محسن نقوی/ پسند: افشاں چوہدری۔ یو کے

سالگرہ کا تحفہ

ایک امریکی بیوی نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''پچھلی سالگرہ پر میں نے اپنی ماں کو تحفے کے طور پر ایک خوبصورت کرسی بھیجی تھی۔ اب مشورہ دو اِس سال کیا بھیجوں۔''
''اُس کرسی میں بجلی دوڑانے کا انتظام کروالو۔'' شوہر نے فوراً سے پیشتر مشورہ دیا۔
مرسلہ: عذرا ہاشمی۔ لیہ

ہپی برتھ ڈے

میری پسند جانتے ہو
اس لیے پروین شاکر کی شاعری
انوپ جلوٹا کی کیسٹس اُٹھالاتے ہو
میری کمزوری سے واقف ہو
اس لیے سرخ گلاب کی اَدھ کھلی بے شمار کلیاں
میرے سرہانے چھوڑ جاتے ہو
میری تنہائیوں سے واقف ہو
اس لیے ہر سال چھبیس فروری کو
سورج کی پہلی کرن کے ساتھ
ہپی برتھ ڈے کہنے پہنچ جاتے ہو
مگر تم یہ نہیں جانتے کہ
میری پسند میری کمزوریوں، میری اُداسیوں
اور تنہائیوں سے واقف ہونے کے باوجود بھی
میری سوچوں کا محور تم نہیں ہو
شاعرہ: عذرا بخاری/ پسند: ماہین خاور۔ سیالکوٹ

سوٹ

بیوی: ''میں نے آپ کی سالگرہ کے لیے اتنا قیمتی سوٹ خریدا ہے کہ بس......''
شوہر: بہت بہت شکریہ۔ ذرا دیکھوں تو سہی کیسا سوٹ ہے۔''
بیوی: میں ابھی پہن کر آتی ہوں۔''
مرسلہ: راحت وفا راجپوت۔ لاہور

دعا

تمہاری سالگرہ پر دعا ہے ہماری
کہ روز مبارک ہزار بار آئے
تمہاری ہنستی ہوئی زندگی کی راہوں میں
ہزار پھول لٹاتی ہوئی بہار آئے
پسند: سعدیہ سیٹھی۔ یو کے

بے بسی

ایک آدمی اپنی بیوی کی قبر پر بیٹھا رو رہا تھا اور قبر کو پنکھے سے ہوا دے رہا تھا۔
کسی نے کہا۔ ''اتنی محبت......''
وہ بولا: ''بیوی مرنے سے پہلے کہہ گئی تھی کہ میری قبر کی مٹی خشک ہونے سے پہلے شادی مت کرنا۔ پتا نہیں کون کنجر روز قبر تے پانی پا جاندہ ہے۔''
مرسلہ: شہزادا انصاری۔ کوئٹہ

مختلف ملکوں کی کہاوتیں

☆...... آسمان کا حسن ستاروں سے ہے اور عورت کا حسن بالوں سے ہے۔ (اٹلی کہاوت)
☆...... کسی کو جنگ پر جانے اور شادی کرنے کا مشورہ نہیں دینا چاہیے۔ (اسپین کی کہاوت)
☆...... عورت کا ایک بڑا ہتھیار اُس کی زبان ہے اور وہ کبھی اِسے زنگ آلود نہیں ہونے دیتی۔ (فرانس کی کہاوت)
☆...... شادی کے دن کوئی عورت دلہن سے

زیادہ خوبصورت نہیں ہوتی۔ (ہنگری کی کہاوت)

مرسلہ: ریحانہ مجاہد۔ کراچی

عزت دار

اپنے قرابت داروں کی کمزوریاں اچھالنے والے، دوسروں کی عزتوں پر باتیں بنانے والے خود کو خاندانی اور دوسروں کو کمتر سمجھنے والے کبھی بھی عزت دار نہیں ہوتے۔

مرسلہ: ندیا مسعود۔ کراچی

کیا کہنے!

ایک مولوی صاحب ٹی وی پر فیشن شو دیکھنے میں محو تھے جس میں خوبصورت ماڈلز اپنے جلوے بکھیر رہی تھیں اچانک اُن کا ایک ملنے والا آ گیا اور حیرت سے پوچھنے لگا۔

''مولوی صاحب آپ بھی......؟'' مولوی صاحب گھبرا کر بولے۔

''یقین جانو میں تو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں۔''

مرسلہ: احسن رضا۔ اسلام آباد

خوبصورت نصیحت

زندگی ایسے جیو
کہ کوئی ہنسے تو تمہاری وجہ سے ہنسے
تم پر نہیں
اور کوئی روئے تو تمہارے لیے روئے
تمہاری وجہ سے نہیں

مرسلہ: محضر رضوی۔ لندن

تم کہاں ہو

ہجر خوں رُلاتے ہو کہاں ہوتے ہو
لوٹ کر کیوں نہیں آتے کہاں ہوتے ہو
جب بھی ملتا ہے کوئی شخص بہاروں جیسا
مجھ کو تم کیسے بھلاتے ہو کہاں ہوتے ہو
مجھ سے بچھڑے ہو تو محبوب نظر ہو کس کے
آج کل کس کو مناتے ہو کہاں ہوتے ہو
ستم کہ لوگ بھی اب یہ سوال کرتے
کم کم نظر آتے ہو کہاں ہوتے ہو

شاعر: سید واثق/ پسند: سلمٰی۔ بحرین

چالاکی

ایک صاحب اپنے دوست سے ملنے گاؤں گئے۔ دوست کا گھر کافی دور تھا اور انہیں کوئی سواری نہیں مل رہی تھی۔ ایک دیہاتی بیل گاڑی پر اُسی طرف جا رہا تھا۔ ان صاحب نے اُس سے کہا۔

''بھائی کیا آپ میرا یہ کوٹ میرے دوست تک پہنچا دیں گے۔'' انہوں نے اپنا کوٹ اُتار کر دیہاتی کی طرف بڑھایا۔ تو وہ بہت معصومیت سے بولا۔

''لیکن میں آپ کے دوست کو کہاں ڈھونڈوں گا؟''

''ہاں یہ بات بھی ہے چلیے پھر میں بھی کوٹ کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں تاکہ آپ کو پتا ڈھونڈنے میں پریشانی نہ ہو۔''

مرسلہ: اسلم شہزاد رحمانی۔ سیالکوٹ

دار چینی کے پاؤڈر کا استعمال کیجیے

طبی ماہرین کے مطابق دار چینی حیرت انگیز طبی فوائد کی حامل ہے اور اِس کا استعمال کئی خطرناک بیماریوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

دار چینی کے فوائد پر کی گئی تحقیقات کے مطابق روزانہ شہد کے ساتھ ایک چمچ دار چینی کا پاؤڈر استعمال کرنے سے ہڈیوں کے درد میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اور یہ خون میں کولیسٹرول کی سطح

کو بھی کم کرتی ہے اور جسم کو مختلف انفیکشن سے بچاتی ہے۔ اس سے یادداشت بھی بہتر ہوتی ہے۔

مرسلہ: فہمیدہ نسرین۔ کراچی

تنہا

جیون کی تپتی راہوں پر
اِک عمر سے جاناں تنہا ہوں
اے ابر گریزاں کھل کے برس
میں مانند صحرا تشنہ ہوں
پھر آج پکارا ہے تجھ کو
پھر ہونے لگا ہے دل بوجھل
کب دائم ساتھ کی خواہش کی
آ ہاتھ پکڑ دو گام تو چل
دو بوند فقط ہے پیاس میری
میں صحرا ہوں میں تشنہ ہوں

شاعرہ: فاطمی نجیب/ پسند: رضوانہ کوثر۔ لاہور

طریقہ

جج: ''تم پر الزام ہے کہ تم نے 25 سال تک اپنی بیوی کو ڈرا دھمکا کر بہت سختی کے ساتھ اپنے کنٹرول میں رکھا۔
ملزم: ''لیکن سر.......''
جج: (بات کاٹتے ہوئے) ''صفائی نہیں دو۔ طریقہ بتاؤ طریقہ۔''

مرسلہ: افشاں رضا۔ کراچی

بچپن

چلو پھر ڈھونڈ لیتے ہیں اُسی نادان بچپن کو انہی معصوم خوشیوں کو انہی رنگین لمحوں کو جہاں غم کا پتہ نہ تھا جہاں دکھ کی سمجھ نہ تھی جہاں بس مسکراہٹ تھی بہاریں ہی بہاریں تھیں کہ جب ساون برستا تھا تو اُس کاغذ کی کشتی کو بنانا اور پھر ڈبو دینا بہت اچھا سا لگتا تھا اور اس دنیا کا ہر چہرہ بہت سچا سا لگتا تھا

پسند: چیکو۔ لندن

تلخ حقیقت

مرنے کے بعد جنت میں جانے کے بہت سے خواہش مند۔
دوسروں کی دنیا کو جہنم بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

مرسلہ: یاسمین رضا۔ ڈیفنس، کراچی

بچے ہمارے عہد کے

بچہ: ''ابو اگر آپ کو پتا چل جائے کہ میں کلاس میں فرسٹ آیا ہوں تو آپ کیا کریں گے؟''
باپ: ''میں تو خوشی سے پاگل ہو جاؤں گا۔''
بچہ: ''بس اسی ڈر سے میں فیل ہو گیا۔''

مرسلہ: انیلا رمضان۔ نوشہرہ

کڑوا سچ

''میں نے تین منزلہ مکان اس لیے بنایا تھا کہ میرے بچے ہمیشہ ایک ساتھ رہیں۔'' بابا اکثر یہ بات کہتے تھے۔ لیکن اُن کا انتقال ہوتے ہی ہم نے مکان بیچنے کا فیصلہ کیا کیونکہ نہ ہم تینوں بھائی ایک ساتھ رہ سکتے تھے، نہ ہماری بیویاں۔ اخبار میں اشتہار دیکھ کر کئی خواہش مند آئے۔ ایک صاحب سے معاملہ طے ہو گیا۔ میں نے اُن سے بیعانہ لے کر پوچھا۔
''آپ کو یہ مکان کیوں پسند آیا؟'' انہوں نے خوشی سے جواب دیا۔
''میرے تین بیٹے ہیں اور میں یہ تین منزلہ مکان اس لیے خریدنا چاہتا ہوں تاکہ میرے بچے ہمیشہ ایک ساتھ رہیں۔''

مرسلہ: سعدیہ عزیز آفریدی۔ کراچی

☆☆......☆☆

نئے لہجے، نئی آوازیں

ماں

خدا نے دونوں عالم جب بنائے
انوکھے ہر طرف جلوے دکھائے
کہیں پت جھڑ، کہیں پھولوں کا پہرا
اندھیرا اور کہیں روشن سویرا
ہمارے واسطے دنیا سجا کر
خود اپنی غور سے تخلیق دیکھی
کہیں محسوس کر لی اِک کمی پھر
یوں اس نے چادر رحمت کو بُن کر
گلوں سے شبنم پاکیزہ لے کر
محبت کے سمندر کو سمیٹا
تقدس سے حسیں چہرہ بنایا
زمین و آسماں کی وسعتوں سے
نئے جذبوں، انوکھی چاہتوں سے
نئی تخلیق کے سینے میں اس نے
اُمنگوں سے بھرا اک دل بنایا
در خورشید سے پہلی کرن لی
پھر اس میں چاند کی ٹھنڈک بھی رکھ دی
دعاؤں کا خزانہ اس میں بھر کر
تکمیل ذات کی پھر اس نے ماں کی
ہمیں دنیا ہی میں جنت عطا کی

شاعرہ: سویرا خالد۔ کراچی

شہر آباد میں......

میرے خیالوں کے پہلو سے
یوں ٹکراتا گیا
وہ جہاں سے بھی گیا، دل کو ڈگمگاتا گیا
بہت ہی آس تھی ہم کو کہ اس محبت میں
اس کو سوچیں گے
تو ہر سمت دلنشیں موسم......
یوں اترے گا جیسے حیا اترتی ہے
اس کے خیال کی آہٹ
گدگدائے گی دل کو
فضا میں ہو گا گل رنگ تتلیوں کا ہجوم
پھول یادوں کے ہر سو مہکتے جائیں گے
کرنوں کی طرح پھوٹیں گے جو
انگ انگ سے......
میرے اور اس کے درمیاں
جو راستے ہیں کٹھن
یہ روشنی، تیرہ شبی ان کی نکل جائے گی مگر......
تیرے خیال کے پیکر سے
دل تک کا سفر......
ہر اک آس کو یوں دربدر کرتا گیا
کہ بہت دیر تک پہلو میں دل ویران رہا
شہر خموشاں کی طرح سنسان رہا
دیر تک سنسان رہا
پھر اچانک پہلو میں کرچیاں بکھریں
جیسے شہر آباد میں اچانک کہیں دھماکہ ہو......
فضا میں خاک اڑے اور
ہر منظر لمحوں میں لہو ہو جائے

شاعرہ: فرح اسلم قریشی۔ کراچی

یہ دوشیزہ ہے
جیون کے راز بتاتا ہے، سندر خواب دکھاتا ہے
دلوں کو مہکاتا ہے
یہ دوشیزہ ہے

انوکھے رنگ دکھاتا ہے، سب کے دل کو بھاتا ہے
اپنائیت کا احساس جگاتا ہے
یہ دوشیزہ ہے
دوشیزہ کی جو محفل ہے، ستاروں کی یہ جھلمل ہے
ہر ستارہ جگمگاتا ہے
یہ دوشیزہ ہے
شوبز کی ساری باتیں
آنے والے دن اور گزری راتیں
سب کی بات بتاتا ہے
یہ دوشیزہ ہے
کاشی چوہان ایک ستارہ ہے
جو شوبز میں بھی چمکتا ہے
دوشیزہ کو بھی چمکاتا ہے
یہ دوشیزہ ہے
دوشیزہ اک گلاب ہے
رضوانہ جس کی خوشبو ہے
ان دونوں کے ملنے سے
قارئین کا دل مہکتا ہے
ہاں! یہ دوشیزہ ہے
سب سن لو یہ دوشیزہ ہے، سب دیکھ لو یہ دوشیزہ ہے
سب پڑھ لو یہ دوشیزہ ہے
اللہ تعالیٰ ادب کے افق پر
دوشیزہ کا ستارہ ہمیشہ چمکتا دمکتا رہے۔

شاعرہ: راحت وفا راجپوت۔ لاہور

شیشہ دل

توڑا ہے اُس نے وہ شیشہ
جو شیشہ دل کا شیشہ ہے
جو بازی جان کی بازی ہے
جو رشتہ درد کا رشتہ ہے
اب یہی کہوں گی دنیا ہے
اس پیار میں دھوکا ہوتا ہے، سنسار میں دھوکہ ہوتا ہے
دل پہ چوٹ نہ کھانا تم
نہ اپنا اسے بنانا تم
ورنہ پھر وہی ہوگا۔ کہتے پھرو گے دنیا سے
توڑا ہے اس نے جو شیشہ
وہ شیشہ دل کا شیشہ ہے
جو بازی جان کی بازی ہے
جو رشتہ درد کا رشتہ ہے

شاعرہ: نوشابہ صدیقی۔ کراچی

نیا برس

نئے برس!
اب کہ تُو
میرے گھر آنگن کے علاوہ
نیلی چھتری کے نیچے جو
اللہ کے بندے رہتے ہیں
سب کو خوشیاں بھر بھر جھولی
برس کے آخری دن تک دینا
کسی کے دامن میں نہ آئیں
دکھ کے موتی، دکھ کی رَینا
صرف محبت کی برکھا ہو
جہاں جہاں تک دیکھیں نینا

شاعر: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

انجام

چپکے چپکے سے اب وہ بدلنے لگا ہے
محبت کا سورج جو چمکتا تھا ہر دم
وہ لمحہ بہ لمحہ جیسے ڈھلنے لگا ہے
جو قید تھا ہماری مٹھی میں ہمیشہ سے
وہ ریت کی مانند پھسلنے لگا ہے
ہمیں ہے معلوم کہ ہم اسے روک نہیں سکتے
جو جاتے وقت کی طرح آگے بڑھنے لگا ہے
میرا دل جیسے اب بجھ سا گیا ہے
ہر جذبہ جو تھا اب وہ مرنے لگا ہے

شاعرہ: شمسہ قمر۔ کراچی

"چٹ پٹی خبریں"

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

چھوٹا خان

شاہ رخ خان کا بڑا بیٹا آریان خان اب اٹھارہ برس کا ہو چکا ہے۔ اور تین بچوں میں سب سے بڑا ہونے کے ناطے شاہ رخ خان اسے بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یوں تو اُس کی جان اپنے تینوں بچوں میں ہے لیکن آریان کی ہر فرمائش اور خواہش کو وہ سر فہرست رکھتے ہیں اِدھر بالی وڈ کے فلمسازوں کی نظریں بھی چھوٹے خان پر جمی ہوئی ہیں کہ کب انہیں شاہ رخ خان کی طرف سے سگنل ملتا ہے تا کہ وہ اسے فلموں میں سائن کر سکیں۔ آریان لندن کے ایک مہنگے اسکول میں زیر تعلیم ہے جہاں امیتابھ بچن کی نواسی بھی پڑھتی ہے اور دونوں بچوں میں بہت
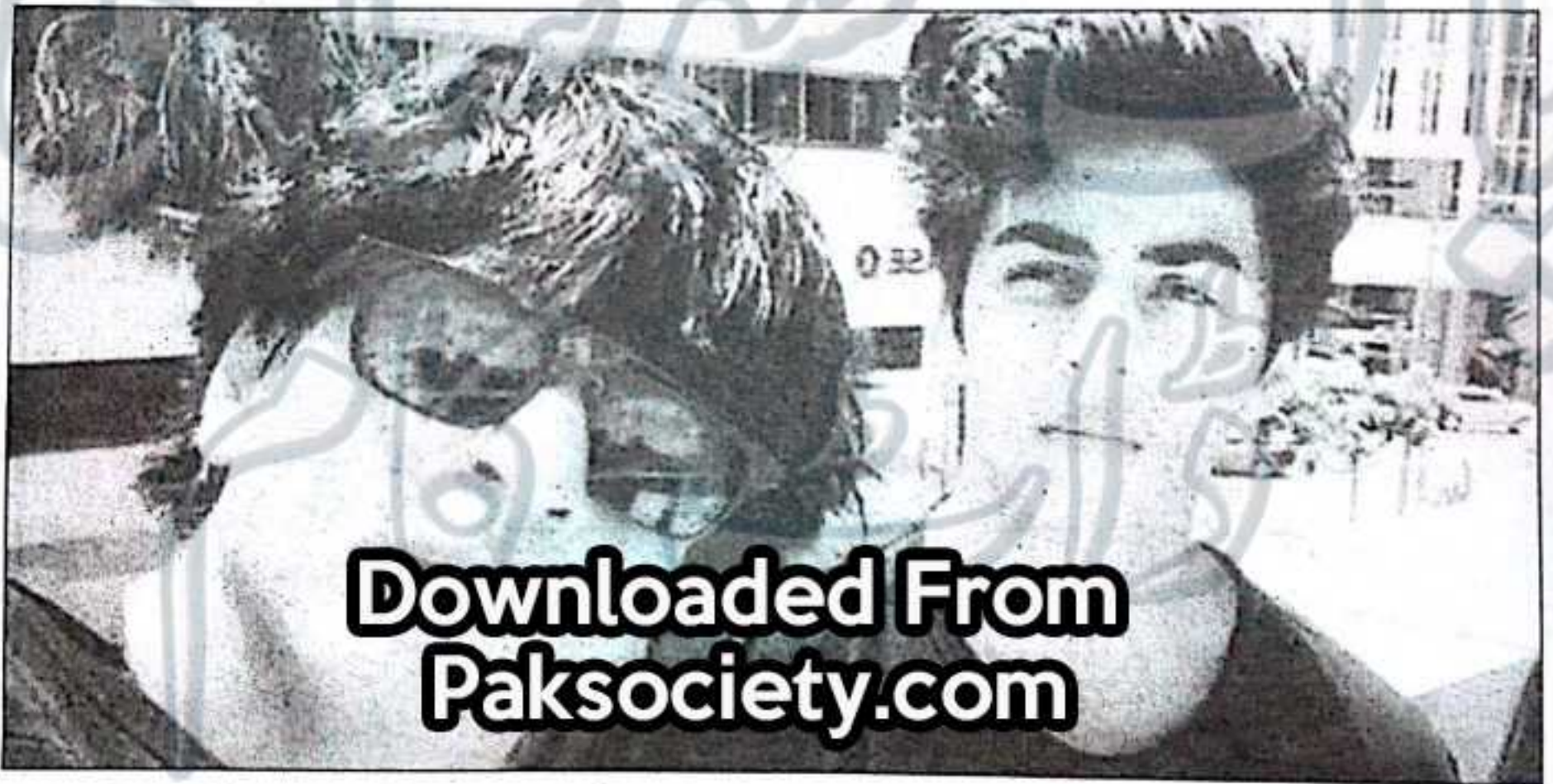
دوستی بھی ہے۔ آریان کو اپنی چھوٹی بہن سے بھی بے حد محبت ہے۔ ان فیکٹ وہ اپنے دونوں بہن بھائی پر جان چھڑکتا ہے۔

رانی مکھرجی کی عامر خان سے خفگی

خفا تو دراصل رانی کو اپنے آپ سے ہونا چاہیے...... کیونکہ پچھلے کئی سالوں سے وہ اپنے لیے

بار بار ایسی فلموں کا انتخاب کر رہی ہیں جن میں کوئی دم نہیں ہوتا اور وہ فلاپ ہو جاتیں ہیں۔ لیکن رانی اپنی فلاپ فلموں کا غصہ عامر خان پر اُن کے لیے اُلٹی سیدھی باتیں کہہ کر نکال رہی ہیں۔ حال ہی میں اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے عامر خان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا۔ ''عامر خان ایک گھمنڈی انسان ہیں وہ اپنے فینز کو آٹوگراف کچھ یوں دیتے ہیں جیسے کوئی اُن سے بھیک مانگ رہا ہو۔'' رانی مکھرجی کی خفگی کی وجہ بھی ہم

آپ کو بتاتے چلیں اصل میں اُن کے شوہر رویت چوپڑہ نے رانی کے کیریئر کی ڈوبتی کشتی کو سہارا دینے کے لیے عامر خان کو اُن کے ساتھ ایک فلم میں کاسٹ کرنا چاہا تھا لیکن عامر خان نے صاف انکار کر دیا تھا۔ تو تبھی یہ ناراضگی اُسی انکار کا ری ایکشن ہے۔

اداکارہ سری دیوی کی ایک بار پھر واپسی

بالی وڈ کی موہنی صورت والی اداکارہ سری دیوی جو ماضی میں فلم بینوں کے دلوں کی دھڑکن رہ چکی ہیں اور 2012ء میں فلم 'انگلش ونگلش' میں بھی اپنا جادو جگانے کے بعد اب ایک بار پھر وہ بالی وڈ میں دھوم مچانے کو تیار ہیں۔ اُن کے شوہر بونی کپور نے انہیں اپنی اگلی فلم میں مرکزی کردار دیا ہے۔ اس فلم کا

موضوع خواتین کے متعلق ہے اور اس میں وہ بے حد پاور فل کردار ادا کر رہی ہیں۔

سلمان خان کا نیا گھر

بالی وڈ کے سپر اسٹار واداکار سلمان خان نے اداکار شاہ رخ خان کے گھر کے قریب اپنا گھر خرید لیا ہے۔ اس بارے میں سلمان نے اپنے انٹرویو میں

بتایا کہ میں نے 32 کروڑ کا یہ گھر شاہ رخ کے بنگلے 'منت' کے قریب اس لیے لیا ہے تا کہ میں اُن کے قریب ہو سکوں۔ لوگوں کی حیرت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ اچھا پڑوسی ملنا بھی بہت بڑی بات ہوتی ہے۔

شاہ رخ خان سے بہت کچھ سیکھا، ماہرہ خان

پاکستان کی مشہور فنکارہ ماہرہ خان اپنے ایک انٹرویو میں کہتی ہیں کہ میرے لیے انڈین فلم 'رئیس' میں شاہ رخ خان کے ساتھ کام کرنا ایک بے حد خوشگوار تجربہ ہے۔ جب میں اس فلم کی شوٹنگ کے لیے انڈیا گئی تو کچھ کنفیوز تھی لیکن وہاں پر کچھ ہی دنوں میں مجھے اتنا اپنا پن ملا کہ میرے دل سے سب خدشات ختم ہوگئے۔ اگر کبھی ڈائیلاگ ڈیلوری یا ڈانس اسٹیپ میں مجھ سے کوئی غلطی بھی ہو جاتی تھی تو شاہ رخ خان کا رویہ مجھے کانفیڈینس دیتا تھا۔ ان فیکٹ اِس فلم کا سارا ہی کریو بے حد عزت اور محبت سے خیال کرتا تھا۔ شاہ رخ خان سے اس فلم کے دوران میں نے بہت کچھ سیکھا۔ انڈیا سے واپسی پر جب میں نے یہاں فلم 'ہو من جہاں' کے ڈانس شوٹ میں حصہ لیا تو میرے ڈائریکٹر نے بے ساختہ کہا کہ 'ماہرہ تم میں تو بہت کانفیڈینس آ گیا ہے اور تم ایک بدلی ہوئی ماہرہ لگ رہی ہو۔'

ہمایوں سعید کی ایک اور کامیابی

پاکستان کے سپر اسٹار ہمایوں سعید کو 2015ء جاتے جاتے ایک مزید کامیابی دے گیا۔ انہیں پاکستان اچیومنٹ ایوارڈز یو کے اور یورپ کی طرف سے 14 نومبر کو بیسٹ ایکٹر آف 2015ء کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ تقریب لندن میں منعقد ہوئی تھی جس میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ان

پاکستانیوں کو ایوارڈ دیے گئے تھے جنہوں نے اپنی اپنی فیلڈ میں پاکستان کا نام روشن کیا تھا۔ ہمایوں سعید فارمل وائٹ سوٹ، براؤن شرٹ اور دھاری دار ٹائی میں اپنی سپر ہٹ فلم 'جوانی پھر نہیں آنی' کے اسٹار جاوید شیخ کے ساتھ اِس تقریب میں بے حد خوش نظر آ رہے تھے کہ انہیں اس فلم کے حوالے سے ایوارڈ ملنا بات ہی اتنی بڑی ہے۔ آج کل ہمایوں اپنی پروڈکشن میں بننے والے ایک بڑے سیریل 'دل لگی' بنانے میں بزی ہیں جو 2016ء میں آن ایئر ہوگی۔

☆☆......☆☆

چکن گرین کری

اجزاء

چکن (درمیانہ سائز ڈیڑھ کلو کے پیس بنالیں)
تازہ دہی ایک پیالی
گھی ایک پیالی
لہسن، ادرک پیسٹ 1 بڑا ٹیبل اسپون
زیرہ ایک چمچ چائے کا
ہری پیاز پسی ہوئی
ہرا دھنیا پسا ہوا حسب ذائقہ
ہری مرچ پسی ہوئی حسب ذائقہ
نمک حسب ذائقہ
کالی مرچ پسی ہوئی حسب ذائقہ
سبز الائچی چار عدد

ترکیب:

تمام ہرا مسالا دہی میں ملا کر چکن میں اچھی طرح ملائیں اور ایک گھنٹے کے لیے رکھ لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے زیرے کا بگھار لگائیں الائچی اور کالی مرچ بھی ڈالیں۔ چکن ڈال کر ہلکی آنچ پر سنہرا کر لیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو پندرہ منٹ کے لیے دم پر لگا دیں۔ لذید چکن گرین کری تیار ہے۔

اتالین چیز آملیٹ

اجزاء

چکن ایک بڑا پیس
انڈے 3 عدد
پنیر 3 سلائس
ٹماٹر لال ایک عدد (چھوٹے چوکور ٹکڑے کر لیں)
ہری مرچیں (نرم) 3 عدد کٹی ہوئیں
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا) چوتھائی کپ
نمک، لال مرچ حسب پسند
چینی آدھا چمچ چائے کا
دودھ تین چائے کے چمچ
سویا ساس آدھا چمچ چائے کا
پیاز ایک عدد (درمیانی چوکور ٹکڑے کر لیں)
گھی یا تیل ایک کپ درمیانہ سائز

ترکیب:

چکن ابال کر گوشت علیحدہ کر لیں۔ اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ بچی ہوئی یخنی رکھ لیں۔ ایک فرائی پین میں گھی ڈال کر پیاز براؤن کر لیں۔ ہری مرچیں شامل کر کے ہلکا سا تلیں، پھر یخنی، ٹماٹر، ہرا دھنیا اور چکن پیس

بھی ڈالیں۔ چار منٹ تک پکائیں۔ ساتھ ہی پنیر کے سلائس بھی شامل کرلیں انڈوں میں چینی سویا ساس، دودھ، نمک، مرچ ڈال کر خوب پھینٹیں اور فرائی پان میں ڈال دیں۔ تھوڑا سا ہرا دھنیا بھی ملائیں۔ جب آملیٹ سنہری ہونے لگے تو اسے بڑی پلیٹ میں الٹ لیں۔ گارنش کے لیے اس کے کناروں پر ہرا دھنیا اور چپس سجادیں، مزے دار 'اٹالین چیز آملیٹ' تیار ہے۔

پوٹیٹو پیزا

اجزاء:

آلو	آدھا کلو
مکھن	تین کھانے کے چمچے
چیڈر چیز	تین کپ (کش شدہ)
نمک	حسب ذائقہ
ٹماٹو کیچپ	1/3 کپ
انڈا	ایک عدد
چکن قیمہ	ایک کپ
ٹماٹر	ایک عدد
پیاز	ایک عدد
شملہ مرچ	ایک عدد
ہری پیاز	آدھا کپ
بریڈ کرمز	آدھا کپ
کوکنگ آئل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:

چکن قیمہ ابال لیں۔ ٹماٹر کے گول سلائس کاٹ لیں۔ پیاز اور شملہ مرچ کو بھی چھوٹے چھوٹے کیوبز کی شکل میں کاٹ لیں ہری پیاز بھی کاٹ لیں۔ آلو اُبال کر میش کرلیں۔ اس مکھن، چیز 1/3 کپ، انڈا، نمک ملا کر اچھی طرح گوندھ لیں۔ پیزا پلیٹ کو آئل سے چکنا چور کر کے بریڈ کرمز چھڑک کر یہ مرکب پھیلا دیں (دس انچ قطر کی پلیٹ ہو) اور فریج میں رکھ کر سیٹ کر لیں۔ ایک سے دو گھنٹے کے بعد حسب آلو کا مرکب سخت ہو جائے تو اس کے اوپر ٹماٹو کیچپ پھیلائیں اب ٹماٹر، پیاز شملہ مرچ کے سلائس رکھیں۔ ہری پیاز بھی پھیلا دیں۔ پھر باقی بچا ہوا چیز بھی پھیلا کر اوون میں رکھ کر اتنی دیر بیک کریں کہ اس کی سطح گولڈن ہو جائے۔ اب اس کے سلائس کاٹ کر مایونیز کی سلاد، چلی گارلک ساس کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

سوکھی خوبانی کا میٹھا

اجزاء

خشک خوبانی	ایک کلو
فریش کریم	تین پیکٹ
شکر پسی ہوئی	آدھا پیالی
بادام (باریک کاٹ لیں)	بیس عدد

ترکیب:

خوبانی خوب اچھی پرح دھو کر ایک لیٹر پانی میں ابال لیں جب نرم ہو جائیں تو ٹھنڈا کر کیا دام نکال کر خوبانی کو میش کر کے پیسٹ بنا لیں۔ پیکٹ کی کریم چینی کے ساتھ خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔ خوبانی کا پیسٹ ڈش میں ڈال کر فریج میں ایک گھنٹے کے یے رکھ دیں۔ جب ٹھنڈا ہو جائے تو سرو کرتے وقت کریم ڈال کر اور باریک بادام کاٹ کر اوپر سے سجادیں۔ کچھ لوگ گاڑھا گاڑھا کسٹرڈ بنا کر اس کی ایک تہ بھی لگاتے ہیں۔

☆☆......☆☆

شبانہ عنایت

موروثیت ،خوراک اور ماحولیات کا اثر

ہماری جلد میں موجود رطوبت کی سطح کا انحصار بڑی حد تک موروثیت پر بھی ہوتا ہے۔ ہر انسان کے بدن پر جلد کی تہوں کی تعداد برابر ہوتی ہے، لیکن ہلکی آنکھوں والے گورے انسانوں کی تہیں شفاف ہوتی ہیں ان لوگوں کے مقابلے میں جن کی جلد اور آنکھوں کا رنگ گہرا ہوتا ہو۔

چنانچہ گوری اور پتلی جلد پر جھریاں زیادہ جلدی پڑتی ہیں کیونکہ ان کا دفاعی نظام کمزور ہوتا ہے۔

ڈی ہائیڈ ریٹڈ اور جھریوں والی جلد کی سب سے بڑی وجہ سورج ہے۔ سورج کی شعاعوں سے جلد کو پہنچنے والا نقصان مستقل ہوتا ہے اور کوئی بھی مصنوعات اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی، تاہم جلد میں اپنے طور پر بحال ہونے کی صلاحیت بھی موجود ہے یہ بحالی محض جزوی ہوتی ہے اور عمر میں اضافے کے ساتھ بحالی کی رفتار سست بھی پڑ جاتی ہے اس لیے پہنچنے والے نقصان کا علاج کرنے سے بہتر تو یہ ہے کہ جلد کو نقصان پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔

بہترین اصول تو یہ ہے کہ کھلی ہوئی جلد کو سورج کے سامنے لایا ہی نہ جائے۔ سن اسکرین لگانے کی مستقل عادت ڈال لیں حالانکہ سن اسکرین بھی روشنی کو مکمل طور پر نہیں روکتا بلکہ اس کا پانچواں حصہ پھر بھی جلد تک پہنچتا رہا ہے۔ جس کے باعث تھوڑا بہت نقصان پہنچتا رہتا ہے۔

مرطوب آب و ہوا ہماری جلد کے لیے زیادہ بہتر ہے اس کے برعکس سرد اور خشک ہوا ہماری جلد کی نمی کو اپنے اندر جزب کر کے اسے خشک بنا دیتی ہے اسی لیے ایئر کنڈیشنر میں چند گھنٹے گزارنے کے لیے (جو اطراف کی ہوا کو خشک بنا دیتا ہے)، ہماری جلد اس کا اثر قبول کر کے سخت ہونے لگتی ہے اور اس کی لچک کم ہو جاتی ہے۔

خوراک پر جلد کا اثر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں وٹامن اور معدنیات (Minerals) کی کمی جلد پر فوراً اپنا اثر ظاہر کر دیتی ہے۔ بہت زیادہ ڈائیٹنگ کرنے والی خواتین جو متوازن غذا کا استعمال ترک کر دیتی ہیں، ان کی جلد بہت جلد رطوبت سے محروم ہو جاتی ہے۔

موئسچررائزر کے استعمال کے فوائد

موئسچررائزر کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ ہماری جلد کے نظر آنے والے بالائی حصے کے پانی کی مقدار میں اضافہ کر دیتا ہے تاکہ ہمارے جسم کی قدرتی نمی بخارات بن کر اڑنے سے محفوظ رہے

یہ اضافی پانی اوپری جلد کو پھیلا دیتا ہے جو قدرے موئسچرائزر کو اڑنے سے بچاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موئسچررائزڈ جلد میں پانی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اور وہ ہماری جلد کو زیادہ جوان اور پر شباب بنا دیتی ہے۔ یہ ہماری جلد کو ماحولیات کے اثر سے بھی بچاتا ہے مثلاً ہوا، سردی، دھوپ اور آلودگی وغیرہ۔ خصوصاً اس وقت جب فاؤنڈیشن نہ لگایا ہو۔ اس کی بدولت فاؤنڈیشن کو زیادہ ہموار طریقے سے لگانا بھی ممکن ہو جاتا ہے لیکن یہ موئسچرائزر جھریوں کا نہ تو علاج ہے اور نہ انہیں پڑنے سے روک سکتا ہے۔

جھریاں جلد کی خشکی کے باعث پیدا نہیں ہوتیں بلکہ تیز دھوپ اور عمر کی زیادتی انہیں جنم دیتی ہے۔ دھوپ سے پرہیز ہی جھریوں کو روکنے کی واحد ترکیب ہے اس لیے اگر آپ جھریوں سے محفوظ رہنا چاہتی ہیں تو پھر اپنی رقم ایسی مصنوعات پر صرف کریں جو آپ کو آفتاب کی تمازت سے محفوظ رکھ سکے۔ اگرچہ موئسچررائزر جھریوں کو پڑنے سے روک نہیں سکتے لیکن ان کے بغیر آپ کے چہرے پر نسبتاً زیادہ جلد کی جھریاں نمودار ہو جائیں گی۔ مصنوعی موئسچررائزر لکیروں کو ختم نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اندرونی خرابیوں کے باعث پڑتی ہیں۔

ہمیں رات میں خصوصی موئسچررائزر استعمال کرنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ جلد کی بحالی کی رفتار میں اس وقت اضافہ ہو جاتا ہے جب باقی بدن آرام کر رہا ہو جبکہ دن میں موئسچررائزر کا کام محض اتنا ہے کہ وہ ماحولیات کے خلاف جلد کی حفاظت کرے مثلاً ہوا، سردی، دھوپ وغیرہ سے اسی لیے ہم مختلف قسم کی موئسچررائزر استعمال کرتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

موئسچرائزر کرنا

موئسچررائزنگ ضروری ہونے کے باوجود اس کا ضرورت سے زیادہ استعمال ٹھیک نہیں جلد میں جذب ہونے کے بجائے وہ آپ کی جلد پر چکنی کی ایک تہہ بن کر چپک جائیں گے۔

ضرورت کے مطابق موئسچررائزر لگا۔

طریقہ یہ ہے کہ اتنا لگائیں جس سے چہرہ خشک اور کھدرے نشانات مٹ جائیں۔

پندرہ منٹ تک انتظار کریں اور اگر نشانات تب بھی ملائم نہیں تو پھر آپ نے کافی موئسچررائزر نہ ... ہے اچھے معیار کا موئسچررائزر دن بھر کے لیے کافی ہوتا ہے اس لیے آپ کو دن میں صرف دو دفعہ استعمال کرنا چاہیے۔ صبح اور رات کو سوتے وقت۔ چکنی جلد کے لیے کوئی ہلکی سی موئسچررائزنگ کریم منتخب کریں اور صرف ان مقامات پر لگائیں جہاں ضرورت ہو۔

موئسچرائزر لگانے کا بہترین وقت

اس بات کا خیال رکھیں کہ موئسچررائزر ہمیشہ نم جلد پر لگایا جائے اسی لیے غسل کرنے کے بعد جلد کی ساری نمی تولیے سے پونچھ کر ختم نہ کر دیں۔ نم اور تر جلد پر موئسچرائزر لگانے سے آپ جلد کی اپنی نمی کو اس میں مقید کر دیتی ہیں اور اس طرح جلدی خلیوں کو پانی کی مناسب سطح برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے مختصر یہ کہ پہلے جسم پر پانی لگائیں اور پھر اسے کسی موئسچررائزر کی مدد سے مقید کر لیں۔

موئسچررائزر میک اپ کے اوپر بھی لگایا جا سکتا ہے تاکہ آفس میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد بھی چہرے کی رطوبت تھوڑی بہت باقی رہے۔ اس کے علاوہ یہ موئسچرائزر ہوا میں موجود نمی کو کھینچ کر آپ کے چہرے کی رطوبت کو بڑھاتا رہے گا۔

☆☆......☆☆